کیا قافلہ جاتا ہے
نصراللہ خان

کیا قافلہ جاتا ہے

(شخصی خاکے)

نصر اللہ خان

مکتبۂ تہذیب و فن۔ کراچی

اشاعت اوّل	۱۹۸۴ء
سرورق	آذر زوبی
کتابت	نسیم اختر ہمایوں
طابع	عظیمی پرنٹرز۔ ناظم آباد ۱۔ کراچی
قیمت	چالیس ۴۰ روپے

مکتبۂ تہذیب و فن

سی۔۶۳۔ بلاک ایچ۔ نارتھ ناظم آباد

کراچی

انتساب

میں زندگی بھر لکھ لکھ کر بکھیرتا رہا۔ سمیٹنا اور سنوارنا مجھے آیا ہی نہیں۔ اس کتاب میں جتنے مضامین ہیں، وہ مختلف اخبارات و رسائل میں بکھرے ہوئے تھے۔ انھیں عزیزی مشفق خواجہ نے بڑی محبّت اور بڑے خلوص سے سمیٹا اور سنوارا ہے۔ انھوں نے مجھ سے کئی نئے مضمون لکھوائے اور بعض پرانے مضامین اُن کی فرمائش پر میں نے از سرِ نو لکھے۔

مشفق خواجہ نے میرے لیے جو محنت کی ہے، اُس کے اعتراف میں میں یہ مجموعہ انھیں کے نام معنون کرتا ہوں۔

دعاگو

نصراللہ خاں

(۱)

(۲)

(۳)

(۴)

(۵)

موجِ گُل و بوئے گُل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے گر تو بھی چلا چاہے

پروفیسر عبدالعزیز میمنؒ

قاضی اختر میاں جوناگڑھی اور ڈاکٹر ممتاز حسن کی صحبت میں پروفیسر عبدالعزیز میمن کی کئی بار زیارت ہوئی۔ اور بات زیارت کی حد سے آگے نہیں بڑھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ پروفیسر صاحب کے سامنے کوئی کیا بولے اور کیا منہ کھولے۔ بس اتنا ہی غنیمت سمجھیں اور اس بات پر فخر کریں کہ ہم نے ان آنکھوں سے پروفیسر میمن کو دیکھا ہے، اور ان کی باتیں سنی ہیں، اور ہمارے زمانے میں جو چھٹ بھیوں کا زمانہ ہے، پروفیسر میمن ایسی قدآور شخصیت بھی گزری ہے۔ پروفیسر عبدالعزیز میمن سے میرا ایک واسطہ تو یہ ہے کہ ان کے صاحب زادے محمد محمود میمن ٹیچرز ٹریننگ کالج اجمیر میں میرے استاد تھے اور دوسرا واسطہ یہ ہے کہ اجمیر میں میرے دوست دادو سیٹھ کے خاندان میں میمن صاحب کے انہی صاحب زادے کی شادی ہوئی تھی اس لحاظ سے پروفیسر میمن صاحب کی زیارت پہ زیارت ہوتی رہی۔

غالب کو فارسی زبان پر جو دعویٰ تھا وہی پروفیسر صاحب عربی پر کر سکتے ہیں۔ غالب کا ایران سے اور ایرانیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور اگر کچھ تھا تو اشعار کا تھا لیکن پروفیسر عبدالعزیز میمن نے تو ہر عرب ملک میں عربی ادب کے جتنے بھی خزانے تھے، چھان ڈالے تھے عربی ادب کی نادر کتابیں اپنے حافظے میں محفوظ کر لی تھیں۔ پھر ان کا حافظہ:

تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

عربی زبان کے کسی شاعر کا ذکر چھیڑ دیجیے اور پھر بیٹھے آرام سے سنتے رہیے۔ کوئی موضوع لے لیجیے۔ اور اب اس موضوع سے متعلق جتنی کتابیں ہیں، ان کے نام، ان کے اقتباسات اور ان کے حوالے سنتے جائیے غرض کہ علامہ عربی ادب کا چلتا پھرتا کتب خانہ ہیں۔ جب عرب ملکوں کے علمی و ادبی حلقوں میں پاکستان کا نام لیا جاتا ہے تو یہ پوچھا جاتا ہے کہ کیا یہ وہی پاکستان ہے جہاں پروفیسر میمن رہتے ہیں۔ پروفیسر میمن نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں گزارا۔

محب گرامی عبیداللہ قدسی نے اپنی کتاب "محاسبہ جائزہ" اور "نمودِ سحر" میں علامہ میمن کے چند واقعات قلم بند کیے ہیں جو ہم یہاں لکھ رہے ہیں:

ایک روز مولانا میمن میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ کتاب النبلا کے اشعار حفظ سنا رہے تھے، ڈاکٹر معظم علی (جو ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور عربی کے پروفیسر تھے) آ گئے۔ اور میمن صاحب کو دیکھ کر کہا۔ آہا مولینا آپ سے خوب ملاقات ہوئی۔ میں ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر بیٹھ گئے اور عربی کے ایک شاعر کے متعلق کچھ سوال کیا۔ مولینا نے حوالوں کے ساتھ بڑے محققانہ انداز میں پورا حال، اشعار اور کتابوں کے حوالے بیان کرنے شروع کیے۔ کچھ ہی دیر بعد معظم علی صاحب نے گھڑی دیکھی اور کہا۔ اوہو۔ مولینا خیال نہیں رہا۔ مجھے ایک جگہ جانا ہے۔ مولینا نے بلند آواز سے کہا۔ بیٹھ جاؤ معظم علی جب تم میں علم کا شوق نہیں ہے تو پھر سوال کیوں کیا تھا؟

۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے، دہلی میں برصغیر کی مشہور اورینٹل کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کے تین روز تک اجلاس ہوئے۔ ہندوستان کے تمام مشاہیر نے مقالے پڑھے۔ اس کانفرنس کے دولہا علامہ عبدالعزیز مانے گئے۔ شروع کے ایک دو مقالوں کے بعد میمن صاحب کی تنقید سن کر لوگ بغلیں جھانکنے لگے۔ سر شاہ سلیمان نے ایک تو اضافت پر لیکچر دیا تھا جو اس وقت مطبوعہ تقسیم ہو گیا تھا۔ اور ایک نشست میں ابن ہیثم پر مقالہ پڑھا۔ شاہ صاحب نے لکھا تھا۔ اس کا نام ابن الحسن ہے۔ میمن صاحب نے بیروت کی کئی کتابوں کے کھڑے کھڑے حوالے دے کر شاہ صاحب کی غلطیاں پکڑ لیں اور سر شاہ سلیمان سے کہا کہ آپ لوگ دوسروں کی معلومات کے سہارے لکھتے ہیں اور ہمارا معاملہ اصل ماخذ سے متعلق ہے۔

سید سلیمان ندوی صاحب اس اجلاس میں محض اس لیے شریک نہیں ہوئے کہ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ میمن صاحب ان کے مقالے پر تنقید کریں گے۔ کیوں کہ سلیمان ندوی صاحب نے علامہ میمن کے خلاف ایک مضمون معارف میں شائع کر دیا تھا۔

اور آخر میں قدسی صاحب نے سید امجد علی اور علامہ میمن کی اس ملاقات کا ذکر کیا ہے جس میں "زوالِ اسلام" پر کتاب لکھنے کے سلسلے میں قدسی صاحب نے علامہ میمن سے ان کا تعارف کرایا۔ اور اب اس ملاقات کا حال قدسی صاحب ہی کی زبانی سنیئے:

> "کس مضمون پر آپ کتاب لکھنا چاہتے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا۔ "زوالِ اسلام پر" مولانا کی تیوری چڑھ گئی۔ کہا۔ "تمھارا زوال ہو گیا تو اسلام کا زوال ہو گیا۔ اسلام کا زوال کبھی ہوا ہے نہ ہو گا۔ لوگوں کا زوال ہوتا ہے۔ اسلام تو اسی طرح تاباں و درخشاں ہے۔ تم عمل نہیں کرو گے، دوسرے عمل کریں گے۔ اسلام تو خدا کا دین ہے۔ اگر خدا موجود ہے تو اسلام بھی موجود ہے۔"

قدسی صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا کی کتابیں ممالکِ عرب میں چھپتی ہیں اور وہیں پڑھائی جاتی ہیں ۔ بیسیوں پروفیسر انھیں اپنی کتابیں شرفِ نظر سے گزر جانے کے لیے بھیجتے ہیں ۔ ڈاکٹر عبدالمعید جب ۱۹۵۴ء میں امریکہ گئے اور فلپ حتّی سے ملے تو انھوں نے کہا ۔ میں پاکستان سے واقف ہوں ۔ وہاں علامہ عبدالعزیز میمن رہتے ہیں ۔ اس سے مولانا کی عالمی شہرت کا اندازہ کر لیجیے ۔"

پروفیسر عبدالعزیز میمن کی عمر اس وقت ۸۰ سال کے لگ بھگ ہے ۔ وہ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے ۔ وطن راج کوٹ کاٹھیاوار ہے ۔ یہاں لکھنؤ سے ایک عالم فاضل آئے تھے ۔ نام ان کا مولانا عبدالحق تھا ۔ راجکوٹ میں ان کی مجلسیں ہوا کرتی تھیں جن میں میمن صاحب کے والد حاجی عبدالکریم مرحوم بھی شرکت کیا کرتے تھے وہ مولانا کی علمیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا کہ ان کے ہاں جو پہلی اولاد نرینہ پیدا ہوگی اُسے وہ عربی زبان کا عالم فاضل بنائیں گے ۔ چنانچہ ۱۸۸۸ء میں حاجی عبدالکریم صاحب کی گوندل میں شادی ہوئی اور اُسی سال کے آخری مہینے میں مولانا عبدالعزیز میمن پیدا ہوئے ۔ کچھ دنوں جونا گڑھ کے مہابت مدرسہ میں تعلیم پائی ۔ ۱۹۰۱ء میں دِلّی گئے اور پھاٹک جبش خان میں سیّد نذیر حسین محدث دہلوی سے فارسی، عربی، صَرف و نحو، تفسیر و حدیث کا درس لیا ۔ اور ۱۹۰۸ء میں امروہہ آئے ۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے شاگرد رشید احمد حسین مرحوم سے استفادہ کیا اور رام پور کے مدرسہ عالیہ میں ۲½ برس تک عربی معقولات اور فارسی اور عربی میں تعلیم پائی ۔ ۱۹۱۱ء میں پنجاب سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی ۔ اس عرصے میں مولوی فاضل کے طلبہ کو عربی پڑھاتے رہے اور پھر ۱۹۱۳ء میں اسی یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا ۔ اور پھر یونیورسٹی میں اوّل آئے ۔ اور چالیس برس تک کوئی طالب علم اتنے نمبر اور یہ پوزیشن حاصل نہ کر سکا ۔ ۱۹۱۲ء میں میٹرک تک انگریزی پڑھی، اور ۱۹۱۳ء میں ایڈورڈ کالج پشاور میں فارسی کے لیکچرار مقرر ہوئے اور ۱۹۲۰ء میں اورینٹل کالج لاہور میں فارسی اور عربی پڑھانے لگے ۔ اس عرصہ میں علامہ میمن نے عربی نصاب کے ترجمے کیے اور ان کی شرحیں لکھیں اور اس وجہ سے ان کی شہرت سارے مُلک میں پھیل گئی ۔ ۱۹۲۵ء میں دکن گئے اور وہاں نواب عماد الملک سیّد حسین بلگرامی کو عربی میں ایک قصیدہ سُنایا ۔ جو نواب صاحب کو بہت پسند آیا، اور انھوں نے بہت تعریف کی اور یہ کہا کہ میں نے اتنی فصیح عربی کہیں نہیں دیکھی ۔ نواب صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمان خان شیروانی نے علامہ میمن کو مجبور کیا کہ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے منسلک ہو جائیں ۔

علامہ نے فرمایا کہ وہ ریڈر سے کم درجے کا عہدہ قبول نہیں کریں گے ۔ چنانچہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۴ر نومبر ۱۹۲۵ء میں ریڈر مقرر ہوئے ۔ علی گڑھ میں شعبۂ عربی میں انگریز پروفیسر ہوا کرتے تھے ۔ علامہ کی قابلیت اور اس عرصے میں ان کا کام دیکھ کر انھیں پروفیسر بنانے کا سوال اُٹھایا گیا ۔ کچھ

لوگ روایات پر ڈٹے رہے۔ تو انگریزوں نے یہ کہا کہ علامہ میمن کے ہوتے ہوئے کسی انگریز کو پروفیسر بنانا حماقت ہے۔ پروفیسری کے عہدے کے لیے مقابلہ ہوا اور علامہ میمن کے سامنے کوئی ٹھہر نہ سکا۔ اور علامہ عربی کے پروفیسر کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۵۰ء کو علامہ ریٹائر ہوئے۔ اپنے بچوں سے ملاقات کرنے کے لیے پاکستان آئے۔ یہاں ڈاکٹر ممتاز حسن، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام اور علامہ میمن کے شاگرد رشید جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے، جو آج کل سندھ یونیورسٹی میں وائس چانسلر ہیں، ان پر زور ڈالا کہ وہ یہاں رہ جائیں۔ پروفیسر صاحب کے ہاتھوں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کا قیام عمل میں آیا۔ پھر کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ عربی میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اس طرح اعزازی طور پر انسٹی ٹیوٹ میں بھی کام کرتے رہے۔ پھر پروفیسر حمید احمد خاں کے اصرار پر ۱۹۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔

علامہ میمن یہ فرماتے ہیں کہ عربی گرامر سے انھیں الجھن ہوتی تھی لیکن ڈپٹی نذیر احمد نے اسے اس طرح پڑھایا کہ یہ اُن کے لیے بہت آسان ہو گئی۔ ڈپٹی صاحب اپنے شاگرد کی قابلیت پر فخر کرتے تھے۔ اور یہ سبق پڑھتے تھے اور دوسرے سنتے تھے۔

علامہ میمن المجمع العلمی العربی (عرب اکادمی) دمشق کے قدیم ترین رکن ہیں اور اس ادارے کے رسالے میں علامہ کے بے شمار مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ علامہ میمن کے تبحر علمی پر اہلِ عرب کو فخر ہے۔ اُن کی قدر اپنے ملک میں اتنی نہیں ہوئی جتنی عرب ملکوں میں ہوئی ہے۔ عرب ملکوں کے ادبا اور فضلاء اُن سے مشورہ لیتے ہیں اور زبان اور معلومات کے اعتبار سے انھیں اپنے مسودے دکھاتے ہیں۔ عربی زبان میں علامہ کو جو قدرت حاصل ہے، اس سے زیادہ اُن کا مرتبہ عربی زبان میں ایک محقق کا ہے۔ علامہ نے یوں تو بے شمار مضمون اور درجنوں کتابیں لکھی ہیں جو زیادہ تر مصر میں شائع ہوئی ہیں۔ پروفیسر عبدالعزیز میمن کی زندگی کا بڑا کارنامہ اُن کی کتاب ابو العلاء وما الیہ ہے جس سے پوری عرب دنیا ان سے روشناس ہوئی۔ اور عرب ملکوں کے علمی و ادبی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ پروفیسر صاحب کا دوسرا کارنامہ سمط اللآلی ہے، جو ادبِ عربی کی انسائیکلوپیڈیا ہے اور دس برس کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے۔ اور بے شمار عرب ملکوں کا سفر اختیار کرنے کے بعد یہ کتاب لکھی گئی اور آج عرب کا کوئی عالم اس سے بے نیاز نہیں ہے۔

علامہ عبدالعزیز میمن کی دو اور تصانیف نے عرب دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی، ان میں سے ایک کا نام الوحشیات ہے اور دوسری کا التشبیہات۔

حال ہی میں صوبہ سندھ کی حکومت نے غالباً ۲۵۰ روپے کا وظیفہ تقریباً دو سال کے لیے پروفیسر عبدالعزیز میمن کی معذوری کی وجہ سے مقرر کیا ہے۔ ہم حکومتِ سندھ سے اور بالخصوص وفاقی حکومت کے محکمۂ تعلیم سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ پروفیسر علامہ میمن کی معذوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اُن کی خدمات کے

اعتراف ہیں اُن کی اس ضعیفی میں ان کو خاطر خواہ مالی امداد فراہم کرے۔

پروفیسر عبدالعزیز میمن کچی میمن سوسائٹی کے ایک ٹوٹے پھوٹے بنگلے میں تنہا فروکش ہیں۔ اُن کی اہلیہ سخت علیل ہیں اور وہ اپنے صاحب زادے محمد محمود میمن کے ہاں حیدرآباد میں رہتی ہیں۔

پروفیسر صاحب صبح آٹھ بجے اپنی صاحب زادی بہن صفیہ کے یہاں چلے جاتے ہیں اور دوپہر کو اپنے گھر واپس آتے ہیں حُقّے کے بہت شوقین ہیں۔ دن بھر پڑھتے ہیں اور حُقہ پیتے ہیں۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی اور جامعہ کراچی کے شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر ڈاکٹر خورشید اُن کے شاگرد ہیں اور اُن پر علامہ کو بڑا ناز ہے اور وہ انھیں اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے ہیں اور اُن کی تعریف کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ علامہ میمن کو تن درستی عطا فرمائے اور ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم اُن کی جتنی بھی خدمت کر سکتے ہیں، کریں۔ علامہ میمن ایسی شخصیتیں صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔[1]

---

[1] یہ مضمون علامہ میمن کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

عالم باعمل، درویش خدامست، بے باک، نڈر، ادائیں قلندرانہ، جلال سکندرانہ، بارعب چہرہ، رنگ سپید سرخی مائل، آنکھوں میں جلال، چہرے پر جمال، لانبا قد، دُہرا بدن، سر پر پٹے، گھنی داڑھی، بالوں پر مہندی لگاتے تھے۔ ان کی آواز میں بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج تھی۔ لمبا سیاہ کُرتا، پاؤں میں چپل ——— یہ تھے سید عطاء اللہ شاہ بخاری، جن کے بارے میں مولانا ظفر علی خان نے یہ شعر کہا تھا:

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے

بُلبُل چہک رہا ہے ریاضِ رسول ؐ میں

آدھی عمر جیل میں گزار دی۔ فرنگی حکومت ان کے نام سے کانپ جاتی۔ جس شہر میں جاتے نوبت پر چوٹ پڑتی اور نقارچی یہ اعلان کرتا کہ آج فلاں مسجد یا فلاں باغ میں امیرِ شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کریں گے تو لوگ جوق در جوق جلسہ گاہ میں اس طرح پہنچتے، جیسے عید کی نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ کیا بچے، کیا جوان، کیا بوڑھے اور کیا عورتیں، تا حدِ نظر مخلوقِ خدا نظر آتی۔ شاہ جی نمازِ عشاء کے بعد اپنی تقریر شروع کرتے۔ لاؤڈ سپیکر اور مائکروفون کا رواج نہیں تھا۔ اس زمانے کے مقرروں کے گلے میں لاؤڈ سپیکر ہوتا تھا۔ ان کی آواز ایک محلے سے دوسرے محلے میں پہنچتی تھی۔ اور شاہ جی کی آواز تو میلوں پہنچتی۔ شاہ جی نہ جانے کیا سحر کرتے کہ جب وہ بولتے تھے تو لوگوں کو سانپ سونگھ جاتا۔ کسی کو پہلو بدلنے کا موقع نہ ملتا۔ لب بند ہو جاتے۔ ہنسانے پر آتے تو مجمع کشتِ زعفران بن جاتا اور رُلانے پہ آتے تو خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رُلاتے۔ گریبان آنسوؤں سے بھیگ جاتے اور جب صُبح کی اذان ہوتی تو لوگوں کو معلوم ہوتا کہ وقت کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

شاہ جیؒ نے اگرچہ ساری زندگی پنجاب میں گزاری تھی لیکن جب وہ تقریر کرتے تو ان کی زبان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کہاں کے ہیں۔ البتہ جب تقریر کرتے کرتے وہ پنجابی بولنے لگتے تو یہ معلوم

ہوتا کہ وہ پنجابی ہیں۔ تلاوت اس طرح کرتے کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ یوں لگتا کہ جیسے خود قرآن بول رہا ہے۔ جب مثنوی مولوی ترنم سے پڑھتے تو لوگوں کو وجد آجاتا۔ بات یہ ہے کہ ان کی ہر بات ان کے دل کی گہرائی سے نکلتی تھی۔ تقریر کے دوران کبھی کبھی لطیفے بھی سناتے شاہ جی کا ہاتھ مجمع کی نبض پر رہتا۔ جب وہ یہ دیکھتے کہ بات ذرا لمبی ہو رہی ہے تو وہ ہنسانے لگتے اور پھر اپنی بات پر آجاتے۔ فنِ خطابت تو شاہ جی پر ختم ہو گیا تھا۔ ان کا حافظہ ایسا تھا کہ اُردو، فارسی اور عربی کے ہزاروں اشعار انھیں یاد تھے۔ وہ اپنی تقریروں میں سیاست کے ایسے نکتے اور ایسے پہلو نکالتے کہ لوگ حیران رہ جاتے۔

اس زمانے میں بھی سیاست دانوں نے بہت کھایا کمایا تھا لیکن شاہ جی کی یہ حالت تھی کہ کپڑوں کا ایک جوڑا دھوتے تو دوسرا پہنتے۔ وہ اپنے سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ سردی کے موسم میں میں نے انھیں اپنی گدڑی سیتے دیکھا ہے۔ وہ بڑے دیانت دار تھے۔ وہ جو کہتے کر دکھاتے۔ ان لوگوں کے پاس نہ پستول تھا اور نہ بندوق تھی۔ ان کے ہتھیار ان کی سچائی تھی، ان کا کردار تھا اور ان کی پرتاثیر زبان تھی۔ وہ اپنی تقریروں سے توپوں کے مُنھ پھیر دیتے۔ ساری زندگی جیل میں کاٹی۔ مسجد شہید گنج کے انہدام سے شاہ جی اور مولانا ظفر علی خان میں اَن بن ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر حملے کرتے لیکن ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے۔ شاہ جی کے بارے میں جہاں مولانا ظفر علی خان نے یہ کہا تھا کہ:

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بُلبُل چہک رہا ہے ریاضِ رسُول میں

تو جب شہید گنج کا مسئلہ کھڑا ہُوا اور مولانا احراریوں کے خلاف ہو گئے تو مولانا نے شاہ جی کے بارے میں یہ بھی فرمایا:

اِک طفلِ پری رُو کی شریعت فگنی نے
کل رات نکالا مرے تقویٰ کا دوالا

ایک مرتبہ میرے گھر کے سامنے شاہ جی تقریر کرنے کی غرض سے آئے۔ جلسے کے منتظمین نے مجھ سے کہا کہ شاہ جی تقریر کرنے سے پہلے تمھارے یہاں آکر بیٹھیں گے۔ مَیں نے کہا کہ شاید اس بات پر مولانا ظفر علی خان صاحب مجھ سے خفا ہو جائیں۔ لوگوں نے یہ بات شاہ جی کو بتائی۔ تو وہ ہنس کر خاموش ہو گئے لیکن جب اِس بات کا علم مولانا ظفر علی خان کو ہُوا تو وہ بہت خفا ہُوئے۔ اور کہا کہ شاہ جی تمھارے لیے قابلِ احترام ہیں۔ ویسے مَیں بھی ان کا احترام کرتا ہوں۔ اب تم جاؤ اور شاہ جی سے معافی مانگو۔ اور جب مَیں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہُوا اور ان

ان سے معافی مانگنے لگا تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ شاہ جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور میرے لیے دُعا کی اور فرمایا۔ میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔

شاہ جی کی من موہنی شخصیت جب بھی یاد آتی ہے تو اُس کے ساتھ ساتھ جوش صاحب کا یہ شعر بھی یاد آجاتا ہے:

اُبھرے تو آندھی ، بپھرے تو طوفان
چٹکے تو غنچہ ، لرزے تو شبنم

مَیں شاہ جی کا نیاز مند تھا۔ اکثر ان کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا اور ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی سے لطف اندوز ہوتا اور پھر جب کبھی ہمارے یہاں شب دیگ کا اہتمام ہوتا تو میں شاہ جی کو اپنے ساتھ لے آتا۔ کبھی کبھی شاہ جی بھی ہمیں بُلوا لیتے۔ شاہ جی بہت خوش خوراک تھے۔

شاہ جی کی آدھی سے زیادہ زندگی جیلوں میں کٹی۔ وہ جس تحریک میں شامل ہو جاتے تو بڑی دلچسپی سے اس کے لیے کام کرتے۔ وہ پارٹیاں نہیں بدلا کرتے تھے بلکہ اپنی پارٹی کو ڈھب پر لے آتے تھے۔ احراری ہونے کی وجہ سے اُن کی بڑی مخالفت ہوئی۔ لیکن شاہ جی مرتے دم تک احرار میں شامل رہے۔ شاہ جی میں استقلال بھی تھا اور استقامت بھی۔ وہ مصلحتوں کے آدمی نہیں تھے۔ وہ بڑے صاف، سچے اور کھرے انسان تھے۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے دل کی دھڑکن بھی تھے اور آڑے وقت میں اُن کا سب سے مضبوط اور قابلِ اعتماد سہارا بھی تھے۔ وہ خطیب تھے، ادیب نہیں تھے۔ لیکن جب وہ تقریر کرتے تو یوں لگتا کہ جیسے ادب اور شاعری ان کی شخصیت اور خطابت میں گھُل مِل گئی ہے، دَم تقریر بڑے بڑے ادیب اور شاعر ان کا منھ دیکھتے رہ جاتے۔

اللہ تعالےٰ شاہ جی کی رُوح پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے (آمین) ہم بھی کیسے بد نصیب اور احسان فراموش ہیں کہ اتنے بڑے جادُو بیان اور سرفروش خطیب کو بھُلا بیٹھے جس کی ساری زندگی قوم کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے میں کٹ گئی۔ مولانا ظفر علی خان اور شاہ جی کا آخری زمانہ قابلِ عبرت ہے۔ مولانا تو مفلوج ہو گئے تھے لیکن شاہ جی کو گرد و پیش کے حالات اور قوم کی بے حِسی نے مفلوج کر دیا تھا۔

مولوی محمدؐ ایوبؒ

اگرچہ مولوی صاحب تابعین اور تبع تابعین کے دور کے بہت بعد پیدا ہوئے۔ لیکن ان قدسی صفات بزرگوں کے حالات کتابوں میں پڑھ کر اور مولوی صاحب کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے مولوی صاحب انہی میں سے ہیں۔ وہی صبر و تحمل۔ وہی عاجزی۔ وہی انکسار۔ وہی شانِ قلندری۔ وہی جلال وہی جمال۔ وہی سادہ زندگی اور حصول اکل حلال۔ وہی خود تکلیفیں اٹھانا اور دوسروں کا بھلا چاہنا، اور ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنا۔

قدموں میں ڈھیر اشرفیوں کا لگا ہوا
اور تین دن سے پیٹ پہ پتھر بندھا ہوا
ہیں دوسروں کے واسطے سیم و زر و گہر
اپنا یہ حال ہے کہ ہے چولہا بجھا ہوا

مولوی صاحب نے ابتدائی تعلیم رواج کے مطابق آج سے تقریباً ترے سال پہلے دلّی کی جامع مسجد میں حاصل کی اور پھر خیر آبادی مکتبِ فکر کے ایک بزرگ محمد اسحاق صاحب سے تفسیر، حدیث، فقہ اور علم الکلام کا درس لیا۔ طریقت میں قدم رکھا تو دل کا کنول روشن ہو گیا۔ اب جو کلام پاک کا مطالعہ کرنے لگے تو یوں لگا کہ جیسے اب استاد کوئی اور ہے۔ حرف و نقطہ میں روشنی پھیلی تو معنی وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے۔ جب یوں کلام پاک کا مطالعہ کر چکے تو دل میں آئی کہ اس نور کو عام کیا جائے تاکہ ملتِ اسلامیہ کے ذہنوں پر حروف و الفاظ اور مطالب و معانی کے جو پردے پڑے ہوئے ہیں، وہ اٹھ جائیں۔

کلامِ پاک کے مطالعے سے کچھ لوگوں پہ شریعت کی راہیں روشن ہوتی ہیں اور کچھ لوگوں پر طریقت کی۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن پر یہ دونوں راستے بیک وقت روشن ہو جاتے ہیں۔ مولوی صاحب ان قدسی صفات بزرگوں میں سے تھے جن پر دونوں راستے روشن تھے۔ مولوی صاحب علمِ منطق اور علمِ کلام میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یوں تو ان کا تعلق خیر آبادی مدرسۂ فکر سے تھا لیکن تحصیل

علم کے بعد انھوں نے اپنی فکر کا ایک نیا راستہ نکال لیا۔ ان کا اندازِ فکر ایک حد تک فخر رازی رحہ سے مشابہ تھا۔ مولوی صاحب کی اساسِ فکر قرآنِ حکیم تھی۔ وہ ساٹھ برس تک اس کا مطالعہ کرتے رہے۔ کوئی تفسیر ایسی نہیں تھی جو اُن کی نظر سے نہ گزری ہو۔ یادداشت ایسی تھی کہ اگر کسی آیت کی تفسیر بیان کرنے لگتے تو کوئی مفسر ایسا نہیں جس کی رائے، مطالب و معنی کا مولوی صاحب حوالہ نہ دیں۔ اور منطقی انداز سے اس پر جرح و قدح نہ کریں۔ مولوی صاحب اپنے عہد میں امام المتکلمین تھے، اور اعلیٰ پائے کے مفسر بھی۔ مولوی صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دوسرے علوم کے حصول میں ضائع کیا۔ جس کا مجھے بڑا دکھ ہے۔ اگر میں کلام پاک ہی کا مطالعہ کرتا رہتا تو مجھے سارے علوم یہیں مل جاتے کہ یہ کتاب ساری کتابوں پر بھاری اور اس کا علم سارے علوم کا سرچشمہ ہے۔ اس کے مطالعے سے دل روشن ہوجاتا ہے اور کائنات کے اسرار و غوامض سامنے آجاتے ہیں۔ وہ پردے جو خالق و مخلوق کے درمیان حائل ہیں، بصیرتِ قرآنی سے کھلنے لگتے ہیں۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ آپ کے خیال میں مسلمانوں کے انحطاط کا باعث کیا ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا۔" جب سے مسلمانوں نے تقلید پر اتفاق و اتحاد کیا اور تدبر فی القرآن سے ہٹ گئے۔ وہ ذہنی انتشار کا شکار ہوکر بکھر گئے۔

بہ بند صوفی و مُلّا اسیری
حیات از حکمتِ قرآں نہ گیری

ساٹھ برس تک وہ کلام پاک کا درس دیتے رہے۔ ان کا انداز خطیبانہ نہ تھا بلکہ مکتب کے استادوں ایسا تھا۔ مولوی صاحب ایک آیت لیتے اور کئی دن اس آیت کے سمجھانے میں گزر جاتے۔ اس آیت کے بارے میں مفسرین نے جو کچھ کہا ہوتا، وہ بھی بتاتے جاتے۔ کبھی کسی مفسر سے اتفاق کرتے اور کبھی کسی مفسر کی رائے کو رد کر دیتے۔ مولوی صاحب مشکل سے مشکل مقامات سے بڑی آسانی سے اپنے سننے والوں کو اپنے ساتھ لے کر گزر جاتے۔

مولوی صاحب کی صحبت میں بیٹھنے والے ایک شخص نے بتایا کہ مولوی صاحب سے تفسیر سننے کے بعد یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ آیت اپنا مطلب خود کھولتی چلی جارہی ہے۔ اگر آپ کی سمجھ میں ان کی بات نہ آئے تو وہ آپ کو پھر سمجھائیں گے۔ اگر آپ کسی بات پر اعتراض کریں گے تو وہ آپ کی تشفی کریں گے۔ سب سے بڑی بات جو میں نے محسوس کی، وہ یہ تھی کہ جو لوگ دین سے نابلد ہیں اور دین پر اعتراض کرتے ہیں اور عیسائی مشنریوں اور مبلغین کا جن پر اثر ہوتا ہے، وہ مولوی صاحب کی دو چار صحبتوں میں بیٹھ کر کلمہ پڑھ کر اٹھا کرتے تھے۔ مولوی صاحب ایسے لوگوں کو منطقی انداز سے عقلی دلائل و براہین اور قریب کی باتیں بتا کر قائل کیا کرتے تھے۔ ان کا اندازِ بیان اور

ان کا طرزِ استدلال دین داروں سے زیادہ بے دینوں کے لیے سُود مند تھا۔ مولوی صاحب چھوٹے چھوٹے مسائل لطیفوں اور مزاحیہ انداز سے حل کر دیا کرتے تھے۔

ایک صاحب نے پوچھا کہ حضرت! السلام علیکم کہنا چاہیئے یا سلامٌ علیک۔ مولوی صاحب نے کہا۔ بھائی میں کیا عرض کردوں۔ علماء حضرات خفا ہو جائیں گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ کلام پاک میں جگہ جگہ سلامٌ علیک آیا ہے اور صرف دو یا تین جگہ السلام علیکم آیا ہے۔

ایک شخص نے کہا کہ حضورؐ پر سلام کھڑے ہو کر بھیجا جائے یا بیٹھ کر۔ مولوی صاحب نے کہا: "نماز میں اللہ تعالےٰ کی ثنا کھڑے ہو کر کرتے ہو تو میلاد شریف میں حضورؐ کو سلام بھی کھڑے ہو کر بھیجو۔"

ایک صاحب نے کہا کہ ایک طوائف میلاد کرواتی ہے اور ایک مولوی صاحب بھی اس میں شرکت کرتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا۔ کیا خبر مولوی صاحب کی نجات اسی سے ہو جائے۔ اللہ اللہ! گناہوں میں ملوث ہوتے ہوئے بھی وہ حضورؐ کو یاد رکھتی ہے۔ کیا خبر کہ کب اُس پر نظرِ کرم ہو جائے۔ اور یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ایک مرتبہ میں نے مولوی صاحب سے کہا۔ "مولوی صاحب۔ آپ جب کلام پاک کی تفسیر کرتے ہیں تو آپ کو اتنی باتیں اور اتنے حوالے کیسے یاد رہ جاتے ہیں" فرمایا۔ "میاں۔ یہ تو خود میری سمجھ میں بھی آج تک نہیں آیا۔ بات یہ ہے کہ ہم کیا اور ہمارا علم کیا۔ یہ جو کچھ ہوتا ہے اُدھر سے ہوتا ہے۔ مولا کا کرم ہے۔ کوئی کہلواتا ہے تو کوئی کہتا ہے۔"

مولوی صاحب دوہرے ڈیل کے آدمی تھے۔ میانہ قد اور موٹے سے کپڑے کا کرتا اور راسی کی شلوار پہنا کرتے تھے۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے۔ سر پر کپڑے کی ٹوپی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ سفید داڑھی، لبیں کتری ہوئیں۔ پاؤں میں چپل۔ ہاتھ میں چھڑی۔ پان بہت کھاتے تھے۔ اور اگالدان سامنے پڑا رہتا تھا۔

یوں تو مولوی صاحب کے چاہنے والے بہت سے تھے۔ لیکن کراچی میں ان کے سب سے قریب میرے عزیز بزرگ اور دوست لطیف محمد تھے اور استاد شاقی مرحوم کے چھوٹے بھائی اسلم صاحب۔ حکیم محمد سعید صاحب بھی مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مولوی صاحب کسی کے گھر کھانا نہیں کھایا کرتے تھے۔ ان کے نیازمندوں نے بہت کوشش کی کہ کسی دن مولوی صاحب ان کے ساتھ کھانا کھالیں لیکن مولوی صاحب ٹال دیا کرتے تھے۔

لطیف صاحب سے وہ دل کھول کر باتیں کیا کرتے تھے۔ لطیف صاحب بھی خوب ہیں۔ مولوی صاحب ان پہ فریفتہ تو مولوی عبدالسلام نیازی ان کے دل دادہ۔ جب مولوی صاحب حج

کی غرض سے روانہ ہو رہے تھے تو لطیف صاحب نے کہا ۔"جب آپ سرکارؐ کے دربار میں پہنچیں تو اس عاجز کا سلام عرض کر دیجیے گا۔" مولوی صاحب نے آنکھیں بند کیں اور کہا : " لطیف صاحب ! ہم نے حضورؐ کی خدمت میں آپ کا سلام پہنچا دیا "

مولوی صاحب نے پہلی مرتبہ ایسا کیا ، ورنہ وہ بے پناہ احتیاط برتا کرتے تھے ۔

ایک مرتبہ مَیں دُور بیٹھا تھا ۔ مجھے مضمحل دیکھا تو اپنے پاس بُلایا اور ایک وظیفہ بتایا اور یہ فرمایا ۔ اسے پڑھتے رہا کرو ۔

مُلا واحدی صاحب اللہ بخشے ، بڑی خوبیوں کے مالک تھے ۔ بڑے بڑے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں ۔ ایک مرتبہ مَیں ان کی خدمت میں حاضر ہُوا اور مولوی محمد ایّوب صاحب کا ذکر چھڑ گیا تو فرمانے لگے ۔" میں خواجہ صاحب (خواجہ حسن نظامیؒ) کا مرید ہُوں ۔ وہ طریقت میں میرے استاد ہیں ۔ لیکن شریعت میں میرے استاد مولوی محمد ایّوب صاحب ہیں ۔ مَیں نے ایسا عالم بے بدل اور ایسا عالم باعمل اپنی زندگی میں نہیں دیکھا ۔" فرمایا ۔" مولوی صاحب دہلی میں پُرانی ساڑھیوں کا کاروبار کیا کرتے تھے ۔ اگر کوئی مزدور مل گیا تو اُس سے یہ بوجھ اٹھوا لیا ۔ اگر نہ ملا تو بلا تکلف خود اٹھا کر چل دیتے ۔ انھیں اس بات کا بھی خیال نہ آتا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ اتنا بڑا عالم گٹھڑ کاندھے پر لادے چلا جا رہا ہے ۔"

کبھی یہ ہوتا کہ ان کی سمجھ میں کوئی مسئلہ اور اس کا حل آتا تو وہ ساڑھیوں کا یہ گٹھڑ سڑک کے کنارے چھوڑ کر واحدی صاحب کے یہاں چلے آتے ۔ اور انھیں یہ مسئلہ اور اس کا حل بتاتے اور پھر چلے جاتے ۔

واحدی صاحب اور حکیم محمد سعید صاحب کے برادرِ بزرگ حکیم عبدالحمید صاحب میں یہ طے پایا کہ کسی دن مولوی صاحب کے ساتھ کھانا کھایا جائے ۔ مولوی صاحب حکیم صاحب کے ہاں ہفتہ میں ایک مرتبہ درس دیا کرتے تھے ۔ بات یوں شروع ہوئی کہ واحدی صاحب نے پوچھا ، کہ حضرت ہم نے یہ سُنا ہے کہ آپ قورمہ بہت اچھا پکاتے ہیں ۔ مولوی صاحب نے کہا :" آپ نے صحیح سُنا ہے ۔" عرض کیا ۔" توکل ہو جائے ۔" مولوی صاحب نے نُسخہ لکھوایا ۔ دُوسرے دن سارا سامان آگیا اور مولوی صاحب نے دو گھنٹے میں قورمہ پکا دیا ۔ اور اجازت چاہی ۔ حکیم صاحب اور واحدی صاحب حیران رہ گئے ۔ واحدی صاحب نے کہا ۔" یہ قورمہ آپ نے کس کے لیے پکایا ہے ؟" فرمایا ۔" آپ کی فرمائش پر آپ کے لیے پکایا ہے ۔" عرض کیا ۔" کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں کھائیں گے ؟" فرمایا ۔" بھئی بات یہ ہے کہ میرا معمول ہے کہ مَیں اپنے گھر میں مغرب کی نماز پڑھ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کھانا کھایا کرتا ہُوں ۔ آپ مجھے مجبور نہ کریں ۔ میرے معمول میں فرق آجائے گا ۔" اور مولوی صاحب رُخصت ہو گئے ۔

کراچی میں ایک صُوفی صاحب ہیں۔ اللہ والے، روشن ضمیر۔ مولوی صاحب کے وصال سے کچھ دنوں پہلے وہ بے حد پریشان تھے۔ میں ان کا نام نہیں بتاؤں گا (مجھے اجازت نہیں ہے) مجھ پر بے پناہ کرم فرماتے ہیں۔ اور میرے دوست حاجی محمد صدیق صاحب کے یہاں اکثر ان سے مُلاقات ہُوا کرتی تھی۔ میں نے صُوفی صاحب سے ان کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ برِصغیر کے ایک اور عظیم عالمِ دین اور درویش خُدا سے رُخصت ہو رہے ہیں۔ دِلّی میں عبدالسلام نیازی کی وفات ہو گئی ہے اور ادھر پاکستان میں محمد ایوب صاحب کو بُلاوا آ گیا۔ فرمایا۔ کل صبح مولوی محمد ایوب میرے پاس آئے تھے۔ اور کہتے تھے کہ صوفی صاحب موت برحق ہے اور یہ زندگی میں اللہ کا سب سے بڑا انعام ہے۔ میرے ذمّے کچھ فرائض ہیں، کچھ لوگوں کا حق ہے۔ میں ان سے فارغ ہونا چاہتا ہوں۔ لیکن موت کا فرشتہ دو دن سے میرے سامنے آ کر کھڑا ہو رہا ہے۔ آپ دُعا کیجیے کہ فی الحال وہ سامنے نہ آئے۔ دو چار دن کی بات اور ہے۔ اور یہ کہہ کر صوفی صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

مولوی محمد ایوب صاحب کا فلیٹ بہت بلندی پر تھا۔ وہ بیمار اور ضعیف تھے۔ ان کے پیروں پر سوجن آگئی تھی۔ ڈاکٹر انھیں سیڑھیوں پر چڑھنے سے منع کرتے تھے لیکن وہ آخر وقت تک اپنے روزمرّہ کے مشاغل میں مصروف رہے۔ وہ روزانہ دو میل پیدل جاتے اور اپنی پسند کا گوشت لاتے۔ سودا سلف خریدتے پھر اپنی دکان پر آتے۔ دکان ہینڈ بیگ اور سُوٹ کیس کی تھی۔ پھر قریب کی مسجد میں ظہر کی نماز پڑھاتے۔ گھر آتے، کھانا کھاتے اور کلامِ پاک کی تفسیر لکھنا شروع کر دیتے۔ دکان سے صرف اتنا کما کر لاتے جتنے کی ضرورت ہوتی۔ ہاں اگر ضرورت مندوں کی مدد کرنا ہوتی تو کچھ وقت اور لگا لیتے۔ مولوی صاحب اپنے خاص دوستوں سے قرض لے کر بیواؤں، بے روزگاروں اور محتاجوں کی مدد کرتے اور قرض کی واپسی کی جو تاریخ مقرر کرتے، اس تاریخ کو، خواہ انھیں کسی اور سے قرض کیوں نہ لینا پڑے، وعدے کے مطابق یہ رقم واپس کر دیتے۔

مولانا عبدالسّلام نیازی

حکیم نصیر میاں کا مطب کیا تھا، علم و ادب کا مرکز تھا۔ یہاں نامی گرامی ادیب اور شاعر بھی آتے اور علماء و فضلا بھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ خود نصیر میاں کا علمی و ادبی اور دینی ذوق اور میلانِ طبع اور پھر یہ کہ نصیر میاں علامۃ الہند حضرت مولانا معین الدین کے بھتیجے، اور صحیح معنوں میں ان کی علمی و ادبی میراث کے وارث ہیں۔ اگرچہ حضرت مولانا کے بھائی نصیر میاں کے والدگرامی شفاء الملک حکیم نظام الدین صاحب اور نصیر میاں کے چچا پیارے میاں صاحب جن کا اصلی نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے، بقیدِ حیات تھے۔ (ان دونوں بھائیوں کا آگے پیچھے کراچی میں انتقال ہوا) ... یوں تو پیارے میاں بھی بڑے قابل انسان تھے لیکن اُن کی طبیعت میں لاابالی پن تھا۔ البتہ نصیر میاں بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی اور علم دوست ہیں۔ ویسے یادگارِ زمانہ لوگ اب ہمارے معاشرے میں کتنے رہ گئے ہیں۔ نصیر میاں کی صحبت میں مَیں نے بہت سے بزرگوں سے نیاز حاصل کیا۔ ان میں ایک قلندر اور درویش خدا مست مولانا عبدالسلام نیازی بھی تھے جو نصیر میاں سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اکثر نصیر میاں سے ملنے کے لیے اجمیر چلے آیا کرتے تھے اور دونوں ان کے یہاں قیام کرتے۔

مولانا عبدالسلام صاحب کو جب مَیں نے پہلی مرتبہ نصیر میاں کے دیوان خانے میں دیکھا تو مَیں یہ سمجھا کہ یہ کوئی پہلوان ہیں جن مریضوں کے رگ پٹھوں میں تکلیف ہوتی ہو گی یہ ان کی نصیر میاں کی ہدایت کے مطابق مالش کیا کرتے ہوں گے۔ سر گُھٹا ہُوا، چار ابرُو کا صفایا، اگر سر پہ چوٹی ہوتی اور دھوتی باندھتے تو متھرا کے پانڈے معلوم ہوتے۔ پان کی سُرخی باچھوں سے بہہ کر ٹھوڑی تک آجاتی۔ ململ کا کرتہ، جس پر کتھے چونے کے داغ دھبے، چست پاجامہ، پاؤں میں نری کی جُوتی، آواز بڑی کراری۔ کہیں سے بھی مولوی یا صُوفی یا اہل اللہ معلوم نہیں ہوتے تھے۔

ایک دن میں نے یہ دیکھا کہ دو چار علماء نصیر میاں اور علّامہ فضائی بیٹھے ہیں اور پہلوان صاحب گرج رہے ہیں۔ کبھی آیاتِ قرآنی پڑھ رہے ہیں تو کبھی حدیث کا حوالہ اور وہ بھی عربی متن کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، اور کبھی ذکریا رازی رح اور امام غزالی رح کے اقوال سند میں پیش کرتے ہیں۔ اگر کسی نے اعتراض کیا تو انھوں نے فوراً ایک آدھ جملہ کہہ کر رد کر دیا۔ نصیر میاں کے پاس ایک خادم آیا اور اس نے کہا کہ بڑے حکیم صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔ میں بھی اُن کے ساتھ اُٹھ آیا۔ میں نے نصیر میاں سے پوچھا۔ "یہ صاحب کون ہیں؟" کہا۔ "ارے تم نہیں جانتے! یہ مولانا عبدالسلام نیازی ہیں۔ سارے ہندوستان میں ان کے علم کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے عالم ان کا لوہا مانتے ہیں۔ یہ علم کے سمندر کے شناور ہیں اور پھر ان کا شمار تو اہل اللہ میں ہوتا ہے۔" اور اس کے بعد دو چار مرتبہ مولانا نیازی اجمیر شریف تشریف لائے اور نصیر میاں کے ہاں مجھے ان سے نیاز حاصل ہُوا اور مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ میں نے ان کی باتیں سُنیں اور ان سے باتیں کیں۔

مولانا عبدالسلام نیازی شاہ نظام الدین حسن نیازی بریلوی رح کے، جو شاہ نیاز احمد بریلوی رح کے فرزند اور خلیفہ تھے مرید تھے۔ اور اس طرح یہ چشتیہ نیازیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ سُنا ہے کہ محب گرامی شفیق بریلوی تفصیل سے حضرت مولانا کے بارے میں ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں جس کی بڑی ضرورت تھی۔ شفیق بریلوی صاحب خانقاہی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں اور شاہ نظام الدین حسین صاحب نے انھیں گود میں کھلایا ہے۔ اس وجہ سے مولانا عبدالسلام نیازی ان سے بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ ویسے یہ مولانا کے پیر بھائی بھی ہیں۔

مولانا عبدالسلام نیازی اپنے غصّے کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ شیخ جب فلاں شخص نے یہ بات کہی تو ہمارا ناریل چٹخا اور پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ جن لوگوں نے مولانا کا ناریل چٹختے دیکھا ہے، ان کا یہ کہنا ہے کہ مولانا کا جلال دیکھنے کا ہوتا تھا۔ وہ اپنے حریفوں پر ایسا گرجتے برستے تھے کہ اللہ کی پناہ۔ گالیاں دینے پر آتے تو ان کی گالیوں میں بھی علمی و ادبی رنگ جھلکتا۔ وہ عالموں میں عالم تھے، رندوں میں رند۔ لیکن ان دونوں میں وہ اپنی منفرد شخصیت کا بھرم ہر حال میں قائم رکھتے۔ خود عالم ان سے یوں کتراتے کہ انھیں اپنے مبلغ علم کا صحیح اندازہ ہو جاتا۔ اور دوسروں پر ان کا بھرم کھل جاتا۔ اور رند اُن سے یوں گھبراتے کہ رندی میں بھی ان کا جواب نہ تھا۔ اگر کوئی مولانا سے وظیفہ پوچھتا تو ایک گالی بک دیتے اور کہتے، بس اسی کا ورد کرتے رہو۔ مولانا شرع کے پابند تھے، کیا مجال جو نماز قضا ہو جائے۔ وہ عابد شب زندہ دار تھے۔ مولانا نے اپنے آس پاس ایسی دیواریں اٹھالی تھیں کہ کوئی آسانی سے ان کے قریب نہیں آسکتا تھا۔ محب گرامی لطیف محمد صاحب، جو

انگلو بین کمپنی کے ڈائرکٹر ہیں، مولانا کے نیازمند تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مولانا سے کہا۔ میں مرید ہونا چاہتا ہوں۔ یا تو آپ کسی کا نام بتایئے جس کے ہاتھ پر بیعت کر لوں یا پھر آپ اپنے ہاتھ پر بیعت لے لیجیے۔ فرمایا۔ "شیخ یہ سب چکر ہے تم اس میں نہ پڑو۔ سیدھا اللہ میاں سے ناتا جوڑو۔" انھی لطیف صاحب نے ایک مرتبہ مولانا سے کہا "میں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ کے مواعظ حسنہ کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دُنیا سے جی نہ لگاؤ۔ دنیا بڑی خراب ہے۔ ایک طرف تو آپ یہ کہتے ہیں کہ اسلام رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا۔ اور دوسری طرف آپ ترکِ دُنیا پر بھی مائل کرتے ہیں۔ آخر یہ سب کیا ہے؟"

مولانا مسکرائے اور فرمایا! "شیخ تم نے کبھی شطرنج کھیلی ہے، اور اگر نہیں کھیلی ہے تو کھیلتے ہوئے تو ضرور دیکھی ہوگی۔ شطرنج کھیلنے والے کا دل بساطِ شطرنج کے مہروں کی چالوں میں لگا رہتا ہے۔ اس کو نہ کھانے کی فکر ہوتی ہے اور نہ گھر بار کا ہوش۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے اور سب کی سُنتا ہے لیکن اس کا دل شطرنج کے مہروں کی چالوں سے کسی طور علیحدہ نہیں ہوتا۔ بس یہی رجوع الی اللہ ہے۔ لو اللہ سے لگائے رکھو اور دنیا میں ہنسی خوشی رہو۔ بس یہی اللہ تعالیٰ اور اسلام تم سے چاہتا ہے۔ یہی ترکِ دُنیا ہے اور یہی توبہ الی اللہ۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب حضرت مولانا عبدالسلام نیازی کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ مولانا نے ان سے عربی پڑھی ہے۔ مولانا صاحب کے لیے صبح چار بجے کا وقت مقرر تھا۔ دِلّی کی سردیاں اور صبح چار بجے کا وقت۔ مولانا دروازے پر ایک ہلکی سی دستک دیتے اور نیازی صاحب دروازہ کھول دیتے۔ مولانا کے بھائی سید ابوالخیر صاحب بھی مولانا نیازی کے شاگرد تھے۔ مولانا نیازی کی شاگردی کرنا لوہے کے چنے چبانا تھا۔ اگر کسی شاگرد سے خفا ہو جاتے تو اتنا مارتے کہ بے دَم کر دیتے۔ لیکن مولانا کے علم کی بھٹی سے جو بھی نکلتا کندن بن کر نکلتا۔ دِلّی کے ایک رئیس نے اپنے صاحب زادے کو مولانا کی شاگردی میں دیا۔ صاحبزادے صاحب اس طرح آئے کہ نوکر کی بغل میں ان کا بستہ تھا۔ بس مولانا کا ناریل چٹخا۔ فرمایا۔ جو لڑکا علم کا بوجھ دوسروں پر لادتا ہے، وہ میرے یہاں سے کیا لے کر جائے گا؟ چٹاں چہ صاحب زادے کو واپس بھجوا دیا۔ ان کے ایک شاگرد صلاح الدین قریشی ہیں جو اُردو بورڈ میں ملازم تھے۔ صلاح الدین قریشی نے بتایا کہ جب مولانا یہ دیکھ لیا کرتے تھے کہ ان کے شاگرد ان کے مزاج کی تلخی برداشت کر لیتے ہیں تو پھر وہ اپنے علم کا خزانہ کھول دیا کرتے تھے۔

مولانا یہ فرمایا کرتے تھے کہ دُنیا کا بنیادی علم کلامِ پاک میں ہے، اور ان کتابوں میں ہے جو بعثت کے بعد تین صدی تک لکھی گئیں۔ اور پھر اس کے بعد سب شاعری اور ساحری ہے

اگرچہ مولانا عبدالسلام نیازی نصیر میاں سے عمر میں بہت بڑے تھے لیکن ان میں برابری کی دوستی تھی ۔ نصیر میاں کبھی کبھی گستاخی بھی کر جاتے اور پھر مولینا معین الدین صاحب اور خود نصیر میاں کے تبحر علمی کی وجہ سے بھی مولینا نصیر میاں کو بہت عزیز رکھتے تھے اور طرح دے جاتے تھے ۔

ایک مرتبہ وائسرائے ہند (شاید لارڈ اروِن) کو مولینا کی ضرورت پڑی اور ضرورت یہ تھی کہ وائسریگل لاج کی ایک دیوار پر ایک مخطوطہ معاون کے زمانے کا آویزاں تھا۔ بہت سے لوگوں سے اسے پڑھوایا گیا لیکن کوئی ٹھیک سے نہ پڑھ سکا کیوں کہ اس مخطوطے کے بہت سے الفاظ مٹے ہوئے تھے ۔ چنانچہ مولانا کو بلوایا گیا اور انھوں نے فرفر پڑھ ڈالا جب وائسرائے کو مولانا کے آنے کی خبر دی گئی تو وہ دبے پاؤں آکر مولانا کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ ان کی تعریف تو سُن ہی چکا تھا۔ اس وقت جب مولانا مخطوطہ پڑھ رہے تھے تو کچھ افسروں نے مولانا کو وائسرائے کی موجودگی کے بارے میں بتانا چاہا تو وائسرائے نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ خود مولانا نے یہ واقعہ لطیف محمد صاحب کو سنایا تھا۔ یاد رہے کہ لطیف محمد صاحب کی ملاقات بھی مولینا سے حکیم نصیر میاں ہی کے توسّل سے ہوئی تھی ۔

لطیف صاحب دوسرے تیسرے مولانا کی صحبت میں حاضر ہوتے ۔ ایک بار انھوں نے یہ سوچا کہ مولانا کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور ہم ان کی صحبت میں شریک ہو کر کیسی کیسی باتیں گرہ میں باندھ لیتے ہیں ۔ اور چوں کہ یہ سن رکھا تھا کہ مولانا تیل کا اور عطر کا کاروبار کرتے ہیں لہٰذا ایک مرتبہ لطیف صاحب نے کہا کہ مولانا سُنا ہے کہ آپ عطر اور تیل کا کاروبار کرتے ہیں اور عطر اور تیل کی ہم کو بھی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا اس میں کیا مضائقہ ہے کہ ہم آپ ہی سے لے لیا کریں ۔ چناں چہ چلتے وقت مولانا نے انھیں تیل کی ایک بوتل اور ایک عطر کی شیشی دی اور لطیف صاحب نے اس کی قیمت ادا کر دی ۔ دوسری مرتبہ لطیف صاحب کے بے مانگے مولانا نے ایک عطر کی شیشی اور ایک تیل کی بوتل انھیں دی ۔ لطیف صاحب نے کہا ۔ ابھی میرے پاس تیل اور عطر موجود ہے ۔ مولانا نے کہا یہ بھی لیتے جاؤ ۔ کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ لطیف صاحب کی جیب میں پیسے نہیں تھے ۔ لہٰذا انھوں نے پھر انکار کیا ۔ مولانا مصر ہوئے تو لطیف صاحب کو کہنا پڑا کہ اس وقت میری جیب میں پیسے نہیں ہیں ۔ مولانا نے کہا کہ کوئی مضائقہ نہیں ہے پیسے پھر آجائیں گے ۔ اس پر ایک صاحب نے جو مولانا سے قریبی تعلق رکھتے تھے ، مولانا سے کہا جب انھیں ضرورت نہیں ہے تو آپ کیوں مصر ہو رہے ہیں ۔ مولانا نے کہا "شیخ یہ ہمارا اور ان کا معاملہ ہے ، او رتم سمجھتے نہیں ہو ۔ بات یہ ہے کہ یہ ہم سے سودا کرنا چاہتے ہیں ۔ ہم انھیں اچھی اچھی باتیں بتاتے ہیں اور یہ اس کا معاوضہ دینا چاہتے ہیں ۔ لطیف صاحب نے کہا کہ مولانا کی یہ بات سن کر مجھ پر

گھڑوں پانی پڑ گیا۔

مولانا محمد ایوب صاحب کہ جن کا کراچی میں انتقال ہوا ہے، مولانا عبدالسلام نیازیؒ کے جگری دوست تھے۔ مولانا سے میں نے عبدالسلام صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں سُنی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مولانا نیازی سنسکرت خوب جانتے تھے اور جوانی کے زمانے میں بڑے بڑے پنڈتوں کو چت کر چکے تھے اور ۱۹۱۲ء میں ایک مشہور پنڈت رام چندر کو مولانا احمد سعید اور مولانا عبدالسلام نیازی ایک بڑے مجمع میں اور ایک عظیم الشان تاریخی مناظرے میں ہرا چکے تھے۔ مولانا نیازی کے کچھ رسائل ان کے شاگردوں کے پاس ہیں، جو چھپ نہ سکے۔

کہتے ہیں کہ خواجہ حسن نظامی صاحب کی فرمائش پر مولانا نے تصوف پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اور جب مولانا یہ کتاب خواجہ صاحب کے پاس لے کر آئے تو خواجہ صاحب نے کہا کہ مولانا اس کتاب پر آپ کا نام شائع نہیں ہوگا۔ یہ کتاب ہم شائع کریں گے۔ مولانا نے خواجہ صاحب کے ہاتھ سے کتاب لے کر اس کے پُرزے اڑا ڈالے۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ "مولانا یہ کیا غضب کیا؟" فرمایا۔ "کوئی بات نہیں۔ بس شیخ اسی بات پر چائے پلوا دو۔"

مولانا عرسوں میں شریک ہوتے۔ طوائفوں سے گانا بھی سنتے۔ علما کی محفلوں میں بیٹھتے تو علما بہت سنبھل کر بیٹھتے۔ اسی طرح وہ صوفیوں میں بیٹھتے۔ اگر کوئی صوفی بڑھ چڑھ کر کوئی بات کہتا تو مولانا کا ناریل چٹخ جاتا اور پھر مولانا وہ ملاحیاں سُناتے کہ دھرتی جائیں نہ اٹھائی۔

مولانا بڑے طباع اور حاضر جواب تھے۔ جملہ ایسا چست کرتے کہ سبحان اللہ۔ صابر صاحبؒ کے عرس میں شریک ہونے کے لیے مولانا ایک لاری میں سوار ہو گئے۔ اس میں ایک صوفی صاحب بھی تھے۔ گیروا رنگ کے کپڑے، بڑی بڑی زلفیں۔ ایک چھپل چھبیلی، کم سن، خوب رُو طوائف لاری میں داخل ہوئی تو صوفی صاحب نے چلّا کر کہا: "جلّ جلالہٗ" اس کے پیچھے اس کی نائکہ تھی۔ بدہیئت، عمر رسیدہ، موٹی۔ مولانا نے فوراً صوفی صاحب سے کہا۔ "حضرت سنبھالیے۔ جل جلالہ کے پیچھے عم نوالہ بھی تشریف لا رہی ہیں۔"

برصغیر کے شاعروں میں وہ صرف علامہ اقبال کو مانتے تھے اور علامہ کے فارسی کے بہت سے اشعار انھیں یاد تھے اور ان کے حافظے کا یہ حال تھا کہ آپ کوئی نظم انھیں سُنا دیجیے اور اسی وقت یہ نظم ان سے حرف بہ حرف سن لیجیے:

وے صورتیں الٰہی کِس دیس میں بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ذوقی شاہ صاحبؒ

چور اچکے، عالم، جاہل، زاہدِ شب زندہ دار، رندِ خراباتِ صُوفی و مُلاّ، ان میں سے بہت سے عجیب و غریب شخصیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ انسانی معاشرے میں جو تنوّع ہے تو وہ انہی کے دم قدم سے ہے۔ مَیں نے ایسے صُوفی اور عُلما بھی دیکھے جو بڑے دِل کش لگانے نکلے اور ایسے غنڈے اور لفنگے بھی دیکھے کہ جن کے قدموں پر شریفوں کی شرافت اور علم کے خزانے نثار۔

آیئے ___ ایک ایسے درویش سے ملیے جو اعلےٰ پائے کا صحافی، ادیب، صُوفی، سیاسی لیڈر، علومِ معقول و منقول کے سمندر کا شناور، علم الکلام میں منتہی۔ زاہدِ شب زندہ دار اور تصوّف کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکا تھا۔ رَوشن دماغ و رَوشن ضمیر۔ نام ان کا سیّد محمد تھا اور یہ ذوقی شاہ صاحب کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔

مَیں نے شاہ صاحب کو بارہا خواجہ صاحب کی درگاہ سے نکل کر درگاہ بازار سے گزرتے دیکھا۔ آپ کی شخصیت میں کچھ ایسی محبوبیت تھی کہ دِل آپ کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ دو جوان العمر گورے چٹّے، طویل القامت فرنگی فوجی لباس میں ملبوس بالعموم شاہ صاحب کے ساتھ ہُوا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں یہ کلین شیو تھے اور پھر مَیں نے ان کے چہرے پر خشخشی داڑھی دیکھی۔

شہر میں شاہ صاحب کی بڑی عزّت تھی۔ ویسے یہ رہنے والے وسطِ ہند کے تھے۔ لیکن کچھ عرصے کے لیے اجمیر میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اجمیر آس پاس کے صُوفیوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

شاہ صاحب درمیانے قد کے تھے۔ چوڑا چکلا سینہ۔ دُہرا جسم۔ چہرے پر بھرواں داڑھی، سرگھٹا ہُوا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ اُجلے ورق ایسے سپید کپڑے۔ پاؤں میں سلیم شاہی جُوتی۔ چال میں بڑا طنطنہ، چہرے پر رُعب داب۔ کشادہ پیشانی۔ یہ دو فرنگی صاحبان جو شاہ صاحب کے ساتھ رہا کرتے تھے، ان کے بارے میں یہ سُنا تھا کہ بہاول پور کی فوج میں بڑے عہدوں پر فائز

ہیں اور دونوں حقیقی بھائی ہیں اور یہ لندن ہی ہیں دوکنگ مسجد میں اسلام قبول کر چکے تھے ۔

اسلام کیوں قبول کیا:

ان دونوں بھائیوں میں بڑے بھائی کا نام شاہ فاروق احمد اور چھوٹے کا شاہ شہید اللہ ہے جن سے حضرت ذوقی شاہ صاحب کی چھوٹی صاحب زادی راشدہ بیگم منسوب ہیں ۔ اور آج کل شاہ شہید اللہ صاحب ذوقی صاحبؒ کے خلیفہ اور جانشین ہیں ۔شہید اللہ صاحب نے مجھے بتایا کہ ہم دونوں بھائیوں کو انگلستان میں ایک ایسے مذہب کی تلاش تھی جو زندگی گزارنے کا طریقہ بتائے ، جو حلال وحرام کی تمیز سکھائے جس میں پاکیزہ زندگی گزارنے کے طریقے اور اصُول ہوں ۔

جب ہم دونوں بھائیوں نے اِسلام کا مطالعہ کیا تو ہمیں جس چیز کی تلاش تھی وہ ہمیں اِسلام میں مِل گئی اور ہم نے اسلام قبول کرلیا ۔ اور تصوّف سے ہمیں لگاؤ یوں پیدا ہوُا کہ خوش قسمتی سے حضرت داتا گنج بخش رح کی معرکہ آرا تصنیف کشف المحجُوب کا انگریزی ترجمہ ہمارے ہاتھ آگیا ۔جب ہم نے بنظرِ غائر اس کا مطالعہ کیا تو ہماری سمجھ میں یہ بات آئی کہ اگر کوئی پیرِ کامل مِل جائے تو ہم تصوّف کو ، جو اِسلام کی رُوح ہے ، سمجھ سکیں گے ، چناں چہ ہم پیرِ کامل کی تلاش میں ہندوستان آئے ، ہمیں ایسے مُرشد کی ضرورت تھی جو انگریزی زبان پر قدرت رکھتا ہو ۔

چناں چہ ایک کرم فرما خطیب صاحب ہمیں دکن لائے اور یہاں حضرت شاہ صاحب سے نیاز حاصل ہوا ۔ ہم نے ان کی خدمت میں اپنے ذوق وشوق کا اظہار کیا اور پھر ہم نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور یوں ہماری دلی آرزو پوری ہوئی اور حضرت کے طفیل گوہر مُراد ہمارے ہاتھ آیا ۔

کہا جاتا ہے ، واللہ عالم کہاں تک صحیح ہے کہ حضرت مولانا ذوقی شاہ صاحب عنفوانِ شباب میں ایک ناظورۂ جمال پر بے طرح فریفتہ تھے ۔خواجہ صاحب کی درگاہ میں ایک درویش سے اُن کی مُلاقات ہوئی ۔شاہ صاحب نے اس درویش سے دُعا کے لیے کہا ۔ اور درویش نے کہا ۔ "بابا ۔ اتنی بڑی درگاہ میں اتنی چھوٹی آرزو لے کر آیا ہے ۔یہاں تو حسنِ ازل ملتا ہے جسے نہ زوال ہے نہ فنا ۔" کہتے ہیں کہ اس درویش کی باتوں کا حضرت پر ایسا اثر ہوُا کہ دُنیا سے دِل پھر گیا اور چوں کہ وہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی سولھویں پشت میں تھے لہٰذا ان کا تعلق براہِ راست خواجہ صاحب سے قائم ہوگیا ۔ اور خواجہ صاحب نے شاہ صاحب کو ان کے مُرشد کی شبیہہ بتائی اور پھر آپ مُرشد کی تلاش میں نکلے اور دوست احباب سے پتا پُوچھتے لکھنؤ گئے ۔ اور وہاں آپ ٹیلہ پیر محمد شاہ پہنچے ۔آپ نے اپنے مرشد حضرت مولانا وارث حسن شاہ صاحبؒ کی زیارت کی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی ، اور پھر بتدریج تمام مرحلے اور مقامات طے کرتے رہے ۔شاہ صاحب فرماتے تھے کہ انھیں خواجہ صاحبؒ اور حضرت مولینا رشید احمد گنگوہی رح سے خلافت ملی ہے ۔جب یہ بات

انھوں نے اپنے مرشد کو بتائی تو ان کے مرشد نے بھی ان کو خلافت عطا کی ۔

میں نے پہلے یہ بتایا ہے کہ شاہ صاحب ادیب بھی تھے اور صحافی بھی اور سیاست داں بھی تھے۔ حضرت مولانا نے مسلم لیگ کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ۔ قائدِ اعظم سے اُن کے بڑے گہرے مراسم تھے ۔ قائدِ اعظم اکثر شاہ صاحب سے ملاقات کیا کرتے تھے ۔ آپ کی قائدِ اعظم سے خط و کتابت بھی رہی ہے ۔ اور میں نے یہ دیکھا کہ آپ قائدِ اعظم کو ، جب بھی کوئی سیاسی مسئلہ کھڑا ہوتا ، تار بھجواتے اور مشورہ دیتے ۔ جب بہار کے مسلمانوں پر مظالم توڑے گئے تو حضرت نے قائدِ اعظم کو بے شمار تار بھجوائے ۔ اور جب بنگال میں فضل الحق مرحوم اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے قائدِ اعظم کو پریشان کیا تو تو شاہ صاحبؒ نے قائدِ اعظم کو اس مضمون کا تار بھیجا :

"Smash mischievious and forgive fools."

صحافت

ایک مرتبہ دورانِ گفتگو میں نے شاہ صاحب کو یہ بتایا کہ میں اخبار نویس ہوں اور میرا یہ مشغلہ بھی ہے ۔ فرمایا ، صحافت ایسی چیز ہے جو اگر ایک مرتبہ لگ جائے تو پھر دم کے ساتھ رہتی ہے اور فرمایا کہ وہ بھی اخبار نویس رہ چکے ہیں اور انھوں نے مدتوں اردو اور انگریزی روز ناموں کی ادارت کی ہے ، اور ان میں کام بھی کیا ہے اور اُن کی مضمون نگاری کا سلسلہ اب بھی جاری ہے ۔ چناں چہ شاہ صاحب وطن ، پیسہ اخبار ، انتخاب لاجواب ، اور بچّوں کا اخبار میں کام کر چکے ہیں ۔ ۱۹۰۴ء میں وہ حیدر آباد سندھ میں ایک انگریزی روز نامے " الحق " کے ایڈیٹر تھے ۔ یہ روز نامہ مسلمانوں کے حقوق کا ترجمان تھا ۔ شاہ صاحب کے اداریوں نے تہلکہ مچا دیا تھا ۔ یہ اخبار لارڈ کرزن کے مطالعہ میں رہتا تھا ۔ سندھ کے مسلمان آپ پر بہت اعتماد کرتے تھے ۔ کچھ عرصے کے بعد آپ نے " الحق " حیدر آباد سے کراچی منتقل کر لیا ۔ جب جارج پنجم پرنس آف ویلز کی حیثیت سے ہندوستان کے دورے پر آئے تو لارڈ کرزن نے مسلم پریس کی نمائندگی کے لیے شاہ صاحب کو منتخب کیا ۔ چناں چہ شاہ صاحب ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک پرنس آف ویلز کے ہمراہ رہے ۔ اس عرصے میں آپ کی اور پرنس آف ویلز کی مختلف سیاسی مسائل پر بات چیت بھی ہوئی ۔

الوکیل کی ادارت اور ٹائمز آف انڈیا میں تربیت

روز نامہ " الوکیل " کی انتظامیہ اس اخبار کو انگریزی زبان کا ایک روز نامہ بنانا چاہتی تھی ۔ الوکیل کی انتظامیہ نے شاہ صاحب کو اپنے خرچ پر ٹائمز آف انڈیا میں بھجوایا تاکہ وہاں " ٹائمز آف انڈیا " ایسا روز نامہ نکالنے کی تربیت حاصل کریں ۔ اس زمانے میں روز نامہ ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر اسٹنلے ریڈ تھا ۔ شاہ صاحب نے یہاں کام بھی سیکھا اور ٹائمز آف انڈیا میں ان کے مضامین بھی

شائع ہوتی ہے۔ شاہ صاحب کے مضامین "پانیر" میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ اور کچھ عرصہ ان کے مضامین روزنامہ "ڈان" میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ کراچی سے ایک اخبار "دی پیپلز وائس" شائع ہوا کرتا تھا۔ اس میں بھی شاہ صاحب کے مضامین برابر شائع ہوتے رہتے تھے۔

شاہ صاحب کی تصانیف

شاہ صاحب کے مضامین کو یکجا کر لیا گیا ہے۔ اس مجموعۂ مضامین کا نام "مضامین ذوقی" ہے تصوف و روحانیت پر شاہ صاحب کی ایک معرکۃ آلآرا کتاب "سرِّ دلبراں" شائع ہو چکی ہے جس میں تصوف کی تمام اصطلاحات کی دل نشین انداز میں وضاحت کی گئی ہے۔ "ترجمان القرآن" میں شاہ صاحب کے فکر انگیز مضامین کا ایک سلسلہ شائع ہوا کرتا تھا جس کا عنوان "کتبِ سماوی پر ایک نظر" ہے۔ ان مضامین میں شاہ صاحب نے دینِ عیسیٰ اور یہودیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ شاہ صاحب وید اور شاستروں پر مضمون لکھ رہے تھے۔ یہ مضمون نامکمل رہ گیا۔ شاہ صاحب کا آخری مضمون اسلام پر ہوتا لیکن زندگی نے ساتھ نہیں دیا۔ اس سلسلے میں جو مضامین شاہ صاحب لکھ چکے تھے ان کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا مطالعہ بڑا وسیع اور ان کی نظر گہرائیوں تک پہنچنے والی تھی۔

ظرافت

شاہ صاحب مولانا محمد علی مرحوم کے ہم جماعت تھے۔ اور ان کے ساتھ شروع میں خلافت کی تحریک میں حصہ لیتے رہے۔ خلافت کی تحریک کے زمانے میں آپ کی مولانا محمد علی جوہر سے پشاور میں ملاقات ہوئی۔ شاہ صاحب عبا پہنے ہوئے تھے۔ مولانا نے ازراہِ شوخی پوچھا "میاں ذوقی شاہ! یہ عبا تو بہت اچھی ہے، کہاں سے ملی تھی؟" مولانا یہ سمجھے کہ شاہ صاحب یہ کہیں گے کہ کسی مرید نے نذر کی ہے۔ شاہ صاحب نے کہا۔ "بھائی محمد علی۔ یہ تو ہمیں چندے میں ملی ہے۔"

ایک مرتبہ بمبئی میں سیٹھ صاحبان بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا نے فرمایا "اگر اللہ میاں سیر کرتے ہوئے مکلیں اور سیٹھوں کو اس کا پتا چل جائے تو وہ اللہ میاں سے سب سے پہلے یہ پوچھیں گے کہ آپ کا بیوپار کا ہے کا ہے۔ اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہوگا کہ آپ کی پیڑھی کہاں ہے۔ اگر ان دونوں سوالوں کا جواب خاطر خواہ مل گیا تو ایک سنگل کوک چائے اور پتی پان سے خاطر کر دی جائے گی۔"

فرمایا۔ "انگریز کہتا ہے۔ آنیسٹی اِز دی بیسٹ پالیسی۔ یہ آنیسٹی کو بھی پالیسی کے طور پر اختیار کرتا ہے۔" ایک صاحب سے پوچھا "ڈپلومیٹک تقریر کے معنی سمجھتے ہو؟" فرمایا۔ "یہ ایسی تقریر ہوتی ہے جس میں اچھے اچھے الفاظ ہوں۔ پھر فقرے چست ہوں۔ کوئی کیسی بات پر خفا نہ ہو۔ تقریر بڑی آن بان کی ہو مگر اس کے معنے کچھ نہ ہوں۔"

شاہ صاحبؒ اور مسلم لیگ

شاہ صاحب نے پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ کی اصلاح کرنے کی بہت کوشش کی۔ فرمایا۔ قیام پاکستان سے پہلے مسلم لیگ بہت مضبوط جماعت تھی۔ اسے عوام کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد یعنی ملک کے تقسیم ہو جانے کے بعد لیگ بھی تقسیم ہو گئی۔ کچھ لوگ عہدوں کے حصول کے لیے دوڑ رہے ہیں اور تھوڑے سے ملک کی بھلائی کی فکر میں ہیں جس جذبے سے لیگ نے پاکستان بنایا تھا اگر وہی جذبہ پاکستان بننے کے بعد لیگ میں قائم نہیں ہوگا تو لیگ کا تو خیر جو ہوگا، سو ہوگا، ملک سخت خطرے میں پڑ جائے گا۔

شاہ صاحب کے خیال میں ہندوستان اور پاکستان کے لیے علیحدہ علیحدہ لیگیں قائم کرنا غلط اقدام تھا جس طرح مسلم اکثریت کے علاقوں میں لیگ نے پاکستان بنا لیا تھا، ایسے ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی حفاظت کرنا بھی لیگ کا فرض تھا۔ متحدہ مسلم لیگ کا ہیڈ کوارٹر پاکستان میں ہوتا اور یہاں سے بھارت کے مسلمانوں کا تحفظ کیا جاتا۔

گروپنگ سسٹم کے بارے میں شاہ صاحب کا یہ خیال تھا کہ اگر ہندو گروپنگ سے منحرف نہ بھی ہوتے تو یہ چلنے والی چیز نہیں تھی۔ ہندوؤں کی ملک میں مجموعی اکثریت اقلیتوں کو دبا لیتی۔ اور گروپس میں مستحکم مرکزیت نہ ہونے کی وجہ سے انفرادی طور پر تحریص و ترغیب سے گروپس کو توڑا جا سکتا تھا۔ اس سے البتہ یہ فائدہ ضرور ہوتا کہ برصغیر کے مسلمانوں کا بڑے پیمانے پر کشت و خون نہ ہوتا لیکن برصغیر کے مسلمان تو ایک مثالی اسلامی مملکت بنانے چلے تھے۔ اس کے لیے ایک علیحدہ سرزمین کی ضرورت تھی۔ دراصل پاکستان کے قیام کا مقصد وحید یہ تھا کہ دنیا کے دوسرے اسلامی ملکوں کے لیے ایک نمونے کی اسلامی مملکت بنائی جائے۔ افسوس کہ ہم حصول پاکستان ہی کو اپنی منزل سمجھ بیٹھے۔

گرونانک کے بارے میں فرماتے تھے کہ تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ گورو صاحب بابا فرید گنج کی اولاد میں سے تھے۔ ایک صاحب کے مرید ہوئے اور پھر مجذوب ہو گئے۔ ہندو انھیں گھیرے رہتے تھے۔ ان سے کشف و کرامات کا ظہور ہوتا۔ ایک جدا مذہب بنا دیا گیا۔ بابا صاحب کی کتاب گرنتھ صاحب کا پہلا شعر دیکھو جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور حضورؐ کی ثنا ہے۔ وہ موحد تھے غلبۂ استغراق کی وجہ سے بال نہیں کٹواتے تھے۔ ان کی داڑھی دیکھو، سکھوں کی طرح کی نہیں ہے۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ حضرت شاہ سلیمان صاحب پھلواروی رحؒ کے خاندان میں ایک درود تھا جس کے پڑھنے سے حضورؐ کی زیارت ہو جاتی ہے۔ ایک مرتبہ شاہ صاحب پر سخت انقباض طاری ہوا۔ درود شریف کا ورد شروع کیا لیکن کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج

مراد آبادی رح کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ فرمایا درُود پڑھیے ۔جب درُود پڑھ چکے تو کہا کہ اس کے معنی کیجیے ۔جب معنی کر چکے تو کہا بھائی یہ معنی نہیں ہیں عشق کی زبان میں معنی کیجیے اور پھر فرمایا عشق کی زبان میں اس درُود کے معنی یہ ہوتے ہیں ۔

پیار کرے اللہ پیارے محمدؐ کو اور ان کی پیاری آل کو ۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جیسے ہی میری زبان سے یہ معنی نکلے ، میری کیفیت بدل گئی ۔

حضرت مولانا کی شخصیت بڑی من موہنی شخصیت تھی ۔جو بھی ان کے قریب آتا ، ان کے رنگ میں رنگ جاتا ۔ اُن کی باتیں دل موہ لینے والی ہوتی تھیں ۔ بے شمار مذاہب کے لوگ ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ۔ شاہ صاحب نے تصوّف کا بھرم قائم رکھا ۔ اور جو ورثہ اپنے بزرگوں سے پایا تھا اس کی حفاظت کی اور اسے پھیلایا بھی —— جس میں جتنا ظرف ہوتا وہ اس کے مطابق حاصل کر لیتا ہے ۔

رام گوپال ہندوستان کا مشہور رقّاص تھا ۔ اس کے گروپ میں ایک چھیل چھبیلا لڑکا موہن تھا موہن ساڑھی باندھ کر ناچتا تو بڑی بڑی ناچنے والیاں پانی بھرتیں ۔ ایک مرتبہ مَیں نے یہ دیکھا کہ موہن غریب نواز رح کی درگاہ کی جالی پکڑ کر رو رہا ہے ۔جب وہ جانے لگا تو مَیں نے اُس سے پوچھا موہن تمھیں کیا ہو گیا ہے ؟ کہنے لگا ۔ ذوقی شاہ صاحب نے مجھے ایسا نچایا ہے کہ کیا بتاؤں ۔ اب کسی کام میں دل نہیں لگتا ۔میں مسلمان ہو گیا ہوں ۔ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکا ہوں ۔ مَیں نے خواجہ صاحب کی زیارت کی ہے ۔اور پھر وہ رونے لگا ۔ میں نے سوچا کہ ہماری آنکھیں پھوٹ گئی ہیں ۔ہم مسلمانوں میں پیدا ہوئے ۔ درگاہ میں آتے ہیں تو آنکھوں پر حرص کی پٹّی باندھ کر ۔ ایک ہم ہیں کہ ہمیں کچھ نہیں آتا ۔ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ذوقی شاہ صاحب کے پاس بیٹھ کر سیاست کے علاوہ کچھ دین کی باتیں کریں ۔

آپ پاکستان تشریف لے آئے تھے ۔ اگرچہ قائدِ اعظم اور سر ہدایت اللہ سے بڑے قریبی تعلقات تھے لیکن شاہ صاحب نے حکومت سے اپنے لیے مکان تک نہیں لیا ۔ ۱۹۵۱ء میں میدانِ عرفات میں طبیعت بگڑی اور اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔ وہیں مدفون ہوئے ۔

آپ کے ساتھ آپ کے خلیفہ اور داماد حضرت شاہ شہید اللہ صاحب ، جو آپ کی دولتِ ایمان کے صحیح طور پر وارث ہیں اور آپ کے کردار کا نمونہ ہیں ، موجود تھے ۔ اور آپ کی صاحبزادی بھی موجود تھیں ۔ ایسی موت ان حالات میں ایسے ہی بزرگوں کو آیا کرتی ہے ۔ ایسی خوبیوں کے بزرگ کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں ۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

بابائے اُردو کو سب سے پہلے میں نے میاں بشیر احمد مرحوم (مدیر ہمایوں) کے درِ دولت پر دیکھا تھا۔ شام کو میاں صاحب نے لاہور کے ادیبوں کو چائے کی دعوت پر بلوایا تھا۔ میں مولانا ظفر علی خان مرحوم کے ہمرکاب تھا۔ یہ دونوں دوست ایسے ملے کہ جیسے مدتوں کے بچھڑے ہوئے تھے۔ جب یہ دونوں مجمع سے علیحدہ ہوئے تو تنہائی میں دونوں تُو تکار پر اُتر آئے۔ پھر یہ بھی دیکھا کہ دونوں سرگوشیاں کر رہے ہیں اور قہقہے لگا رہے ہیں۔ دونوں مدتوں علی گڑھ میں ساتھ رہے ہے۔ اور جب مولوی صاحب دکن آئے تو کچھ دنوں کے بعد مولانا ظفر علی خان بھی یہاں آ گئے۔ مولانا ظفر علی خان صاحب نے جتنا علمی و ادبی کام کیا ہے وہ دکن میں رہ کر کیا ہے اور اس کا سہرا مولوی عبدالحق مرحوم کے سر ہے۔ مولانا ظفر علی خان جم کے کام کرنے والوں میں نہیں تھے۔ مولوی صاحب کا جگر گردہ دیکھیے کہ انھوں نے مولانا کی نگارشات سے اُردو ادب میں گراں بہا اضافہ کیا۔ مولوی صاحب علامہ شبلی مرحوم کے مخالف گروپ میں تھے اور مولانا ظفر علی خان شبلی کے شاگرد تو تھے ہی، شبلی کے حلقۂ اثر میں بھی اہمیت رکھتے تھے۔

بابائے اُردو نے اُردو زبان کی ایسی خدمت کی ہے جس کی مثال کسی دوسری زبان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ ادیب ہی نہیں تھے ادیب گر بھی تھے۔ جوہر شناس تھے جس کسی میں صلاحیت دیکھتے، اسے خوب پرکھتے اور وہ جس کام کے لیے موزوں ہوتا وہ اس سے وہی کام لیتے۔ مولوی صاحب نے لسانیات، تحقیق و تنقید، تاریخ، زبان، اُردو لغت سازی اور ترجمے میں ایک دو نہیں، درجنوں شخصیتیں بنائیں۔ مولوی صاحب کے سامنے ہمیشہ اُردو زبان کی تعمیر اور فروغ کا ایک جامع منصوبہ رہا ہے اور وہ ایک ٹیم بنا کر اس منصوبے کو عملی جامہ پہناتے رہے۔

مولوی صاحب بڑے زندہ دل انسان تھے۔ ان کو کام کرتے دیکھ کر یوں لگتا کہ ان کے اندر جو عبدالحق ہے وہ ابھی جوان ہے، اور وہ اپنے کام کی دُھن اور اپنے مقصد کے حصول کی لگن میں ہمیشہ جوان رہے۔ مولوی صاحب نے بڑی سختیاں جھیلی ہیں مگر وہ ہمیشہ اپنے اصولوں اور اپنے مقصد پر ڈٹے رہے۔ اگر کوئی ان کے کام میں اڑنگا لگاتا تو وہ مصالحت پر آمادہ نہ ہوتے۔ ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرتے۔ وہ ہر مشکل کو اپنے لیے ایک

چیلنج سمجھتے تھے۔ ان کا مقصدِ حیات اُردو ۔ ان کی زندگی اُردو ۔ ان کا اوڑھنا بچھونا اُردو ۔ ان کی عمر بھر کی کمائی اُردو ۔ ان کا دین و ایمان اُردو ۔

مولوی صاحب ماہرِ تعلیم بھی تھے ۔ وہ میرے ساتھ ایک دن ایک مدرسے میں تشریف لائے ۔ ایک ماسٹر صاحب بچّوں کو ہجّے سکھا رہے تھے ۔ مولوی صاحب بگڑ گئے اور فرمایا ۔ ان مولویوں اور ماسٹروں نے اُردو زبان کا قیمہ پیسنے کا کیا اچھا طریقہ نکالا ہے ۔ اب ان نیک بختوں کو کون بتائے کہ الفاظ کے ٹکڑے نہیں ہوتے ۔ بچّہ لفظ سیکھتا ہے ۔ جب وہ بول چال میں ہجّوں سے کام نہیں لیتا تو پھر پڑھنے میں اس سے ہجّوں سے لفظ کیوں بنوائے جاتے ہیں ۔ استاد صاحبان نے اپنی طرف سے بچّوں کی آسانی کے لیے یہ طریقہ نکالا ہے ۔ حالانکہ بچے اس طریقے سے پریشان ہوجاتے ہیں مثلاً بادشاہ بس بادشاہ ہے ۔ یہ ایک لفظی تصویر ہے یہی تصویر بچے کو دکھاؤ ۔ مگر جب تم یہ کہو گے ، بے الف زبر با ذال ساکن ، باد ، شین الف زبر شا ، ہ موقوف ، بادشاہ ۔ تو بچہ یہ سوچے گا کہ یہ بادشاہ کیا ہُوا ۔ بادشاہ کی فوج پلٹن ہوگئی ۔

مولوی صاحب کلاسیکی موسیقی بڑے ذوق شوق سے سُنتے تھے ۔ وہ ریڈیو پاکستان سے اس لیے خفا تھے کہ اس نے کلاسیکی موسیقی کا کباڑا کر دیا تھا ۔ مولوی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ برِّصغیر کی کلاسیکی موسیقی میں مُسلمانوں کا بڑا حصّہ ہے اور آج پاکستان کے افسرِ اعلیٰ اور حکومت اس سے پیچھا چھڑا رہی ہے ۔ میں مولوی صاحب کے ہاں کبھی کبھی امراؤ بندو خان کو اپنے ساتھ لے جاتا تو مولوی صاحب ٹھمری اور دادرا بڑے شوق سے سُنتے اور بہت خوش ہوتے ۔ اگر شہر میں کوئی اچھی فلم آتی تو مولوی صاحب ابوالخیر کشفی صاحب کو ، جو ان دِنوں ایس ایم کالج میں پڑھا کرتے تھے ، بُلوا لیا کرتے تھے ، اور ان کے ساتھ یہ فلم دیکھتے ۔ یوُں بھی ہُوا کہ مولوی صاحب نے کبھی سڑک کے کنارے گاڑی روک لی اور گنّے کا رس منگوا کر خود بھی پیا اور ہمیں بھی پلایا ۔

مولوی صاحب اسکول اور کالج کے لڑکوں کی طرح بڑی بھولی اور معصوم شرارتیں بھی کیا کرتے تھے مثلاً ایک مرتبہ آپ نے سر اکبر حیدری مرحوم کے گھر کے ایک ملازم لڑکے کو پیسے دیے اور اس سے کہا کہ وہ لوٹے کی ٹونٹی میں بیر کی گٹھلیاں پھنسا آئے ۔ اور اب جو اکبر حیدری بیت الخلا گئے اور انھوں نے لوٹے ٹونٹی سے پانی نکالا تو وہ نہیں نکلا ۔ انھوں نے شور مچایا کہ چھوٹی بیگم یہ لوٹے کو کیا ہو گیا ہے ۔ کوئی دُوسرا لوٹا بھیجو ۔ اور اُدھر مولوی صاحب اور ان کے ساتھی ہیں کہ ہنسی کے مارے لوٹن کبوتر بنے ہوئے ہیں ۔ ہماری ایک عزیز بہن ہیں منیر بانو ۔ نواب منظور جنگ کی صاحب زادی ۔ نواب منظور جنگ مولوی صاحب کے شاگرد بھی تھے اور دوست بھی ، اور وہ بڑے ہنسنے ہنسانے والے آدمی تھے ۔ نواب منظور جنگ بہادر کا دکن میں انتقال ہوگیا اور ان کی صاحب زادی اور داماد اور بچے کراچی اُٹھ آئے ۔ مولوی صاحب جب تک زندہ رہے ، منیر پاشا (نواب صاحب کی صاحب زادی) کے گھر برابر آتے جاتے رہتے تھے ۔ اور انھیں اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ جب میرا آخری وقت ہوگا تو منیر بانو میرے مُنھ میں پانی چوائے گی ۔ منیر بانو کو حسرت ہی رہ گئی

اور وہ آخری وقت مولوی صاحب کا دیدار بھی نہ کر پائیں۔ کیوں کہ مولوی صاحب کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں تھے۔ لہٰذا وہاں کسی کو مولوی صاحب سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ مولوی حکیم اسرار احمد کریوی آخری دم تک مولوی صاحب کے ساتھ رہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ حکیم صاحب نے رفاقت کا حق ادا کیا۔ ممکن ہے کہ ایوب خان مرحوم کی بخشش کا ایک سبب یہ بھی ہو جائے کہ جب کچھ لوگوں نے آخری عمر میں مولوی صاحب کا سہارا اُن سے چھین لیا تھا اور انھیں گڑھے میں پھینک دیا تھا تو ایوب خان نے بڑھ کر مولوی صاحب کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بیمار ہوئے تو ان کا علاج کروایا۔ اور ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کے وہ مستحق تھے۔ جب مولوی صاحب کے کتب خانے میں قفل ڈال دیا گیا اور انھیں عضوِ معطل بنا دیا گیا، یعنی اُن کے مکان کی بجلی منقطع کر دی گئی، ان کی گاڑی چھین لی گئی تو یہ زمانہ مولوی صاحب پر بڑا سخت گزرا۔ میں اکثر مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی انھیں مجبور کر کے سیر کے لیے لے جاتا۔ مولوی صاحب اپنی قوم کی بے حسی اور محسن کُشی کے بارے میں ایک انگریز کا قول دُہرایا کرتے تھے جس نے اس قوم کی بڑی خدمت کی تھی۔ اور وہ قول یہ ہے۔ "ٹو سَرو دِس نیشن اِز اے کرائم اینڈ آئی ہو کمیٹڈ دیٹ کرائم"۔۔۔۔ یعنی اس قوم کی خدمت کرنا جرم ہے، اور میں نے یہ جرم کیا ہے۔ مولوی صاحب نے انھی دِنوں سر سید احمد خان کے بارے میں یہ بتایا کہ اللہ تعالےٰ نے ان کی آبرو رکھ لی .... ورنہ ان کی زندگی کے آخری ایام میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ انھیں کالج سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔ مولوی صاحب جب ترنگ میں آتے تو اپنی طالب علمی کے زمانے کی باتیں بتاتے۔ مثلاً انھوں نے یہ بتایا کہ وہ اور جسٹس محمود سر سید کے کتب خانے میں کام کر رہے تھے قریب کے کمرے سے بڑی کرخت اور بے ہنگم آواز میں کوئی شخص یہ لوری گا رہا تھا۔ "آجا ری نِندیا تو آ کیوں نہ جا"۔ یہ سر سید احمد خان تھے جو اس مسعود کو سُلا رہے تھے۔ سید محمود اور مولوی صاحب کا قہقہہ نکل گیا۔ وہ کتب خانے سے نکل کر بھاگے تو ان کے پیچھے سر سید تھے جو اپنی تہ بند سنبھالتے ہوئے ان کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ اور یہ کہہ رہے تھے۔ ٹھہرو شیطانو!

مولوی صاحب نے بتایا کہ وہ اور خواجہ غلام الثقلین ایک حوض پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں سر سید ہوا خوری کے لیے اپنے تام جھام میں نکلے اور ہمارے قریب آ کر ان کا تام جھام رُک گیا۔ سر سید باہر نکلے اور خواجہ غلام الثقلین سے مُسکرا کر کہا:

"تم اس کے ساتھ رہو گے تو بے دین ہو جاؤ گے"

مولوی صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "بھلا آپ کے ہوتے ہوئے کس کا دین سلامت ہے؟"

مولوی صاحب نے کہا کہ غالب کے معتقد خاص میرن صاحب سے ان کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ جب میرن صاحب بمبئی میں تھے تو کسی نے غالب کا شعر غلط پڑھا تو میرن صاحب نے کہا۔ "یہ بھی کوئی مذہبی

فرمان ہے، جیسے چاہا پڑھ دیا۔ یہ غالب کا شعر ہے۔"

حیدر آباد میں ایک پارسی کی دکان کے قریب سے نواب منظور جنگ گزر رہے تھے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب وہ فقط منظور احمد خاں تھے۔ ان کے حلق میں بلغم پھنس گیا تو وہ کھنکھارنے لگے۔ پارسی دکان سے اُٹھا اور اُس نے منظور جنگ کو سخت سُست کہا اور یہ کہا کہ میری دکان کے سامنے آکر تمھارا کھنکھارنا بے سبب نہیں ہے۔ منظور جنگ نے یہ بات مولوی صاحب کو بتائی۔ اب کیا تھا مولوی صاحب بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر جن میں کچھ ثقہ بزرگ بھی شامل تھے، پارسی کی دکان کے قریب کھڑے ہو کر زور زور سے کئی منٹ تک کھنکھارتے رہے اور پھر یہ ہُوا کہ یہ ڈیوٹی روزانہ ادا کی جاتی۔ اور جب لوگوں کو یہ پتا چلا کہ پارسی کھنکھارنے سے چِڑتا ہے، تو جو شخص بھی پارسی کی دکان کے قریب سے گزرتا کھنکھار کر گزرتا۔

نواب منظور جنگ نے اپنے اکلوتے صاحب زادے بابر مرزا کے لیے ایک چھوٹا سا ہوائی جہاز خریدا جو ایک درخت سے ٹکرا کر خراب ہو گیا۔ پھر دُوسرا خرید کر دیا۔ صاحب زادے کا یہ اصرار تھا کہ نواب صاحب کسی دن اُن کے ساتھ ہوائی جہاز میں بیٹھیں۔ لیکن نواب منظور جنگ ڈرتے تھے۔ ایک دن بابر مرزا نے مولوی صاحب سے شکایت کی۔ مولوی صاحب نے کہا اگر منظور تمھارے ساتھ نہیں بیٹھتا ہے تو چلو میں بیٹھتا ہوں۔ اور مولوی صاحب نے ہوائی جہاز کی سیر کی۔

مولوی صاحب کو رُسوائی کا بہت شوق تھا۔ جب مولوی صاحب دکن میں تھے تو اُن کے حریفوں نے یہ اُڑا دی کہ وہ شراب پیتے ہیں۔ مولوی صاحب کے مکان کے قریب ہی ان کے ایک حریف رہا کرتے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دیں اور شراب کی طرح شربت پی پی کر جھومنے لگے۔

مولوی صاحب کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ دہریہ تھے، ان پر الزام ہے۔ وہ بڑے روشن خیال مسلمان تھے، اور تنگ نظر نہیں تھے۔ کبھی کبھی وہ بڑے ذوق و شوق سے نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب غیر مقلد تھے۔

حکیم اسرار احمد صاحب نے بتایا کہ ایک ہندو دوست سے مولوی صاحب نے کہا کہ یار تم اتنے پڑھے لکھے ہو اور ولایت پلٹ بھی ہو۔ اور میں نے یہ سُنا ہے کہ تم گائے کا پیشاب پیتے ہو۔ ہندو دوست نے کہا۔ مولوی صاحب، دُنیا کی کسی چیز میں اتنے وٹامن اور پروٹین نہیں جتنے گائے کے پیشاب میں ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا۔ اس سے زیادہ پروٹین اور وٹامن تو میرے پیشاب میں ہیں۔ اگر تم کہو تو میں روزانہ تمھیں بھجوا دیا کروں۔

جاورے میں ایک علاقہ ہے جس کا نام سنجیت ہے۔ یہاں کا تمباکو دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ صاحب زادہ سرفراز علی خاں سے مولوی صاحب کی یاد اللہ تھی۔ وہ کسی آتے جاتے کے ہاتھ مولوی صاحب کو

یہ تمباکو بھیجتے رہتے تھے ۔ جب مولوی صاحب کراچی آئے تو اس تمباکو سے محروم ہو گئے ۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے ذکر کیا اور فرمایا کہ کسی طرح یہ تمباکو جاورے سے منگوا کر دو ۔ میں نے دو مرتبہ تمباکو منگوایا ۔ میرے پڑوس میں ایک حکیم صاحب رہتے تھے ۔ ایک مرتبہ وہ لے گئے ۔ مولوی صاحب سے جب بھی ملاقات ہوتی تو یہ کہتے کہ تم حکیم کا پڑوس چھوڑ دو ۔ اور اُس سے کہہ دینا کہ اگر اُس نے میرا حق مارا تو وہ گل حکمت ہو جائے گا ۔

ایک دفعہ ایک صاحب نے مجھ سے ایم اے کا مقالہ لکھوایا ۔ جب ان کا انٹرویو ہُوا تو مولوی صاحب نے پہلا سوال ان سے یہ کیا کہ کیا تم نصر اللہ خاں کے پڑوس میں رہتے ہو ۔ اور جب مولوی صاحب سے میری ملاقات ہُوئی تو مجھ سے کچھ نہیں کہا ۔ دُوسرے لوگوں سے کہا کہ بھائی پڑوسی کا بڑا حق ہوتا ہے ۔ لوگ اپنا وقت ضائع کر کے پڑوسی کے لیے مقالہ لکھتے ہیں ۔

میں نے ڈاکٹریٹ کرنے کا ارادہ کیا ۔ یونیورسٹی میں فارم داخل کر دیا ۔ اُستاد کے نام کے آگے مولوی صاحب کے دستخط کروائے ۔ مولوی صاحب اس زمانے میں کوئٹے میں تھے ۔ انھوں نے وہاں سے دستخط کر کے ڈاک سے میرا فارم مجھے بھجوا دیا ۔ اور یہ لکھا کہ خدا کرے جو کام تم کرنا چاہتے ہو کر لو ۔ ورنہ مجھے تم سے ایسی اُمید نہیں ہے ۔ تمھارے فارم پر دستخط کر کے مجھے خوشی ہُوئی ۔ میرا ذاتی کتب خانہ تمھارے لیے کھلا ہے اور میں جو کچھ رہبری اس سلسلے میں کر سکوں گا اس سے مجھے خوشی ہو گی ۔ لیکن میں نے جب یہ فارم یونیورسٹی میں داخل کیا تو اس پر یہ اعتراض ہُوا کہ مولوی صاحب اعزازی ڈاکٹر ہیں ۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے ۔ میں نے یہ بات مولوی صاحب کو نہیں بتائی ورنہ مولوی صاحب اور یونیورسٹی میں جھائیں جھائیں ہو جاتی ۔

مولوی صاحب نفاست پسند تھے ۔ اُجلے دَرق ایسے کپڑے پہنتے ۔ بہت کم کھاتے لیکن اچھی غذا کھاتے ۔ کھچڑے سے سخت نفرت تھی ۔ کھچڑی اور فرنی بھی ناپسند تھی ۔ مرغن غذا سے بھی پرہیز کرتے تھے ۔ گوشت شوق سے کھاتے لیکن کھانے پینے میں اعتدال سے کام لیتے ۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ انسان نے کھانے کی عادت ڈال لی ہے ورنہ یہ کوئی ایسی ضروری چیز نہیں ہے ۔ شام کو چائے بڑے اہتمام سے پیتے ۔ بسکٹ اور خشک میوہ موجود ہوتا ۔ حُقّے کے رَسیا تھے ۔ ہر مرتبہ جب حُقّہ پیتے، اُسے تازہ کرواتے ۔ ایک مرتبہ مولوی صاحب ریڈیو پاکستان میں تقریر کرنے آئے تو میں نے چائے کا اہتمام کیا ۔ ایک بہت بڑے ادیب افسر بھی موجود تھے جو برسوں ولایت میں رہ چکے تھے ۔ انھوں نے چائے میں بسکٹ ڈال دیا ۔ مولوی صاحب بگڑ گئے اور فرمانے لگے ۔ عجیب آدمی ہو چائے پینے کے سلیقے سے ناواقف ہو تم نے چائے میں بسکٹ ملایا تو نہ چائے کا مزا رہا اور نہ بسکٹ کا ۔ اور ہمیں الگ تکلیف پہنچائی ۔ اب بھلا کون چائے پی سکتا ہے ؟

ایک صاحب کھانا کھانے کے بعد اپنی انگلیاں چاٹ رہے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیے۔ اسی طرح ایک بزرگ کھانے کے بعد اپنے ہاتھ اپنی داڑھی سے پونچھ رہے تھے تو مولانا نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر کہا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی ہاتھ پونچھ لوں۔ اگر مولوی صاحب کے کسی ساتھی یا عقیدت مند کے یہاں بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا تو وہ مذاق اڑاتے۔

جب مولوی صاحب ہسپتال میں داخل ہوئے تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک نرس دوا لے کر آئی۔ مولوی صاحب نے کہا۔

"آیئے مس روح افزا"

وہ کبھی ڈاکٹروں پر چوٹ کرتے، کبھی نرسوں سے مذاق کرتے۔ جب تک ان کے جسم میں آخری سانس رہی وہ ہنستے کھیلتے رہے اور بیماری اور موت کا بڑی مردانگی سے مقابلہ کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے ہار نہیں مانی۔ مرتے وقت بھی وہ موت کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے لیکن موت سے کس کو رستگاری ہے ـــــــ مولوی صاحب کی شخصیت میں ایک پوری زندہ و تابندہ صدی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

خواجہ حسن نظامیؒ

خواجہ حسن نظامی مرحوم بڑے مزے کے آدمی تھے۔ مرنجاں مرنجاں۔ زندگی کی ترازو کے دونوں پلڑے جن میں سے ایک میں دُنیا ہوتی ہے اور دُوسرے میں دین، خواجہ صاحب ان دونوں پلڑوں کو برابر رکھتے۔ نانی اَمّاں اور دادی امّاں کی طرح قصّے کہانیاں سُناتے۔ دِلّی کی بولی ٹھولی، صاف سُتھری، البیلی اور رسیلی زبان۔ گنگا جمنی زبان لکھتے بھی تھے اور بولتے بھی تھے۔ اس میں شک نہیں کہ خواجہ صاحب اپنے طرز میں یکتا تھے، صاحبِ طرز تھے۔ خواجہ صاحب کی من موہنی شخصیت ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ لیکن اُن کی من موہنی اور رسیلی زبان اور دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچنے والی تحریریں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

سر پر کلاہ نما ٹوپی، آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک، ہونٹوں پر پان کی دھڑی، کتروں لبیں، بھری داڑھی، جسم پر جُبّہ، شانوں پر زُلفیں، آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور کشش، آواز میں کھنک، باتوں اور اداؤں میں ڈرامائیت۔

ان کی باتوں کا آپ پر اثر ہو یا نہ ہو لیکن ان کی شخصیت میں وہ جو ایک ڈرامائیت تھی، اس سے آپ ضرور متاثر ہو کر رہیں گے۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر اٹھنے کو جی نہ چاہتا۔ بہت سے لوگ انھی کے ہو کے رہ گئے۔ ان کی محفل ایک درویش اور صُوفی کی محفل بھی تھی، اور یہ ایک بادشاہ کا دربار بھی تھا۔ اُس میں خانقاہیت کا جمال بھی تھا اور اس میں سکندرانہ جلال بھی تھا۔ یہاں سرکشن پرشاد بھی کھنچے آتے۔ نظام دکن بھی مُلاقات کی خواہش رکھتے اور یہاں ہما شما کی بھی گنجائش تھی۔ خواجہ صاحب کے بے شمار دشمن بھی تھے، اور اَن گنت دوست اور جان نثار بھی۔ خواجہ صاحب کی شخصیت تضادات کا مرکب تھی۔ کوئی یہ کہتا کہ خواجہ صاحب حکومت برطانیہ کے جاسوس ہیں اور کوئی یہ سُناتا کہ خواجہ صاحب ولیِ کامل ہیں۔

مُلّا واحدی صاحب اور بھتیجا احسان الحق مرحوم اور دُوسرے بہت سے حضرات خواجہ صاحب پر جان چھڑکتے لیکن بہت سے یہ کہتے کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ خواجہ صاحب کی زندگی ہی میں ان پر بہت لے دے ہوئی۔ ایک صاحب نے خواجہ صاحب کے بارے میں یہ لکھا:

"دِن بسیرے کے تھیٹر کے مالک، فاسفورس کے تیل، اُردو کے چائے فروش، خواجہ حسن نظامی۔"

خواجہ صاحب علامہ اقبال کا تذکرہ اپنی تحریروں میں جب بھی کرتے تو یہ لکھتے کہ شاعرِ پنجاب علامہ اقبال نے یہ کہا۔ ایک مرتبہ علامہ اقبال نے خواجہ صاحب کو لکھا کہ میرے گھٹنے میں درد ہے فاسفورس کے تیل کی ایک شیشی میرے نام وی پی پی کر دیجیے۔ خواجہ صاحب نے شیشی بھجوا دی۔ آٹھویں دِن علامہ نے لکھا کہ میرے گھٹنے کا درد فاسفورس کے تیل سے دُور ہوگیا۔ اس نے جادو کا اثر کیا۔ خواجہ صاحب نے 'منادی' میں علامہ اقبال کا یہ خط شائع کر دیا اور اس پر سُرخی جمائی:

"شاعرِ مشرق کو فاسفورس کے تیل سے فائدہ ہوا۔"

اس پر سالک صاحب نے اپنے کالم "افکار و حوادث" میں لکھا کہ خواجہ حسن نظامی صاحب کا فاسفورس کا تیل استعمال کرتے ہی شاعرِ پنجاب علامہ اقبال شاعرِ مشرق بن گئے۔

جب سنگھٹن اور شُدھی کی تحریکوں نے زور باندھا تو خواجہ صاحب نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ سوامی شردھانند سے مباہلہ ہوا۔ سوامی جی میدان چھوڑ گئے۔ خواجہ صاحب کے معتقدین میں مُلا واحدی صاحب کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ واحدی صاحب نے مجھے بتایا کہ شریعت میں ان کے استاد مولوی محمد ایوب تھے، اور طریقت میں اُن کے پیشوا خواجہ صاحب تھے۔

بھیّا احسان بھی خواجہ صاحب کے رفیق تھے۔ اور دیوان سنگھ مفتون سے بھی شروع شروع میں اُن کی گاڑھی چھنتی تھی۔ پھر دونوں میں ایسی اَن بن ہُوئی کہ دونوں ایک دُوسرے کے دشمن ہو گئے۔ دونوں نے ایک دُوسرے کی دھجیّاں اڑائیں۔ اُدھر مولانا محمد علی جوہر اور خواجہ صاحب میں بڑے یادگار معرکے ہُوئے مولانا محمد علی جوہر خواجہ صاحب کو قدِ آدم پوسٹر کہا کرتے تھے۔ غرض کہ خواجہ صاحب پوٹھکی لڑنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ وہ صاحبِ طرز ادیب بھی تھے، صحافی بھی تھے۔ مقرر بھی تھے، مبلغ بھی تھے اور صُوفی بھی۔

خواجہ صاحب ابھی بچے ہی تھے کہ ان کے والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ وہ کتابوں کا گٹھر اُٹھا کر ریلوے اسٹیشن جاتے اور کتابیں بیچتے۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ پھر جب لکھنے لکھانے کا شوق ہوا تو خود کتابیں لکھتے اور خود انھیں بیچتے۔ خواجہ صاحب کی تحریر ایسی موہنی اور مضمون ایسا البیلا ہوتا کہ دُور دُور تک ان کی شہرت پھیل گئی۔ سُلطان جی کی درگاہ سے تعلق تھا۔ پیری مریدی بھی شروع کر دی اور گدّی نشین ہوگئے۔ سُلطان جی کی درگاہ ان کی تحریکوں کا مرکز بن گئی۔ کئی رسالے اور اخبار نکالے کئی حریف پیدا کیے۔ مقابلے میں جو لوگ خواجہ صاحب سے قد و قامت میں چھوٹے تھے، وہ بھی نامور ہو گئے۔ خواجہ صاحب کے مریدوں کی تعداد ہزاروں لاکھوں تھی۔ اپنے مریدوں کو نئے نئے خطابات سے نوازتے۔

راجہ مہاراجہ بھی ان کے مرید تھے۔ نواب صاحب جاورہ اگرچہ ان کے مرید تو نہیں تھے لیکن عقیدت مند ضرور تھے۔ نواب صاحب جب بھی دِلّی آتے تو خواجہ صاحب کے ہاں حاضری ضرور دیتے۔ نواب صاحب سلسلۂ چشتیہ میں مرید تھے۔ اجمیر کے عُرس کے بعد خواجہ صاحب کا عُرس جاورے میں ہوتا۔ ہندوستان کے نامی گرامی قوال اجمیر سے جاورے آتے اور پھر دربار ہال میں محفلِ سماع سننے اور دیکھنے کے قابل ہوتی۔ آس پاس کی ہندو ریاستوں سے بھی مسلمان جاورے آتے اور خواجہ صاحب کے عُرس کی محفلوں میں شرکت کرتے۔ خواجہ صاحب سے مجھے انھی محفلوں میں نیاز حاصل ہُوا۔ مَیں اکثر ان کی قیام گاہ پر بھی حاضری دیتا۔ پھر جب کبھی دِلّی سے گزرتا تو خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ مَیں اُن کی باتوں اور ان کی تحریر کا گھائل تھا۔

ہندوستان میں بخشا قوّال کا طُوطی بول رہا تھا۔ بخشا خواجہ صاحب کی دریافت تھا۔ وہ خواجہ صاحب کا دُموں دیوانہ تھا، اور خواجہ صاحب ہی نے نواب صاحب جاورہ سر محمد افتخار علی خان سے اس کا تعارف کرایا تھا۔ بخشا کی طرز میں نور تھا، اُس کی مرکیاں گھائل کر دیتیں۔ وہ جو شعر گاتا اس شعر کی تصویر بن جاتا۔ وہ شعر اور موسیقی کے امتزاج سے تصویر کھینچتا۔ بخشا کا رنگ سانولا تھا لیکن اُس کے نقش بڑے تیکھے تھے اور موسیقی سے اس کی شخصیت میں بڑی محبوبیت پیدا ہو جاتی تھی اور جب بخشا یہ مصرع پڑھتا: اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستہ۔ تو بخشا کو دیکھ کر یہ مصرع دُہرانے کو جی چاہتا اور جب بخشا بیدم وارثی کی یہ غزل:

" وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دستِ ناتواں سے "

گاتا، تو شاید ہی کوئی ایسا پتھر دل ہوگا جس پر بے خودی نہ چھا جاتی ہو۔ اشعار میں جو جھنکاری ہوتی اس کی آواز اور اس کی ادائیگی اسے شعلہ بنا دیتی۔ مخصوص محفلوں میں بخشا ساری باندھ کر ناچتا اور بھگت کبیر اور میرا کے گیت گاتا اور ایک قیامت برپا کر دیتا۔ یہ نہیں تھا کہ بخشا گاتا اور دُوسرے روتے۔ مَیں نے تو بخشا کو بھی اپنے گانے پہ روتے دیکھا ہے۔ وہ صاحبِ حال تھا۔ ۱۹۳۷ء میں بخشا امرت سر آیا۔ اور اس کی ساری پارٹی نے میرے یہاں قیام کیا۔ وہ سات دن تک رہا اور میرے والد صاحب نے اپنے یہاں اُس کی قوالیوں کا بندوبست کروایا۔ اعلیٰ حضرت اُس زمانے میں اُس سے کسی بات پر خفا ہو گئے تھے۔ پھر جب بخشا اپنے وطن میرٹھ گیا تو اُس کا خط موصول ہُوا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اعلیٰ حضرت نے مجھے جاورے بُلوایا ہے اور مَیں جا رہا ہُوں۔ انشاء اللہ آپ کی اور ہماری مُلاقات اس برس جاورے میں ہوگی۔ اور یہ بخشا سے آخری مُلاقات تھی۔ وہ دِق کا مریض تھا۔ میرٹھ سے یہ خبر آئی کہ بخشا مَر گیا۔ بخشا کے مَرنے پر ریاست میں تعطیل ہُوئی۔ اعلیٰ حضرت کو بے پناہ صدمہ ہُوا۔ اور خواجہ صاحب کی محفل کا یہ چہکتا ہُوا بُلبُل ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ بخشّا نے محفلِ سماع میں وہ رنگ باندھا کہ اعلیٰ حضرت نے اُسے ایک خوان دیا جس میں ریشم کا تھان اور نقدی رکھی ہُوئی تھی۔ خواجہ صاحب نے باآوازِ بلند کہا کہ —— اگر یہ بخشّا ہے تو حضور دِل شاہ ہیں —— اس دن سے لوگ اعلیٰ حضرت کو دِل شاہ کہنے لگے۔

بخشّا کا ایک جوڑی دار، جو ڈھولکی بجاتا تھا اور جس کا نام چُمّن تھا، کراچی میں گمنامی کی موت مرگیا۔ چُمّن ایسی ڈھولکی بجانے والا بھی اب پیدا نہیں ہوگا۔

خواجہ صاحب کی تقریروں کا عجیب انداز ہُوا کرتا تھا۔ یہاں بھی وہ ڈرامائی انداز سے کام لیتے۔ قِصّہ کہانی سے تقریر شرُوع کرتے۔ زبان اور مضمون میں سادگی ہوتی —— خوانچہ لگانے والا بھی بڑے انہماک سے اُن کی تقریر سُنتا اور سر دُھنتا۔ جاورے میں عید میلاد النبیؐ کی تقریب میں خواجہ صاحب نے شرکت کی اور تقریر اِس طرح شرُوع کی: "جب میں جاورے اسٹیشن پر اُترا تو مَیں نے دیکھا کہ ایک اسکول کے میدان میں بچّے فٹ بال کھیل رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر فٹ بال نے ایک چیخ ماری۔ مَیں نے فُٹ بال سے کہا کہ تجھے کیا تکلیف ہے؟ فٹ بال نے کہا، نہ جانے فرنگیوں کو مجھ سے کیا بَیر تھا، مجھے اس لیے بنایا کہ مَیں ٹھوکریں کھاتی رہُوں۔ مجھے ٹھوکریں کھاتے کھاتے صدیاں بیت گئیں۔ ایک میری بہن ہے جس کا نام والی بال ہے۔ اُسے دیکھو، ہاتھوں ہاتھ رہتی ہے۔ مجھے اُس پر رشک آتا ہے۔ اور پھر خواجہ صاحب نے بتایا کہ یہی جزا و سزا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ مُسلمان ایک عرصے سے فٹ بال بنے ہُوئے ہیں جو کبھی والی بال تھے۔ اور جو کبھی ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ اور پھر فرمایا کہ اگر فُٹ بال رو رو کر اپنے گُناہوں سے تائب ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی خطا معاف نہ ہو جائے اور وہ پھر ایک مرتبہ والی بال نہ بن جائے۔ اور آخر میں خواجہ صاحب اُسوۂ حسنہ کے موضُوع پر آگئے۔ وہ مثالیں دے کر بات سمجھایا کرتے تھے۔ کچھ سعدیؔ شیرازی اور مولانا رُومی کا سا انداز تھا۔ خواجہ صاحب اُردو میں ہندی زبان کے ایسے الفاظ، جو اُردو کا حصّہ بن گئے تھے اور اُردو زبان کی دِل کشی میں اضافہ کرتے تھے، بڑی خوبی سے استعمال کرتے تھے۔ خواجہ صاحب ہندی زبان سے تبلیغ کا بھی کام لیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ درپردہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کو بھی مُسلمان بنا چکے تھے۔ مہاراجہ کی ایک مُسلمان بیوی بھی تھیں جن کی اولاد مُسلمان ہے۔ مہاراجہ نے اپنی زندگی میں یہ راز کیوں فاش نہیں کیا اور آخر میں ان کا انجام ہندوؤں ایسا کیوں ہُوا؟ یہ ایک راز ہے اور نہ جانے یہ کب تک راز رہے۔

پاکستان بننے کے بعد خواجہ صاحب ۱۹۵۰ء میں پاکستان آئے۔ اور یہ میری ان سے آخری مُلاقات تھی جو ریڈیو پاکستان میں ہُوئی۔ خواجہ صاحب اور مولینا آزاد میں چل رہی تھی۔ مَیں نے عرض کیا، خواجہ صاحب مولانا کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ فرمایا۔ ابن الندیم کی "الفہرس" کا حافظ ہے۔ مجھے خواجہ صاحب کی ذہانت پر حیرت بھی ہُوئی اور ہنسی بھی آئی۔

خواجہ صاحب اور مولانا ظفر علی خاں میں بھی خوب چلتی تھی۔ مولانا نے خواجہ صاحب پر بہت سی نظمیں اور اشعار کہے ہیں لیکن سنگٹھن اور شدھی تحریک میں خواجہ صاحب کی حمایت بھی کی ہے۔ ایک مرتبہ خواجہ صاحب نے اپنے اخبار کی ایک خبر پر، جو منادی میں شائع ہوئی تھی، ہندوؤں سے معافی مانگ لی۔ اسے پروفیسر گلشن رائے نے بانس پر چڑھا دیا اور اپنے اخبار بھیشم میں اس معافی نامے کو شائع کیا۔ اور آخر میں وہت ترے گیدی کی دُم میں نمدا، لکھ دیا۔ بس ظفر علی خاں کی طبیعت پھڑک گئی اور انھوں نے فی البدیہہ یہ اشعار کہے :

سُندر ناریوں والی لاری — جب ہوئی ثابت اصل سے عاری

خواجہ نے فوراً کر دی تلافی — مانگ لی لالاؤں سے معافی

صبر انھیں پھر بھی نہ آیا — جاتی کا پھڑا کیوں ٹکرایا

وہت تیرے گیدی کی دُم میں نمدا

آریوں کی اس گالی کے صدقے — جاتی کی اس رکھوالی کے صدقے

خواجہ جو ہیں سچ کے عادی — وہ بھی نہ کردیں کیوں یہ منادی

سُن کے جیسے سر پیٹ لے لالہ — وہت ترے نخرے میں گرم مسالہ

وہت تیرے گیدی کی دُم میں نمدا

آئی ہے جب سے دیش میں شدھی — ماری گئی ہے جاتی کی بدھی

ہے کہیں لاٹھی ہیں کہیں اینٹیں — اُڑتی ہیں جن سے خون کی چھینٹیں

مار ترے ان نخروں نے ڈالا — وہت ترے نخرے میں گرم مسالہ

وہت تیرے گیدی کی دُم میں نمدا

مولانا ظفر علی خاں

روزنامہ زمیندار ایک تاریخ ساز ادارہ تھا۔ اس نے بڑے بڑے ادیبوں اور صحافیوں کو جنم دیا۔ اس کی کوکھ سے بے شمار روزنامے نکلے۔ اس کے اوراق پر برصغیر کے نامی گرامی ادیبوں اور صحافیوں کی جودتِ طبع کے اَن مِٹ نقوش ثبت ہیں۔ روزنامہ زمیندار کے ادارۂ تحریر میں سلیم پانی پتی اور غالب دہلوی بھی تھے۔ سالک و مہر، قاضی احسان اللہ، علامہ رشدی، مرتضیٰ احمد خاں میکش، حاجی لق لق، حسین میر کاشمیری اسی ادارے سے وابستہ رہے۔ مولانا ظفر علی خاں اپنے ساتھ کلکتے سے مولانا چراغ حسن حسرت کو لے کر آئے۔ پھر مولانا ظہرامرتسری نے اسی اخبار کے دفتر میں اپنا بستر جمایا۔ اور وہ یہاں سے مر کر نکلے۔

میرا تعلق روزنامہ زمیندار سے زیادہ مولانا ظفر علی خاں سے تھا۔ حضرت مولانا مجھ پر بے پناہ شفقت فرماتے اور میں ان کے ساتھ سائے کی طرح رہتا۔ وہ جب بھی امرتسر آتے میرے یہاں قیام فرماتے میں زمیندار میں ملازم نہیں تھا، زیر تربیت تھا۔ میرے مضامین زمیندار میں شائع ہوتے رہتے۔ اور میں جب بھی حضرت مولانا کے سامنے آتا وہ مجھے دیکھ کر اذا جاء نصر اللہ کہتے۔

حضرت مولانا ظفر علی خاں نے برصغیر کے مسلمانوں میں اخبار بینی کا مذاق اور ادبی و سیاسی شعور پیدا کیا۔ اور اردو صحافت کو مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں کی صحافت کا ہم پلّہ بنایا۔ اور اسے انگریزی زبان کے الفاظ کے ایسے مترادفات عطا کیے جن سے اردو صحافت کی ایک علیحدہ لغت مرتب ہو سکتی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اردو صحافت کے مدرسۂ انشا کی بنیاد رکھی۔

روزنامہ زمیندار اور اس کے ہم عصر روزناموں کے مدیر برصغیر کی مشہور تاریخ ساز شخصیتیں تھیں۔ یہ خود جیتے جاگتے ادارے تھے اور ان کے اخبار عوام کے پیچھے نہیں چلتے تھے بلکہ یہ عوام کو اپنے پیچھے لے کر آگے بڑھتے تھے۔ یہ رائے عامہ کے آئینہ دار ہی نہیں تھے، یہ رائے عامہ کے خالق بھی تھے۔ اور اگر پریس اپنے منصب کو پہچاننے لگے تو رائے عامہ کی تخلیق پریس ہی کے منصب و فرائض میں شامل ہے۔

ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور حسرت موہانی ایک ہی زمانے کی عظیم شخصیتیں ہیں۔ ذرا ان کی جوانی کے کارناموں پر نظر ڈالیے۔ یہ لوگ وہ کام کر گئے جو کئی نسلیں اپنے پورے عرصۂ حیات میں نہیں کر پاتیں۔ جب یہ

پبلک پلیٹ فارم پر گرجتے تو فرنگی اقتدار کا ایوان لرز اٹھتا اور جب یہ قلم اٹھاتے تو یوں لگتا کہ جیسے آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ کھل گیا ہے۔ ان نوجوانوں نے برصغیر کے ایک ایک شخص کے دل میں آزادی کی لگن پیدا کی اور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک علیٰحدہ پلیٹ فارم اور ایک علیٰحدہ پریس قائم کیا اور اردو صحافت جو فرسودہ خبروں کی بے تُکی ترتیب تک محدود تھی، انھوں نے اسے عالمی صحافت کا ہم پلّہ بنانے کی کوشش کی۔

سر مائیکل اُڈوائر جس کے ہاتھوں مولانا کو بڑی بڑی اذیتیں پہنچی تھیں، اور جو پنجاب کا گورنر تھا، مولانا کے بارے میں لکھتا ہے:

"زمیندار ایک آتش بار اخبار ہے۔ اور اس کا ایڈیٹر ظفر علی خان ایک آتش مزاج شخص ہے۔ ۱۹۱۳ء میں اس نے ترکوں کے لیے چندہ فراہم کرنا شروع کیا اور رقم پیش کرنے کے لیے یہ قسطنطنیہ گیا۔ ترکی سے واپسی کے بعد اس کا انداز بیان پہلے سے زیادہ شوخ اور باغیانہ ہو گیا ہے۔"

اور جب مولانا ترکی سے واپس آئے تو مولانا الطاف حسین حالیؔ نے ان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں:

اے دیں کے امتحاں میں جانباز ——— اے نصرتِ حق میں تیغ عریاں
اے صدق و صفا کی زندہ تصویر ——— اے شیر دل اے ظفر علی خاں
ہے زندہ وہ مُلک اور ملّت ——— ہوں زندہ جس میں تجھ سے انساں

مولانا ظفر علی خان بے مثال مترجم تھے۔ مولانا نے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی فرمائش اور اصرار پر ڈاکٹر ڈریپر کی شہرۂ آفاق کتاب "CONFLICT BETWEEN SCIENCE AND RELIGION" کا اردو میں "معرکۂ مذہب و سائنس" کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں مصنف نے مذہبی عصبیت پر انتہائی غم و غصہ کا اظہار کیا ہے اور ان مذاہب پر جو سائنسی حقائق سے ٹکراتے ہیں، کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ اس سلسلے میں موصوف کا ہدفِ ملامت نصرانی مذہب ہے۔ ڈاکٹر ڈریپر نے اسلام کی عدیم النظیر فتوحات اور قابلِ رشک تمدن کا ذکر کیا ہے۔ چوں کہ مصنف نے فلسفۂ مذاہب کا غائر مطالعہ نہیں کیا تھا اس لیے کہیں کہیں وہ بہت سطحی باتیں کہہ گیا ہے۔ چوں کہ مولانا ظفر علی خان نے ترجمے کے ساتھ ساتھ حواشی میں ڈریپر کے خیالات کی ردّ و قدح کی ہے اور جوازمیں منطقی دلائل دیے ہیں، اس لیے اس تصنیف میں جو کمی رہ گئی تھی اسے ظفر علی خان کی بے لاگ تنقید اور تبصرے نے پورا کر دیا۔ اس ترجمے کا مقدمہ بابائے اردو نے لکھا ہے۔ چند سطریں ملاحظہ فرمایئے:

"اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں اصل کتاب کے زورِ فصاحت کو بعینہٖ قائم رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے ترجمے میں دو بڑی مشکلیں تھیں۔ ایک علمی اصطلاحات و مباحث، دوسری زبان کی فصاحت و بلاغت، ظفر علی خان نے جو حقیقت میں قابلِ مبارک باد ہیں، اس

مشکل کو نہایت آسان کر دیا ہے ۔"

ظفر علی خان کے علمی و ادبی کارناموں کا زمانہ دکن میں گزرا۔ نواب محسن الملک نے ایک خط میں، جو انھوں نے نواب افسر جنگ کو لکھا تھا، کتنی صحیح بات کہی ہے کہ ظفر علی خان نے علی گڑھ میں رہ کر جو حاصل کیا ہے، حیدرآباد اس سونے پر سہاگے کا کام دے سکتا ہے۔ اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مولانا کا حیدرآباد کا کام ان کا سب سے بڑا علمی و ادبی سرمایہ ہے۔ جو بہت کچھ ضائع ہو گیا اور جو تھوڑا سا بچا ہے، اگر حالات ایسے ہی رہے تو وہ بھی ضائع ہو جائے گا۔

۱۹۰۴ء میں حضرت مولانا دکن ریویو کے ایڈیٹر تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے بہت سی مشہور انگریزی نظموں کا ترجمہ کیا اور بہت سی نظمیں خود بھی کہیں، ان میں "رود موسیٰ" نے بہت شہرت پائی۔

او نامراد ندی تجھ پر غضب خدا کا — الٹا ہے تو نے تختہ یارانِ آشنا کا
اچھا کیا ادا حق ہمسائیگی کا تو نے — ہم تجھ سے لو لگائیں تو نے ہی کوتا کا
تیری ہر ایک "ٹکر" داعی بنی اجل کی — تیرا ہر اک تھپیڑا قاصد بنا قضا کا
منجدھار میں ہے کشتی ٹوٹا ہوا ہے لنگر — سر پر ہے رات کالی طوفان ہے بلا کا
تقدیر ہنس رہی ہے تدبیر رو رہی ہے — مورد ہو ناخدا کیوں الزام ناروا کا
شب ہے شب قیامت دن ہے حساب کا دن — وقت آ گیا سزا کا عہد آ گیا جزا کا
اس واقعہ کا ماتم برسوں بپا رہے گا — کانٹا ہر ایک دل میں اس کا چبھا رہے گا

مولانا حالی کو یہ نظم اتنی پسند آئی کہ انھوں نے حضرت مولانا کے نام ایک خط میں یہ لکھا:

"رودِ موسیٰ" میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض زورِ طبع اور شاعری کی خداداد قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں پیدا ہو جائیں تو کچھ امید پڑتی ہے کہ نئی شاعری چل نکلے۔ پنجاب میں آپ جیسے چند لوگوں کی صورتیں نظر آتی ہیں بشرطیکہ فکرِ معاش دم لینے دے۔ اور یہ چینک بھی دل کو لگی رہے۔"

مولانا نے مشہور انگریزی نظموں کے ترجمے اس طرح کیے ہیں کہ ان ترجموں پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ مولانا نے روڈیارڈ کپلنگ کی مشہور کتاب "دی جنگل بک" کا آسان اردو میں ترجمہ کیا۔ اس میں کہیں کہیں موقع نکال کر انگریزی کی مشہور نظموں کے ترجمے بھی کر ڈالے۔ مثلاً ٹینی سن کی نظم "دی بروک" کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہے جو کچھ اس طرح ہے:

جھاڑوں میں جھنکاروں میں صحراؤں میں ویرانوں میں — چاند کو اور تاروں کو میں اپنا میٹھا راگ سناتی ہوں
کاشتی کھیتوں میں اک چکر اور تھوڑی سی دوڑ پہ آخر — جا کے چھلکتے دریا کو میں شربتِ وصل پلاتی ہوں
عمرو و زید کی ہستی کیا صبح آئے شام سدھارے — مجھ کو دیکھو ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

اور لارڈ بائرن کی مشہور نظم "دی سی" کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

بچھے جا اے یمِ ژرف و عمیق و تیرہ و اخضر | تجھے بیڑوں کی کیا پروا جہازوں سے تجھے کیا ڈر

زمیں کو گرچہ کرتا ہے تباہ و پائمال انساں | تفوّق اس کا مٹ جاتا ہے ساحل پر مگر آکر

وہ بیڑے جو چمکتے اور گرجتے ہیں دمِ پیکار | بسانِ شعلۂ برق و مثالِ نافۂ تندر

ہراساں مُلک ہیں جن سے لرزتی جن سے ہیں قومیں | پڑے ہیبت سے جن کے کانپتے ہیں نامور گھر گھر

نہنگِ چوب انھیں کہیے کہ جن کا صانع خاکی | عبث نازاں ہے اس شے پر بنا جس کی ہے پانی پر

کھلونے ہیں یہ تیرے اور مچل کر بارہا تُو نے | انھیں توڑا ہے موجِ آسماں پیکر سے ٹکرا کر

ہُوئی کیا عظمتِ یوناں ہُوئی کیا شوکتِ بابل | کہاں ہے کارتھیج کی شاں کہاں روما کا کرّوفر

زمانہ جب موافق تھا بسایا تیری لہروں نے | تجارت کا انھیں مرکز حکومت کا انھیں مصدر

تجھے کہیے خُدا کی جُود اور اکرام کی مسند | تجھے کہیے خُدا کی عظمت و اجلال کا مظہر

اب آیئے مولانا سے ملیے ۔ درمیانہ قد ۔ کسرتی بدن ۔ جسم کے اعتبار سے عام لیڈروں سے مختلف ۔ ان کا جسم چھریرا ، ورزش کرتے ہیں اور میلوں پیدل چلتے ۔ بانک بنوٹ سے واقف ، بڑے اچھے پیراک اور شہسوار ، سر کے حواشی پر بال اور چندیا بالوں سے خالی ۔ چندیا پر ایک سیاہ رنگ کا مسّا ۔ رنگ گندمی ۔ میرے ہوش سے پہلے سُوٹ بھی پہنا کرتے تھے ۔ لیکن مَیں نے انھیں ہمیشہ علی گڑھ کٹ شیروانی میں دیکھا ۔ علی گڑھ کٹ پاجامہ بھی پہنتے تھے ۔ سر پر رومی ٹوپی ۔ پاؤں میں پمپ ۔ ہاتھ میں چھڑی ۔ قہقہہ اس زور سے لگاتے کہ چھت اُڑ جاتی ۔ کھانا اچھا کھاتے لیکن کم خوراک ۔

مولانا کے پیدل چلنے کے بہت سے قصّے ہیں ۔ پہلا قصّہ تو یہ ہے کہ جب مولانا ظفر علی خان حسرت صاحب کو اپنے ساتھ لے کر کلکتے سے لاہور آئے اور انھیں زمیندار کے دفتر میں ٹھہرایا تو روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر قاضی احسان اللہ نے رات کو باتوں باتوں میں مولانا چراغ حسن حسرت کو یہ بتا دیا کہ ویسے تو یہاں ہر طرح خیریت ہے لیکن مولانا کو ایک مرض ہے اور وہ یہ ہے کہ سُورج کی پہلی کرن نکلنے سے پہلے ہی گھر سے نکل جاتے ہیں اور ساری دُنیا کا ایک چکر لگا آتے ہیں اور اتنا تیز چلتے ہیں کہ اللہ کی پناہ ۔ اور مشکل یہ ہے کہ مولانا کو اپنے دوستوں کی صحت کا بہت خیال رہتا ہے لہٰذا اگر خیریت چاہتے ہو تو صبح جب مولانا تمھیں سونے سے جگائیں تو کوئی معقول سا عذر کر دینا ۔ جب دُوسرے دن صبح مولانا نے حسرت صاحب کے دروازے پر دستک دی تو حسرت صاحب نے کراہتے ہوئے پوچھا "کون ؟" مولانا نے کہا ۔ "حسرت صاحب کیسی طبیعت ہے ؟" فرمایا ۔ "کیا عرض کروں ، رات بھر قولنج کے درد میں تڑپتا رہا ہُوں ۔"

ایک مرتبہ مَیں مولانا سے ملنے کے لیے ان کے آبائی گاؤں کرم آباد گیا ۔ مولانا نظر بند تھے ۔ دُوسرے دن نظر بندی کی مُدّت ختم ہو رہی تھی ۔ چنانچہ صبح کی نماز پڑھ کر مولانا نے اپنا اٹیچی کیس مجھے دیا اور خود فراٹے بھرنے لگے ۔ کرم آباد سے وزیر آباد کا اسٹیشن خاصے فاصلے پر ہے ۔ میرا خیال تھا کوئی ٹم ٹم یا موٹر ہمارے پیچھے آ رہی ہوگی ۔

حالت یہ تھی کہ مولانا چل رہے تھے اور میں دوڑ رہا تھا۔ مولانا پیچھے مڑ مڑ کر مجھے دیکھتے اور مسکراتے۔ خیر خدا خدا کر کے ہم وزیر آباد ریلوے اسٹیشن بخیریت پہنچ گئے۔ مولانا نے کہا۔ "کہو سیر کیسی رہی؟" میں نے کہا۔ "آپ کی تو سیر ہوئی اور اپنا سفر ہو گیا۔"

ایک مرتبہ مولانا کو دھمکیوں کے خطوط موصول ہوئے۔ ہر خط میں یہ لکھا ہوتا کہ تم کو مار ڈالا جائے گا۔ مولانا اختر علی خاں اور مولانا کے دوسرے احباب نے پولیس میں رپٹ درج کروائی۔ چناں چہ ایک پولیس انسپکٹر متعین کیا گیا۔ اس نے مولانا سے ان کا پروگرام پوچھا۔ پہلی چیز صبح کی سیر تھی۔ پہلے دن تو انسپکٹر پولیس مولانا کے ساتھ سیر کے لیے گیا لیکن دوسرے دن اس نے اپنے افسر سے کہا کہ کوئی گھڑسوار مقرر کیجیے۔ میرے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ مولانا کبھی تو میکلوڈ روڈ سے چلتے اور شاہدرے سے لوٹ آتے اور کبھی اس سے آگے نکل جاتے۔ ایک دن سالک صاحب نے کہا۔ مولانا آپ لاہور کی ڈاک شاہدرے پہنچا آیا کیجیے اور واپسی پر شاہدرے کی ڈاک لے آیا کیجیے۔

جس طرح موسم سرما کی صبح لوگ سورج کی پہلی کرن کا انتظار کرتے ہیں اسی طرح برصغیر کے ہر شہر میں، گرمی ہو یا سردی، لوگ بازاروں، گلیوں اور سڑکوں پر نکل آتے اور روزنامہ زمیندار کا انتظار کرتے۔ جو لوگ پڑھے لکھے ہوتے وہ پڑھتے، اور جو لوگ ان پڑھ ہوتے وہ دوسروں سے پڑھوا کر سنتے۔ بازاروں میں ایک دکان دار دوسرے دکان دار کو مولانا کی کوئی چیٹ پٹی تازہ نظم اخبار سے پڑھ کر سناتا۔ یہ اخبار کیا تھا خود مولانا ظفر علی خان تھے، جو گھر گھر پہنچ جاتے تھے اور ہر گھر میں ان کا خیر مقدم کیا جاتا۔ اس زمانے میں اخبار بینی کا شوق عام تھا۔ اگر مولانا چراغ حسن حسرت، سالک صاحب اور مہر صاحب شہر میں نکل جاتے تو لوگ اشاروں سے ایک دوسرے کو بتاتے کہ وہ دیکھو سالک صاحب، کل انھوں نے فلاں فلاں بات لکھی تھی اور یہ مولانا چراغ حسن حسرت ہیں، بھئی کیا خوب لکھتے ہیں۔

مولانا عبد المجید سالکؔ

سالکؔ صاحب صورت شکل سے لیڈر معلوم ہوتے تھے۔ اس زمانے میں چند لیڈروں کو چھوڑ کر سارے لیڈر ایسے ہی ہوتے تھے۔ لمبے چوڑے بھاری بھرکم۔ جیسے مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی یا جیسے سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ سالکؔ صاحب کا رنگ گندمی تھا۔ پیشانی کشادہ، آنکھیں بڑی بڑی لیکن اندر کی طرف دھنسی ہوئی۔ کرتا شلوار اور شیروانی پہنتے۔ پاؤں میں گرگابی یا پمپ۔ تحریکِ خلافت میں قید بھی کاٹ چکے تھے۔ عربی فارسی کے منتہی۔ شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ خط ایسا پاکیزہ، جیسے موتی پرو دیے۔ رساؔ رام پوری کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ ایک مرتبہ سالکؔ صاحب نے رساؔ کو خط میں لکھا کہ میری شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے تو رساؔ نے جواب میں لکھا کہ "آپ کا خط بہت اچھا ہے۔" سالکؔ صاحب کی تحریر بے پناہ شگفتہ اور سادہ اور دل موہ لینے والی تھی۔ اور بڑی رواں دواں۔ پڑھنے میں کہیں بھی ٹھوکر نہ لگتی۔ سالکؔ صاحب ادیب بھی تھے اور صحافی بھی۔ صحافت میں جن چند لوگوں نے ادبی معیار قائم رکھا تھا ان میں سالکؔ صاحب کا نام بھی آتا ہے۔ وہ مترجم بھی بڑے اچھے تھے۔ اردو صحافت کے لغت سازوں میں سالکؔ صاحب کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ آج بھی اردو صحافت کے ذخیرے میں جو چند الفاظ سکۂ رائج الوقت ہیں اور جو انگریزی الفاظ کا ترجمہ ہیں، ان کا ترجمہ کرنے والوں میں مولانا ظفر علی خان کے ساتھ ساتھ سالکؔ صاحب کا نام بھی آتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے بعض الفاظ کا ایسا ترجمہ کیا جو ثقالت کی وجہ سے رواج نہ پا سکا۔ لیکن سالکؔ صاحب نے ان الفاظ کا ترجمہ ایسا رواں کیا کہ بڑی آسانی سے زبان پر چڑھ گئے۔ مثلاً سول ڈِس اوبیڈی انس (CIVIL DISOBEDIENCE) کا ترجمہ مولانا نے عصیانِ مدنی کیا تھا اور ہنگر سٹرائیک (HUNGER STRIKE) کا مقاطعہ جوعی۔ یہ الفاظ مقبول نہ ہوئے۔ لیکن جب سالکؔ صاحب نے ان کا ترجمہ سول نافرمانی اور بھوک ہڑتال کیا تو یہ الفاظ آج تک رائج ہیں۔

سالکؔ صاحب دارالاشاعت پنجاب میں ملازم تھے اور ان کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ وہ

حضرت مولانا ظفر علی خان کی معیت میں "زمیندار" میں کام کریں۔ "زمیندار" کی حیثیت اس وقت نہ صرف پنجاب میں، بلکہ پورے ہندوستان میں جامعہ صحافت کی تھی۔ اس ممتاز اخبار سے ہندوستان کے بڑے بڑے اور نامی گرامی ادیب، مولانا سلیم پانی پتی، سید جالب دہلوی اور علامہ نیاز فتح پوری وغیرہ منسلک رہے۔ قدرت نے سالک صاحب کی یہ دلی خواہش پوری کردی اور وہ اور مولانا غلام رسول مہر اس ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ سالک صاحب زمیندار کا فکاہیہ کالم "فکاہات" لکھا کرتے تھے اور مہر صاحب اداریہ۔ روزنامہ زمیندار ہندوستان کا معیاری اخبار تھا۔ اور کوئی گھر اور دفتر ایسا نہ تھا جہاں یہ اخبار پڑھا نہ جاتا ہو۔ سالک صاحب کا شمار ملک کے مشہور مزاحیہ کالم نویسوں میں ہوتا تھا۔

زمیندار میں وقت پر تنخواہ نہیں ملتی تھی، مولانا اختر علی خاں کی شاہ خرچی میں خاصی رقم نکل جاتی اور پھر ظفر علی خاں کے قلم سے تو انگریز بھڑکتے تھے۔ اور محمد علی جوہر انگریز دشمن تھے۔ زمیندار آئے دن ضبط ہوتا رہتا۔ اس صورت میں جو لوگ اس سے وابستہ تھے وہ مالی پریشانیوں کی وجہ سے اسے چھوڑ دیتے۔ سالک اور مہر صاحبان اس وجہ سے بھی پریشان رہتے اور پھر سالک صاحب کی مولانا اختر علی خان سے کسی بات پر اَن بن ہو گئی۔ چناں چہ ان دونوں صاحبان نے زمیندار سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے اور چند دوستوں کے تعاون سے اپنا اخبار "انقلاب" نکالا اور پنجاب کے تمام شہروں میں اس اخبار کے اجرا پر بڑے بڑے پوسٹر اشتہار لگائے گئے اور اس میں علامہ اقبال کا یہ شعر تھا:

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہُوا
آسماں ڈوبے ہُوئے تاروں کا ماتم کب تلک

چناں چہ سمجھنے والے سمجھ گئے کہ یہ "ڈوبا ہُوا تارہ" زمیندار ہے اور "آفتابِ تازہ" سالک و مہر کا انقلاب ہے۔ اور پھر ان بزرگوں نے اپنے اخبار میں اپنے اُستاد سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور سالک صاحب اپنے مزاحیہ کالم "افکار و حوادث" میں مولانا اختر علی خان پر ذاتی حملے بھی کرنے لگے۔ سالک و مہر کے ساتھ حفیظ، تاثیر اور ہری چند اختر بھی شامل ہو گئے اور یہ سب لوگ مل کر حضرت مولانا کے خلاف نظمیں لکھتے اور ان کی شخصیت پر حملے کرتے۔ دُوسری طرف مولانا تنہا تھے۔ لیکن مولانا کا کیا مقابلہ۔ وہ تنہا ان سب پر بھاری تھے۔

زمیندار ایک، آپ اتنے، مگر اوجِ سیاست پر
یہ اک تکل لڑے گا آپ کی سارے پتنگوں سے

لیکن جب مولانا کی ذات پر رکیک حملے ہونے لگے اور ان کی نجابت پر بھی حرف گیری کی گئی تو مولانا نے یہ نظم کہی :

انقلابِ زمانہ دیکھیے گا — کل جو تھے دوست آج ہیں دشمن
جھک گئی تھی جو بارِ احساں سے — ہے اب اکڑی ہوئی وہی گردن
میرے دامن نے دی پناہ جنھیں — ہاتھ ان کا ہے اور مرا دامن
مجھ پہ چلنے لگی مری ہی سناں — اب وہ ہیں گیو اور میں ہوں پشن
ہوتی آئی ہے یوں ہی دنیا میں — رسم ہے روزگار کی یہ کہن
خوب فرما گئے ہیں چچا سعدی — کس نیا موخت علمِ تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

اور جب سالک صاحب نے مولانا ظفر علی خان کو "ہندوزئی" اور "نہروانی" کا لقب دیا تو مولانا ظفر علی خان نے جواب میں اپنے کالم نکاہات میں یہ اشعار لکھے :

لقب حاجی بھی ہے، ہندوزئی بھی، نہروانی بھی
مرے ایماں کو آخر چاہیے تھی اک نشانی بھی
مرقعے میں مری تصویر سالک نے جو کھینچی ہے
کہ ڈھنگ ارژنگ ہے اور پیکر حیرت ہے مانی بھی
صلہ میری وفاؤں کا دیا پیہم جفاؤں سے
اور اس پہ مستزاد اس شوخ کی ہے بدزبانی بھی
خدا آباد رکھے مہر و سالک کی صحافت کو
کہ اس کے صدقے میں ہوتی ہے میری قدردانی بھی
ہے اس کی نظم و نثر آئینہ جوہر ہائے ذاتی کا
مگر اس میں چمکتی ہے شرافت خاندانی بھی

اور پھر کچھ لوگ بیچ میں پڑے اور جب استاد اور شاگردوں کی ملاقات ہوئی تو دلوں میں جو کدورتیں تھیں وہ دور ہو گئیں ۔ مہر صاحب اور سالک صاحب کی دوستی بڑی مثالی تھی یہاں جاتے ساتھ ساتھ جاتے ۔ یوں لگتا جڑواں بھائی ہیں ۔ مزاج میں دونوں کے بڑا فرق تھا ۔ مہر صاحب جتنے سنجیدہ تھے ، سالک صاحب اتنے ہی ہنسوڑ اور پُر مذاق تھے ۔ مہر صاحب "انقلاب" کا اداریہ لکھتے تو سالک صاحب اپنا مشہور و مقبول کالم "افکار و حوادث"

یہ نہیں کہ سالک صاحب اداریہ یا کوئی سنجیدہ مضمون نہیں لکھ سکتے تھے ۔ وہ بڑی سوجھ بوجھ

کے آدمی تھے ۔ وہ اپنے ہلکے پھلکے اندازِ تحریر میں بھی فکر انگیز پہلو نکال لیتے تھے۔ شاعر دونوں ہی تھے لیکن سالکؔ صاحب کے یہاں تغزل تھا اور مہرؔ صاحب کی شاعری خالص علمی شاعری تھی۔ مہرؔ صاحب مورخ بھی تھے اور محقق بھی۔ سالکؔ صاحب ککّے زئی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اور وڈالے کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے پٹھان کوٹ سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ دارالاشاعت لاہور سے منسلک ہو گئے۔ مولوی ممتاز علی صاحب کے مددگار تھے۔ ان کے رسالوں کو ایڈٹ کرتے۔ امتیاز علی تاجؔ سے دوستی ہو گئی تھی جو آخری دم تک جاری رہی۔ سالکؔ صاحب نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

میں سالک صاحب کے کالم روزنامہ "انقلاب" میں پڑھا کرتا تھا اور ان کے طرزِ تحریر سے بہت متاثر تھا لیکن ان سے نیاز مجھے سب سے پہلے امرت سر میں میاں محمد شریف کے دولت کدے پر حاصل ہوا۔ میاں صاحب کا شمار امرت سر کے رؤسا میں ہوتا تھا وہ تاجر چرم تھے اور شاید میاں صاحب سالکؔ کے پھوپھا تھے۔ ہاں تو میاں صاحب کے یہاں ایک بار نہیں کئی بار سالکؔ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اور جب میں روزنامہ زمیندار کے دفتر آنے جانے لگا تو "انقلاب" کے دفتر بھی جاتا اور یوں سالکؔ صاحب سے خاصی بے تکلفی ہوگئی۔ لیکن ایک بزرگ اور خورد میں جو ادب کی حد ہوتی ہے وہ آخر وقت تک قائم رہی۔ وہ مجھ پر بے پناہ شفقت فرماتے تھے۔ اور پھر میں نے وہ زمانہ بھی دیکھا جب یونینسٹ پارٹی کو اقتدار نصیب ہوا اور پنجاب کے کسی اخبار نے اس سے تعاون نہیں کیا۔ لیکن سالکؔ اور مہرؔ صاحبان نے روزنامہ انقلاب کو یونینسٹ پارٹی کا ترجمان بنا دیا۔ چناں چہ روزنامہ انقلاب عوام میں اپنی مقبولیت کھو بیٹھا اور اس کی اشاعت بہت کم رہ گئی۔ یہ صرف سرکاری دفتروں اور سرکاری اداروں میں پڑھا جانے لگا اور جب ملک غلام محمد پاکستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے تو سالکؔ صاحب کراچی آگئے اور نگار ہوٹل پاکستان چوک میں انھوں نے دو کمرے کرائے پر لے لیے۔ میں اس زمانے میں ریڈیو پاکستان میں ملازم تھا۔ میں اور مجید لاہوری، جو سالکؔ صاحب کے دیرینہ نیازمندوں میں تھے، تقریباً روزانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

سالکؔ صاحب بڑے نستعلیق آدمی تھے۔ اپنے ملنے جلنے والوں کے سارے دکھ درد سمیٹ لیتے۔ اگر کسی پر کوئی افتاد پڑتی تو وہ مقدور بھر اس کی مدد کرتے۔ بے روزگاروں کے روزگار کے لیے سفارش کرتے۔ پہلے تو سفارشی چٹھی لکھ دیتے، اور اگر اس سے کام

نہ بنتا تو خود چلے جاتے اور جس کی سفارش کرنی ہوتی اسے اپنا عزیز بتاتے۔ ریڈیو پاکستان میں ہفتے میں انھیں ایک آدھ پروگرام مل جاتا۔ پھر غلام محمد نے اُن کے ایک ہزار روپے مہینہ مقرر کروا دیے۔ اور اُن کا کام یہ تھا کہ حکومت کی حمایت میں مراسلے لکھ کر محکمۂ اطلاعات کو فراہم کریں اور یہ محکمہ انھیں اخباروں میں چھپواتا تھا۔ پھر جب حسرت صاحب بھی روزنامہ "امروز" کی ملازمت چھوڑ کر ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے تو یہ دونوں پرانے دوست ہفتے میں دو چار بار آپس میں ملتے۔ حسرت صاحب ریڈیو پاکستان سے اُٹھ کر سالک صاحب کے یہاں چلے جاتے۔ اس زمانے میں سالک صاحب نے نگار ہوٹل چھوڑ دیا تھا اور ریڈیو پاکستان کے پیچھے ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ اُن کی اہلیہ بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ سالک صاحب کا مطالعہ آخر عمر تک جاری رہا۔ اُن کی میز پر عربی فارسی کی ضخیم کتابوں کا ڈھیر لگا رہتا۔ مسلک کے اعتبار سے وہ اہلِ حدیث تھے۔

حسرت صاحب اگرچہ سالک صاحب کے ہم عصر تھے لیکن عمر کے اعتبار سے وہ سالک صاحب کا بہت ادب کرتے تھے۔ مولانا حسرت، سالک اور مہر صاحبان شام کو علامہ کے یہاں جا بیٹھتے۔ سالک صاحب کو علامہ کے مزاج میں بڑا دخل تھا چناں چہ علامہ اپنی تقریریں اور بیانات سالک صاحب سے لکھوایا کرتے۔ آل انڈیا ریڈیو سے علامہ کی پہلی اور جہاں تک مجھے یاد ہے آخری تقریر نشر ہوئی، تو اس کا مسودہ بھی سالک صاحب نے لکھا۔

مولانا چراغ حسن حسرتؔ

حسرتؔ صاحب بڑے کلّے ٹھلّے کے آدمی تھے۔ دیدارو، کشادہ پیشانی، سر پہ بال تھوڑے تھوڑے گھنگھریالے، ستواں ناک، دُہرا جسم، چوڑا چکلا سینہ، دراز قامت، مُنھ پہ مونچھیں لیکن مروڑنے والی مونچھوں سے تھوڑی کم، لمبا کُرتا، بڑی موری کا پاجامہ، ڈبل فریم کی عینک لگاتے تھے۔ آواز میں بڑی کھنک تھی۔ شعر و ادب کا جیسا ستھرا مذاق تھا، ویسا ہی موسیقی کا بھی تھا۔ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے۔

مَیں نے سراج الدین ظفرؔ کے مکان پر ان کو پہلی مرتبہ اپنی غزل سُناتے دیکھا۔ اُن کی آواز بہت رسیلی تھی۔ حسرتؔ صاحب نے بہت کم غزلیں کہی ہیں لیکن جو غزلیں کہی ہیں، وہ انھیں ایک اچھا شاعر ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

حسرتؔ صاحب کے بارے میں بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے بڑا مزاحیہ کالم نویس اور طنز نگار آج تک پیدا نہیں ہُوا۔ ان کا رنگ ہمیں انشاؔجی کے یہاں نظر آتا ہے۔ حسرتؔ کی عظیم شخصیت کے سائے سے بچ نکلنا مشکل ہے۔ ہم ایسے چھٹ بھیّے بھی ان کے خوشہ چینوں میں ہیں۔ حسرتؔ صاحب کسی گھر بند نہیں تھے۔ تقریباً یہی حال سالکؔ صاحب کا بھی تھا۔ شاعری ہو یا تاریخ یا علم و ادب کا کوئی مسئلہ ہو، کسی کتاب یا مصنّف کی کوئی بات ہو، یہ بزرگ پاتال کی خبر اور بال کی کھال تک نکال لاتے۔ سو اس صورت میں جو بھی ان کے خلاف قلم اُٹھاتا، بہت سوچ سمجھ کر اُٹھاتا۔

حسرتؔ صاحب میں کوٹ کوٹ کر شوخی بھری ہوئی تھی۔ وہ بڑے بذلہ سنج تھے۔ جملہ بازی میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک مرتبہ ایک مشاعرے میں حفیظؔ جالندھری صاحب نے حسرتؔ صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا: "مولانا مصرع اُٹھایئے۔"

مولانا کھڑے ہو گئے اور فرمایا:

"مُردے اُٹھاتے اُٹھاتے ساری عمر گزر گئی"

جب چیانگ کائی شیک جنگ ہار گیا تو مولانا سے میاں افتخار الدین مرحوم نے پوچھا: "مولانا اب چیانگ کائی شیک کیا کرے گا؟"

مولانا نے کہا: "وہ بھی کوئی اخبار نکال لے گا۔"

ایک مشہور ادیب کے بارے میں ایک صاحب نے مولانا سے ان کی رائے پوچھی تو مولانا نے فرمایا: "یکے از فرومائگانِ ادب۔" مولانا نے ایک نوجوان شاعر سے، جس نے اپنی نظم میں ناگاساکی ہیروشیما اور ایٹم بم کا مضمون باندھا تھا، کہا: "یہ آپ شاعری کرتے ہیں یا لوگوں کو ڈراتے ہیں؟"

حسرت صاحب گھر میں ہوتے تو حقّہ پیتے اور جب کسی ایسی جگہ ہوتے جہاں حقّہ نہ ہوتا تو وہ سگریٹ پیتے۔ اور اسے بھی حقّے کی طرح پیتے۔ وہ سگریٹ کو دو انگلیوں میں دبا کر اور مٹھی بند کرکے اس زور سے کش کھینچتے کہ دو چار کش میں سگریٹ کا بھرکس نکل جاتا۔ چوں کہ مولانا کی انگلیاں خاصی موٹی تھیں لہٰذا وہ آدھے سے زیادہ سگریٹ نہ پی پاتے۔ باقی سگریٹ ان کے ملازموں کے کام آتے۔ وہ ایک سگریٹ سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا جلاتے اور یوں جب وہ کالم لکھنے بیٹھتے تو سگریٹ کی پوری ڈبیا پھونک ڈالتے۔

جب شہید گنج کی مسجد کا انہدام ہوا اور گورا فوج دِلّی دروازے میں پہنچ گئی، یہاں تک کہ روزنامہ "احسان" کے آس پاس بھی گورے بندوقیں لیے منڈلا رہے تھے تو مولانا کو سگریٹ کی طلب نے ستایا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میاں پٹھان، ذرا نیچے جاکر ایک سگریٹ کی ڈبیہ تو لا دو۔ میں نے کہا۔ میں یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔ آخر مولانا خود نیچے اترے۔ انھوں نے ابھی دروازہ کھولا ہی تھا کہ اتنے میں ایک گورا آگے بڑھا اور اس نے مولانا کے سر پہ اپنی بندوق کا کندہ دے مارا۔ مولانا نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے۔ اور پھر ہم سب نیچے اترے اور مولانا کو کھینچ کر اوپر لائے۔ ان پر پانی چھڑکا۔ روزنامہ "احسان" کے ایڈیٹر مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش مرحوم نے اپنی سلک کی قمیص کا ایک کونا پھاڑا اور اسے جلا کر مولانا کے زخم میں بھر کر اس پر کس کر اپنا رومال باندھ دیا۔ پھر ہسپتال میں اطلاع دی گئی۔ ایک ڈاکٹر اپنی کار لے کر آیا مولانا نے ڈاکٹر سے سب سے پہلا سوال یہ کیا: "ڈاکٹر صاحب! آپ کے پاس سگریٹ ہے؟" غرض کہ شہید گنج کے معرکے میں جو لوگ شہید ہوئے تھے، اپنے سر پر زخم کھا کر مولانا بھی ان میں شامل ہو گئے۔

کالم لکھنے کے سلسلے میں مولانا کے ہاتھ جہاں کوئی بات آئی وہ اسے لے اڑے۔ ایک مرتبہ جو لکھ دیا سو لکھ دیا۔ یوں بھی ہوتا کہ تھوڑا سا لکھ لیا۔ پھر بات چیت ہوئی۔ چائے کے دو چار گھونٹ پیے اور پھر شروع ہو گئے۔ وہ بولتے بھی کالم ہی تھے۔ اگر کوئی ان سے چھیڑ چھاڑ کر بیٹھتا

تو وہ تار کے جھاڑ کی طرح اُس سے اُلجھ جاتے۔ انھیں چھیڑنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا۔ تاثیر مرحوم سے کی مزے کی چھیڑ چھاڑ رہی۔ اگر وہ کسی کا ادب و احترام کرتے تھے تو یا تو وہ حضرت مولانا ظفر علی خان تھے اور یا سالک صاحب۔

مولانا کو ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اسی تنخواہ میں وہ پبلشر صاحب کی نصابی کتابوں کی بھی اصلاح کرتے۔ مولانا نے ایک ہفت روزہ بھی نکالا تھا جس کا نام "شیرازہ" تھا۔ یہ بڑا معیاری تھا لیکن چند دن چل کر یہ پرچہ بند ہو گیا۔

اتحاد پارٹی کے انتخابات کے موقع پر مولانا نے چند اشعار کہے تھے جو بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئے تھے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

تیرے گورے گورے گال اِتّحاد پارٹی
تیرے لمبے لمبے بال اِتّحاد پارٹی
تیرے یار نریندر ناتھ اتّحاد پارٹی
سارے ٹوڈی تیرے ساتھ اِتّحاد پارٹی

اگرچہ اس زمانے میں "زمیندار" کی اشاعت ہر اخبار سے زیادہ تھی لیکن مولانا چراغ حسن حسرت کی وجہ سے روزنامہ "احسان" کی اشاعت میں بھی برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اور پھر اس زمانے میں "احسان" میں حاجی لق لق بھی تھے جن کی تحریریں بڑی شگفتہ ہوتیں۔ اور پھر جب دوسری جنگ چھڑی تو پتا چلا کہ مولانا کو مجید ملک صاحب اپنے ساتھ کھینچ کر محکمۂ اطلاعات میں لے آئے۔ اور پھر ایک دن دلی میں مولانا کو فوجی لباس میں دیکھ کر کچھ عجب سا لگا۔ معلوم ہُوا مولانا فوج میں کپتان ہو گئے۔

ایک دن حسرت صاحب تانگے میں بیٹھ کر نئی دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر اپنے دوست احباب سے ملنے تشریف لائے۔ محمود نظامی مرحوم نے کہا: "حسرت صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ فوج میں کپتان ہیں اور تانگے میں آئے ہیں۔" حسرت صاحب نے کہا۔ "تو کیا ہوائی جہاز میں آتا؟"

محمود نظامی نے کہا: "اس کا طریقہ یہ ہے کہ سڑک پر جو اچھی گاڑی دکھائی دے، اسے ہاتھ کا اشارہ کر کے روک لیجیے اور پھر اس میں بیٹھ کر ڈرائیور سے کہیے کہ وہ آپ کو فلاں جگہ چھوڑ آئے۔" بات آئی گئی ہو گئی۔ تیسرے دن پھر حسرت صاحب تانگے میں ریڈیو اسٹیشن آئے تو نظامی صاحب نے کہا: "آج پھر تانگے میں آئے ہیں۔" تو حسرت صاحب نے کہا۔ "مادُہ نا (مولانا) آپ کا نسخہ اُلٹا ہو گیا۔ کل میں نے آپ کے نسخے پر عمل کیا تھا اور ایک جیپ روک لی۔"

نظامی صاحب نے کہا: "پھر کیا ہُوا؟"

"بس پھر کچھ نہ پوچھیے کہ کیا ہوا۔ وہ ایک بریگیڈیر کی جیپ تھی۔"
ایک مرتبہ حسرت صاحب نے مجید ملک صاحب سے کہا کہ "صاحب! ہم اس کپتانی سے درگزرے۔ اب جلد از جلد عہدے میں ترقی کروا دیجئے کیوں کہ میجر صاحبان کو ایڑی پر ایڑی مار کر سلیوٹ کرتے کرتے ہماری ایڑیاں گھس گئی ہیں۔" چناں چہ کچھ دنوں کے بعد کپتان حسرت میجر حسرت ہو گئے۔

جب حسرت صاحب اور کرمانی صاحب روزنامہ "امروز" سے علیحدہ ہوئے تو کرمانی صاحب صوبۂ سندھ کے محکمۂ اطلاعات میں ڈائرکٹر مقرر ہوئے اور حسرت صاحب بطور اسٹاف آرٹسٹ ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ حسرت صاحب سے دوسرے تیسرے ملاقات ہوتی۔ کچھ دنوں بعد ذوالفقار علی بخاری سے اُن کی اَن بَن ہو گئی اور حسرت صاحب بے روزگار ہو گئے۔ اور اب ان سے فردوس ہوٹل میں ہر شام ملاقات ہونے لگی۔ ایک صاحب نے جو نوواردِ تھے اور حسرت صاحب کے پرستاروں میں تھے، ان سے کہا "حسرت صاحب۔ میرا ارادہ ایک اخبار نکالنے کا ہے۔" حسرت صاحب نے کہا "ضرور نکالیے۔ رات کو لکھے پر چھاپا اور صبح ہوتے ہی دھو ڈالا۔"
اور پھر یہ ہوا کہ وفاقی محکمۂ تعلیم نے نیو یارک کے ایک پبلشنگ ہاؤس سلور برینڈ تھ کمپنی سے یہ طے کیا کہ وہ پاکستان کی نصابی کتابیں اور ان کتابوں میں صرف جغرافیے اور تاریخ کی کتابیں یہاں کے مصنفین سے لکھوا کر چھاپے۔ چناں چہ ان دونوں مضمونوں میں پہلے انگریزی میں یہ کتابیں لکھوائی گئیں، اور پھر اُردو میں ان کا ترجمہ کروایا گیا۔ ترجمہ کرنے والوں میں حسرت صاحب بھی تھے۔ ان سے جغرافیے کی کتابوں کا ترجمہ کروایا گیا اور جب یہ کتابیں بابائے اُردو کے پاس ریویو کے لیے ارسال کی گئیں تو انھوں نے یہ نوٹ لکھا کہ ان ترجموں پر کسی استاد سے نظرِ ثانی کروائی جائے کیوں کہ بہت سے جملے ایسے ہیں جو بچوں کی فہم سے بالاتر ہیں۔ پھر بعض اصطلاحوں کا ترجمہ بھی مشکل ہے۔ چناں چہ بدقسمتی سے یہ کتابیں ابوسعید قریشی کے ذریعے میرے پاس پہنچیں اور میں نے ڈرتے ڈرتے ان میں تبدیلیاں کیں۔ حسرت صاحب کو آخر تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے ترجمے پر نظرِ ثانی کس نے کی ہے۔ البتہ ایک ملاقات میں انھوں نے کہا: "ماڈلا! نہ جانے کس ملّانے مکتبی نے میرے رواں دواں جملے بدل ڈالے۔"

صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم

درمیانہ قد، گورے چٹّے، کشادہ پیشانی، سر پر ملائم سپید بال، کلین شیو، بھنویں ملی ہوئیں، کانوں پر بال، آنکھوں میں بچوں ایسی شرارت، مسکراتا ہوا چہرہ۔ خوب ہنستے، خوب ہنساتے۔ عاشق مزاج۔ دوستوں کے دوست۔ دشمنی کرنے سے واقف نہ تھے اور نہ دوستوں کے پیار سے اس کام کے لیے انھیں فرصت ملتی۔ عمر بھر پیار کرتے اور پیار کرواتے رہے۔ ایک بار ملو تو بار بار ملنے کو جی چاہتا۔ چھوٹوں کے بھی دوست، بڑوں کے بھی دوست۔ دل آئینے کی طرح صاف شفاف تھا۔ بے تکلف، بے تصنع۔ سفید براق کپڑے پہنتے۔ کھانے پینے اور کھلانے پلانے کا شوق تھا۔ خود اپنے ہاتھ سے بھی پکاتے تھے۔ پائے نہاری، روغن جوش، شب دیگ، کشمیری چائے اور قہوہ بڑے شوق سے پیتے بھی اور پلاتے۔ امرت سر کے باشندے تھے۔ فیروز طغرائی مرحوم کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور حکیم محمد حسین عرشی سے بھی مشورہ کرتے تھے۔ شروع شروع میں ان کا تخلص صوفی تھا لیکن عرشی صاحب کے مشورے سے انھوں نے تبسّم رکھ لیا اور یوں اسم بامسمّیٰ ہو گئے۔ صوفی صاحب بچپن سے شعر کہتے تھے۔

صوفی صاحب کے والد صوفی غلام رسول تاجر تھے اور اُن کی دلی خواہش تھی کہ ان کا لڑکا صرف اردو فارسی پڑھے اور اس کے بعد تجارت میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن صوفی کا مزاج تجارت سے لگا نہ کھاتا تھا۔ وہ بچپن سے شاعروں میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ اور جب وہ جوان ہوئے تو مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ یہ نوٹنکیوں کا زمانہ بھی تھا۔ صوفی صاحب چھپ چھپ کر اپنے دوستوں کے ساتھ ان کھیل تماشوں میں شرکت کرتے۔ پھر وہ موسیقی کے بھی رسیا تھے۔ صوفی صاحب نے امرت سر کے چرچ مشن اسکول سے انٹرنیس کا امتحان پاس کیا اور خالصہ کالج میں جو سکھوں کا کالج تھا، داخل ہو گئے۔

یوں تو صوفی صاحب فلسفے کے طالب علم تھے لیکن انھیں اردو اور فارسی زبانوں سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ یہاں انھوں نے فارسی پروفیسر مرتضیٰ حسین زیدی سے پڑھی اور پھر وہ فرصت نکال کر اس زمانے کے عربی کے مشہور عالم محمد عالم آسی کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اور ان سے عربی پڑھتے تھے۔ پھر صوفی صاحب لاہور چلے گئے اور ایف سی کالج سے فارسی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۲۱ء میں

گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ فارسی میں لیکچرار مقرر ہوئے اور اسی شعبے میں وہ پروفیسر اور صدر شعبہ ہو کر ریٹائر ہوئے۔ صوفی صاحب کے پروفیسر بخاری سے بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اور پھر ۱۹۵۴ء میں وہ بنگالیوں کو اُردو پڑھانے لگے۔ ایک بار صوفی صاحب نے مجھ سے از راہِ مذاق کہا کہ بنگالیوں کو اُردو پڑھانے سے بنگالیوں کو تو تھوڑی تھوڑی اُردو آگئی لیکن میں اُردو بھول گیا۔ اس کے بعد صوفی صاحب ریڈیو پاکستان سے بحیثیت سٹاف آرٹسٹ وابستہ ہو گئے۔ جہاں وہ گانے والوں کے لیے شعرا کے کلام کا انتخاب کرتے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اُنھوں نے پنجابی اور اُردو میں قومی نغمے لکھے جو بہت مقبول ہوئے ملکۂ ترنم نورجہاں اور فریدہ خانم کی آواز انھیں بہت پسند تھی چناں چہ اُن کے بیشتر نغمے ملکۂ ترنم نے گائے۔ صوفی صاحب نے نورجہاں کی فرمائش پر بھی نغمے لکھے۔ صوفی صاحب کے گیتوں اور ملکۂ ترنم کی آواز نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں قوم کا حوصلہ بڑھایا۔

صوفی صاحب نے بچوں کے لیے بھی بے مثال گیت لکھے جو بے حد مقبول ہوئے۔ صوفی صاحب کی شاعری پر نظیری اور خسرو کی چھاپ تھی کیوں کہ انھی کا کلام زیادہ تر ان کے زیرِ مطالعہ رہا۔ صوفی صاحب نے خسرو کی سو غزلوں کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوا۔ صوفی صاحب علامہ اقبال کی صحبتوں میں اُٹھنے بیٹھنے والوں میں تھے شعر و شاعری کے علاوہ دینی مسائل پر بھی اُن کی علامہ سے باتیں ہوتیں۔

صوفی صاحب بڑے حاضر دماغ اور بذلہ سنج تھے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے ذوالفقار علی بخاری سے کہا۔ ذرا میرے ایک گیت کا مکھڑا سنو۔ بخاری صاحب نے کہا۔ واقعی صوفی تمھارا مکھڑا جو کبھی دیکھنے دکھانے کا تھا، اب سنانے کا ہو گیا ہے۔ جواباً کہا۔ تم ذرا اپنی شکل دیکھو۔ یوں لگتا ہے جیسے سفید تولیہ سر پر باندھے پھر رہے ہو۔ صوفی صاحب نے مجھ سے کہا۔ آج شام میرے یہاں آؤ اور میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ ظہیر کاشمیری قریب ہی بیٹھا تھا۔ اُس نے کہا صوفی صاحب آپ اسے غلط سمجھے۔ یہ صرف کھانے والا ہے، پینے والا نہیں ہے۔

ریڈیو پاکستان میں ایک نوجوان گانے والی صوفی صاحب سے کسی کی شکایت کرتے کرتے کہنے لگی اب دیکھیے نا صوفی صاحب آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ صوفی صاحب نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ یار اس بزرگی سے ہم پریشان ہو گئے۔ اس نے ہمارا نرخ بھاؤ کم کر دیا ہے۔ صوفی صاحب سر کے بالوں سے تو بوڑھے لگتے تھے لیکن ان کا دل مرتے وقت تک جوان رہا۔ وہ خود بھی خوش رہتے اور دوسروں میں بھی خوشیاں بانٹتے۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر سارے دُکھ درد دُور ہو جاتے۔ صوفی صاحب بڑے ہمدرد انسان تھے۔ پاکستان میں بڑے بڑے عہدوں پر ان کے شاگرد فائز تھے۔ ضرورت مند وقت بے وقت آتے اور صوفی صاحب سے سفارش کروانے کے لیے انھیں اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے۔ صوفی صاحب بڑے کھرے اور سچے مسلمان اور عاشقِ رسول ؐ تھے۔ ایک دِن خبر آئی کہ صوفی صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ صوفی صاحب کے چاہنے والوں کا کوئی حساب نہیں تھا۔ گھر گھر صفِ ماتم بچھ گئی۔

سیّد ہاشمی فرید آبادیؒ

احمد شفیع نیّر حضرت امیر مینائیؒ کے شاگرد تھے۔ رنگ اُن کی شاعری کا کچھ ایسا ہی تھا۔ صُوفی تھے۔ سادات کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب علاؤالدین خان علائی کے داماد تھے۔ احمد شفیع مرحوم کے تین صاحب زادے تھے۔ تینوں ادیب اور شاعر تھے۔ ان تینوں بھائیوں میں سب سے زیادہ نامور سیّد ہاشمی فرید آبادی تھے۔ ان کے ایک بھائی ابوتمیم فرید آبادی تھے جنھوں نے بچّوں کے ادب کے لیے اپنی ساری زندگی تج دی تھی۔ اور بچّوں کی زبان میں بچّوں کی سمجھ کے مطابق بڑے کام کی کہانیاں لکھیں۔ دُوسرے بھائی سیّد مُطلبی فرید آبادی ہیں جو بقیدِ حیات ہیں لیکن بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ حال ہی میں ان سے لاہور میں ملاقات ہُوئی۔ انھوں نے مزدُوروں کے لیے بہت سے گیت لکھے۔ "ہیا ہیا" ان کا ایک ایسا مقبُول گیت ہے جو برِّصغیر کے ہر حصّے میں گایا جاتا ہے اور کارخانوں میں مزدُور اپنی تکان دُور کرنے اور تازہ دم رہنے کے لیے گایا کرتے ہیں۔

مُطلبی فرید آبادی صاحب کے ایسے ہی گیتوں کی ایک کتاب "ہیا ہیا" کے نام سے چھپ چکی ہے۔ پنہاری اور کسان دہقت نے بھی بہت مقبولیت حاصِل کی۔

سیّد ہاشمی فرید آبادی جنوری ۱۸۹۰ء میں پیدا ہُوئے۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ اسکول کے زمانے سے ان کی شاعری کا آغاز ہُوا۔ بالعموم نظمیں کہتے تھے۔ افسوس تو یہ ہے کہ جتنی اچھی نظمیں ہاشمی صاحب نے کہی ہیں، اتنی شہرت انھیں حاصِل نہیں ہُوئی۔ ان کی نظمیں زمیندار کے سرورق پر شائع ہوتیں، اور سارے مُلک میں آگ لگا دیتیں۔ اُن کی ایک نظم "چل بلقان چل" نے تو قیامت بپا کر دی تھی۔ ہاشمی صاحب کی یہ شہرۂ آفاق نظمیں اب ہمیں کہیں نہیں ملتیں۔ ان نظموں کے چند اشعار جو سیّد مُطلبی صاحب قبلہ کے حافظے میں محفوظ تھے جو میں نے اُن سے اپنے اس مضمُون کے لیے حاصِل کر لیے۔ "چل بلقان چل" کا ذکر چودھری خلیق الزمان صاحب نے بھی اپنی کتاب "شاہراہِ پاکستان" میں کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ جنگِ بلقان کے دوران اس نظم نے برِّصغیر کے مسلمانوں میں جہاد کا ولولہ اور شوقِ شہادت کا جذبہ پیدا کیا۔

اب آپ یہ نظم سُنیے:

تابکے رُخِ زرد، دیدہ خونچکاں، دِل مضمحل
تابکے سازِ جنوں مشتاقِ آہنگِ عمل
شمّہ غیرت کا ہے گر باقی تو چل بلقان چل

چھوڑ دے بے رُوح لوگوں کے لیے یہ اعتدال
مشکلیں کیسی، کہاں کی روک، کیا فکرِ مآل
موت حاصل کر کہ جو اس زندگی کا ہے کمال
لُطف مرنے کا اگر چاہے تو چل بلقان چل

تابکے یکساں روی، اب سُن پیامِ انقلاب
چھوڑ بے رنگی سکوں کی، ہو رہینِ اضطراب
وہ بھی کیا مرنا کہ خود فطرت تجھے دے دے جواب
زندگی کا لطف گر چاہے تو چل بلقان چل

کان پور کے سنگین واقعے پر ہاشمی صاحب نے قلم سے تلوار کا کام لیا چنانچہ جب ان کی
کان پور کی نظم کا شہرہ ہوا تو فرنگی حکمرانوں کے کہنے پر انھیں ایم اے او کالج علی گڑھ سے نکال دیا گیا یہ نظم
بھی سُنتے چلیے جس سے فرنگی حکمرانوں کی نخوت و انانیت کو سخت ٹھیس پہنچی تھی۔

سانحۂ کان پور (گورنمنٹ سے خطاب)

اے قہرمانِ عارضی اے عاملِ مغرور دکش
شیدائی نصرانیت اور مسندِ بطریں نشیں

کر فخر اپنی قوم پر عالم کو جس سے ننگ ہے
انساں کی صورت دے کے ہے شرمندہ رب العالمیں

یہ خوں کے پیاسے بھیڑیے چھوٹے گئے ان پر کہ تھا
اِک بے کس و بے کارواں یعنی گروہِ ماتمیں

آنکھوں میں جن کے اشک تھے ہونٹوں پہ جن کے آہ تھی
ٹوٹے ہوئے تھے جن کے دل از غم سے تھی تیرہ جبیں

تذلیلِ دینِ حق پہ جو آنسو بہانے آئے تھے
یا کر رہے تھے الوداع اپنی حمیت کے تئیں

یہ منہدم مسجد نہ تھی، تابوت تھا اسلام کا
اور سیکڑوں ہی عبرتیں اس ڈھیر میں اینٹوں کے تھیں

یکبارگی بدلا سماں اُٹھی صدا سے الاماں
اِسلامیوں پر گولیاں ہر سمت سے پڑنے لگیں

کچھ سانپ ڈسنے کے لیے آگے بڑھے بل مارتے
آنکھوں میں جن کی مشتعل تھے شعلہ ہائے خشمگیں

جس طرح بازو میں کوئی بچہ سلائیں گاڑ دے
ان ظالموں نے برچھیاں اجسام میں یوں بھونک دیں

کھرچے گئے سنگین کی نوکوں سے وہ سینے کہ تھا
منقوش جاں تا نامِ خدا و نامِ ختم المرسلیں

نصرانیت غالب ہوئی اِسلام کا سر جھک گیا

اس نظم پر جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، ہاشمی صاحب کو ایم اے او کالج سے فارغ کر دیا گیا اور وہ بی اے کی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔

اب ہاشمی صاحب کھل کر سیاست میں حصہ لینے لگے۔ یوں وہ پبلک پلیٹ فارم پر نہیں آئے لیکن اس زمانے کے قومی شاعروں میں سرِ فہرست ان کا نام آتا تھا۔ وہ مولانا حسرت موہانی کے دستِ راست تھے۔ سودیشی تحریک میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ اسی زمانے میں آکسفورڈ سے تعلیم پاکر مولانا محمد علی جوہر دلی آئے۔ انھوں نے دلی سے کامریڈ اور ہمدرد نکالا۔ مولانا محمد علی کی شخصیت پر فرنگی تہذیب کی چھاپ تھی۔ وہ بدیسی کارخانوں کا بنا ہوا کپڑا پہنتے تھے۔ سوٹ بوٹ اور ٹائی کالر میں نظر آتے تھے۔ یوں جنگِ آزادی میں وہ بھی شریک ہو گئے تھے۔ لیکن وہ سودیشی تحریک کے خلاف تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یورپ کے کارخانوں کے مال کا بائیکاٹ کرنے سے یہ بہتر ہے کہ ان کارخانوں کے مال کے مقابلے میں مال پیدا کیا جائے۔ مولانا محمد علی جوہر کی یہ روش ہاشمی صاحب کو پسند نہیں آئی اور انھوں نے یہ نظم لکھی:

تجھے کیوں کر ہنسی اس زاغ پر آئی کہ پھرتا تھا
بہت اچھرا ہوا شیخی سے پہنے ہنس کی اُترن

کہ تو ہندی مسلمان ہے تجھے خود ہی نہیں بھاتا
نہ اپنے دیس کا کرتا، نہ اپنے ملک کی اچکن

تجھے دیکھا ہے موٹا سوٹ لادے گرم موسم میں
پھنسی دیکھی ہے اکثر ایک پٹے میں تری گردن

تجھے دیکھا ہے اترانے بہت اک لال ٹوپی پر
بھلا انصاف سے کہیو یہ بچپن ہے کہ اوچھا پن

بھلا مفلوک ہندوستان و یورپ کی لڑائی کیا
کہاں کرگا، کہاں کرنی، کہاں چھکڑا کہاں انجن

اور ان ملکوں میں بھی اب تیزہ دستی مال والوں کی
غریب اور مفلسوں پر ہو رہی ہے دن بہ دن روشن

مگر اے مادرِ ہندوستاں کے بے خبر بچو!
تمھیں کیا ان کے جھگڑوں سے تمھیں کیوں ان کا ہو بن

ہم اپنی حاجتیں دیکھیں تم اپنی حالتیں سمجھو
سنبھل جاؤ ابھی ورنہ یہ ہیں افتاد کے لچھن

تمھارا مجھ کو دھڑکا ہے کہیں قسمت کی خوبی سے
نہ ہو بعد اس غشی کے آخری احساس جان کندن

ہاشمی صاحب کی شخصیت بڑی من موہنی تھی۔ اُن کی باتیں دلوں میں گھر کر لیتی تھیں۔ وہ بڑے خوش رو اور خوش مذاق تھے۔ وہ باتیں کرتے تو دل چاہتا کہ یہ سلسلہ ختم نہ ہو۔ تاریخ عالم پر ان کی گہری نظر تھی عربی فارسی پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ شکسپیئر کے سیکڑوں جملے انھیں یاد تھے۔ دورانِ گفتگو اکثر برمحل شعر پڑھتے تھے۔ اُن کی تحریر بڑی شگفتہ اور رسیلی ہے۔ انھوں نے سیکڑوں مضامین اور نظمیں لکھیں۔ کچھ کچھ محفوظ ہیں اور کچھ ضائع ہو گئیں۔ ان کی نظم "ناگن" بہت مشہور ہوئی۔ یہ نظم ہاشمی صاحب نے آنند بھون میں پنڈت جواہر لال نہرو کی فرمائش پر سنائی تھی۔ وہاں مسز سروجنی نائیڈو بھی موجود تھیں۔ سروجنی نائیڈو یہ نظم سن کر جھوم اٹھیں اور ہاشمی صاحب سے انھوں نے کہا کہ وہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنے

کی اجازت دیں۔ لیکن پھر نہ جانے کس نے سروجنی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ ہاشمی صاحب نے یہ نظم انھی پر لکھی ہے۔ بہت دنوں تک دونوں ایک دوسرے سے رُوٹھے رہے۔ ہاشمی صاحب کو ان کے دوستوں نے یہ سمجھایا کہ وہ سروجنی سے مل کر یہ غلط فہمی دُور کردیں لیکن ہاشمی صاحب نے کہا کہ اگر سروجنی یہ سمجھتی ہے کہ میں نے یہ نظم اُس پر لکھی ہے تو اُسے سمجھنے دو۔ اس میں بھی بڑا مزا ہے۔

ہاشمی صاحب بڑی مدت تک دکن میں رہے جہاں ان کے بہت سے عزیز و اقارب بھی تھے۔ وہ دارالترجمہ میں ملازم تھے۔ انھوں نے پلوٹارک کی تصنیف کا بہت عمدہ ترجمہ کیا جو مشاہیر یونان و روما کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی اور بھی تصنیفات ہیں جو انجمن ترقی اُردو سے شائع ہو چکی ہیں ۔ اُن کی "تاریخ پاکستان و بھارت" بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ہاشمی صاحب ادھر اُدھر کی باتیں یکجا کرنے والوں میں نہیں تھے۔ ان کے مضامین اور ان کی تصانیف میں ان کی اپنی رائے اور ان کے اپنے خیالات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ وہ ایک مورخ کی فکر بھی رکھتے ہیں۔ وہ نقاد بھی ہیں اور محقق بھی۔ پھر ان کی موہنی زبان سے خشک سے خشک مضامین میں جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہاشمی صاحب صوفی تھے اور مجددی نقش بندی سلسلے میں بیعت تھے۔ اگرچہ وہ صاحبِ اجازت تھے لیکن انھوں نے پیری مریدی نہیں کی۔ اُن کی شخصیت میں سب سے بڑی بات اُن کی بے پایاں محبت اور ان کا خلوص تھا۔ وہ بڑے وضع دار انسان تھے۔ اپنے دوستوں اور ملنے والوں پر جان چھڑکتے تھے۔ ورق جیسا اُجلا لباس پہنتے۔ کم کھاتے اور عمدہ کھاتے۔ حقے کے رسیا تھے۔ جب ہاشمی صاحب کی میراث تقسیم ہوئی تو اُن کا ہر وقت کا رفیق حقہ میرے حصے میں آیا جسے ان کی صاحب زادی عائشہ بیگم سلمہا نے مجھ تک پہنچایا۔

ہاشمی صاحب مدتوں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ انجمن ترقی اردو کے دفتر میں رہے ان دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔ شام کو دونوں بیٹھ جاتے اور ہر موضوع پر گفتگو ہوتی مجھے بھی اس صحبت میں بارہا بار نصیب ہوا۔ کتابوں سے وہ چیز نہیں ملتی جو ایسے بزرگوں کی رفاقت میں مل جاتی ہے۔

اور پھر ایک زمانہ وہ آیا کہ لوگوں نے ان دونوں قدیم دوستوں کے درمیان تفرقہ ڈال دیا۔ مولوی صاحب کانوں کے کچے تھے۔ وہ اکڑے رہے لیکن ہاشمی صاحب اس بے وجہ اور بے سبب خفگی سے گھلتے رہے اور جب مولوی صاحب دُشمنوں کے نرغے میں آگئے تو ہاشمی صاحب نے اپنی دوستی کا ثبوت دیا۔ ہاشمی صاحب بہت بڑے پیمانے پر مولوی صاحب کی ۹۰ ویں سالگرہ منانا چاہتے تھے۔ اس سالگرہ کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی اُس میں یہ ناچیز، جناب جلیل قدوائی، شجاع احمد زیبا، آمنہ بیگم ممتاز، ذکا اللہ خان، یوسف بخاری اور دو چار اشخاص اور بھی شامل تھے۔ ہم نے مولوی صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے۔ ہندوستان سے بھی بے شمار مضامین موصول ہوئے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ کتاب چھپنے نہ پائی۔ ویسے جلیل قدوائی صاحب نے بابائے اردو کے خطوط کو ایک کتاب کی صورت میں یکجا کر دیا ہے۔ اس میں میرے نام بھی مولوی

صاحب کے خطوط شامل ہیں۔

ہاشمی صاحب کئی علمی وادبی انجمنوں کے صدر رہے۔ انھیں لکھنے پڑھنے سے فرصت ملتی تو دوست احباب جمع ہوتے۔ چائے چلتی، حقہ چلتا۔ مزے مزے کی علمی وادبی باتیں ہوتیں۔ وہ دوسرے تیسرے دن یا تو مجھے اپنے یہاں بلوا لیتے اور یا خود تشریف لے آتے۔ پھر وہ کراچی سے لاہور آگئے۔ یہاں ان کے بیوی بچے تھے۔ وہ یہاں آکر اب کے جو بیمار پڑے تو پھر بستر سے نہ اٹھ سکے۔ وہ بے پناہ غیرت مند انسان تھے۔ آخری وقت میں ان کے لبوں پر اللہ کا نام اور محمدؐ کا کلمہ تھا۔ زندگی مغلوں کی طرح گزاری۔ انجام سادات کا سا ہوا۔

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

درمیانہ قد، دُہرا جسم، بڑی بڑی آنکھیں، گھنیری مونچھیں دونوں کونوں سے ترشی ہوئی، آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ، چوڑی موری کا پاجامہ، پاؤں میں پمپ یا گرگابی، بڑی باڑ کی رومی ٹوپی، آواز میں گھن گرج، جوناگڑھ کے رئیسوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ دربارِ سرکار میں بڑا احترام تھا۔ علی گڑھ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ دہلی میں طب پڑھی لیکن سند حاصل کرنے سے پہلے چلے آئے۔ انگلستان کے رسالوں میں ان کے انگریزی زبان کے مضمون چھپتے تھے۔ انگریزی زبان میں شاعری بھی کرتے تھے۔ قاضی صاحب نے خطاطی ایرانی شہزادے آقائے کمال الدین سنجر سے سیکھی اور فارسی بھی انھی سے پڑھی۔ جوناگڑھ کی بلدیہ کے چیرمین تھے اور جوناگڑھ کالج کی مجلسِ انتظامیہ کے صدر بھی تھے۔ گجرات میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر بھی تھے۔ اللہ کا دیا اتنا تھا کہ ایک وقت میں کئی کئی مہمان ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتے۔ ان کے مہمان خانے میں آئے دن دُور دراز سے مہمان آتے۔ اور مہینوں قیام کرتے۔ ان میں علما بھی ہوتے اور اہلِ فن بھی۔ شاعر اور ادیب بھی۔ جو ضرورت مند آتا اپنی مُراد پاتا۔ علی گڑھ کے لیے خود بھی دل کھول کر چندہ دیتے اور دُوسروں سے بھی دِلواتے۔ ندوہ دار المصنفین اور انجمن ترقیِ اردو کے مالی سرپرستوں کی فہرست میں سرِفہرست قاضی صاحب کا نام آتا تھا۔

قاضی صاحب عربی اور فارسی علوم میں دستگاہ رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی شعروادب پر اُن کی بڑی گہری نظر تھی۔ آپ عربی یا فارسی زبان کے کسی شاعر کا شعر پڑھ دیجیے اور پھر پُوری غزل یا نظم قاضی صاحب سے سُن لیجیے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان زبانوں کے ہر ادیب اور شاعر کی پُوری سوانح حیات سن وار اور تاریخ وار قاضی صاحب سے سُن لیجیے۔ یہی قدرت قاضی صاحب کو انگریزی ادب پر حاصل تھی جب خلافت کی تحریک چلی تھی اُس زمانے میں قاضی صاحب کے سیاسی و ادبی مضامین انگریزی زبان کے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہُوا کرتے تھے۔ فارسی، اُردو اور عربی میں اشعار بھی کہے۔

یُوں تو اسلامی تاریخ قاضی صاحب کا خاص مضمون تھا لیکن تواریخ عالم اور فلسفۂ تاریخ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ اسلامی تاریخ کے تو وہ گویا حافظ تھے جس مُلک میں کوئی نئی کتاب علمی اُدبی یا تنقید و تحقیق سے

ولفق شائع ہوتی یا کوئی موّرخ نئی کتاب لکھتا تو قاضی صاحب کو ضرور خبر ہو جاتی۔ دُنیا کے تمام اشاعتی اداروں اور کتُب خانوں سے اُن کی خط و کتابت تھی۔ وہ مولانا سلیمان ندوی کے دوست تھے۔ خواجہ کمال الدین جب بھی آتے تو اُن کے یہاں قیام فرماتے۔

قاضی صاحب نے مُسلمان مفکّروں، موُجدوں اور سائنس دانوں پر سب سے پہلے کام کیا ہے۔ ان کے حالات اور ان کے کارنامے عربی کی مختلف کتابوں میں ملتے ہیں۔ قاضی صاحب نے انھیں تمام کتابوں سے نکال کر یک جا کیا اور اپنے تبصروں کے ساتھ مضامین کی صوُرت میں مرتّب کیا اور مجھے فخر ہے کہ یہ سارے مضامین میں نے قاضی صاحب سے فرمائش کر کے لکھوائے اور یہ ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئے۔ افسوس ہے کہ ان میں سے بہت سے تحقیقی مقالے ضائع ہو گئے۔ الکندی، جابر ابن حیان، ابن الہیثم، حنین بن اسحٰق، الحوقل، رازی، خوارزمی اور ابن بیطار پر میں نے قاضی صاحب، جناب ممتاز حسن اور پیر حسام الدین راشدی صاحب سے مقالے لکھوائے تھے، اور یہ مضامین ان تینوں بزرگوں نے باہمی مشورے اور بے شمار کتابوں کے مطالعے کے بعد قلم بند کیے تھے۔ قاضی صاحب نے ایک عرب موسیقار زریاب پر ایک پُرمغز مقالہ سپردِ قلم کیا۔ اور عربوں کی موسیقی پر ایک علیٰحدہ مضموُن میں سیر حاصل تبصرہ کیا۔ برِصغیر کی موسیقی پر بھی قاضی صاحب نے بے پناہ معلومات فراہم کیں۔ اس سلسلے میں شاہد احمد دہلوی نے بھی قاضی صاحب سے استفادہ کیا۔

جونا گڑھ میں قاضی صاحب کا بہت بڑا کتُب خانہ تھا۔ جب وہ پاکستان تشریف لائے تو صرف ایک چوتھائی کتابیں بڑی مشکل سے اپنے ساتھ لا سکے۔ قاضی صاحب نے کراچی میں اس کتُب خانے کے لیے ایک علیحدہ مکان کرائے پر لیا تھا۔ دُنیا کا شاید ہی کوئی علم ایسا ہو جس پر قاضی صاحب کی نظر نہ ہو اور وہ اس پر پورے اعتماد کے ساتھ بات نہ کر سکیں۔ ایک مرتبہ میں انھیں ان کی نشری تقریر کے وقت سے کچھ پہلے اپنے ساتھ ریڈیو پاکستان لے آیا۔ اسٹوڈیو میں مشہور ستار نواز کبیر خان ریاض کر رہے تھے۔ قاضی صاحب نے بڑے اطمینان اور بڑے ذوق سے ستار سُنا۔ وہ داد کی جگہ داد دے رہے تھے۔ پھر انھوں نے کبیر خان کو کچھ مشورہ دیا۔ اور اس راگ کے بارے میں جو کبیر خان بجا رہا تھا، کبیر خان سے کچھ سوالات بھی کیے۔ جب قاضی صاحب اسٹوڈیو سے نکلے تو کبیر خان نے مجھ سے پوچھا: "کیا یہ کوئی نئے میوزک کمپوزر ہیں؟" میں نے کہا: "کبیر خان تمھارے خیال میں یہ کیسے میوزک کمپوزر رہیں گے؟" کبیر خان نے کہا۔ "آدمی بڑے گُنی معلوم ہوتے ہیں۔"

قاضی صاحب نے ایرانی شعرا کے دواوین بھی مرتّب کیے جن میں سے ایک دیوان ایران میں شائع ہوُا۔ ڈاکٹر یاور عباس صاحب بابائے اُردو کی نگرانی میں اُردو میڈیکل کالج کھولنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس کمیٹی میں میں بھی شامل تھا۔ شام کے وقت ڈاکٹر یاور عباس کے مطب میں ایک

عمل جاری رہتی تھی۔ اس میں ظریف جبل پوری مرحوم، سید محمد جعفری، ڈاکٹر عبدالرحمٰن ملک سرجن ڈاؤ و عباس شاہد بھائی اور یہ ناچیز شرکت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ڈاکٹر یاور عباس صاحب نے بات کی اور پھر ڈاکٹر صاحبان سے کہا۔ ذرا میرے ساتھ چلیے۔ قاضی احمد میاں اختر کے گردے میں درد اٹھا ہے۔ میں بھی ڈاکٹروں کے ساتھ ہو لیا۔ ان میں بیورو آف لیبارٹریز کے ڈائرکٹر میاں محمد صدیق بھی تھے۔ ڈاکٹروں نے قاضی صاحب کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹر یاور عباس نے نسخہ لکھا۔ ایک انجکشن لگایا۔ اب قاضی صاحب انجکشن کو ہوئے کر چلے تو سرجری کی پوری تاریخ بیان کر ڈالی۔ کس نے کب کس عضو کا پہلا اپریشن کیا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی سرجری میں کیا فرق ہے۔ جب ہم قاضی صاحب کو خدا حافظ کہہ کر نیچے اُترے تو میاں محمد صدیق نے ڈاکٹر یاور عباس سے پوچھا۔ "کیا یہ سرجن ہیں؟"

قاضی صاحب مسلم لیگ کے سیکرٹری تھے۔ مرحوم اسمٰعیل چندریگر کے دوست تھے۔ چندریگر صاحب نے پاکستان سے ٹکٹ بھجوایا اور یوں قاضی صاحب پاکستان آئے۔

بولٹن مارکیٹ کے قریب ایک عمارت کی چھٹی منزل میں ایک فلیٹ کرائے پر لیا۔ قاضی صاحب کی آدھی زندگی، جسے وہ بچا کر پاکستان لائے تھے، اس فلیٹ پر چڑھنے اُترنے میں ختم ہو گئی اور باقی آدھی نامساعد حالات اور بے قدری کی نذر ہو گئی۔ شروع شروع میں چندریگر صاحب نے انھیں ایک ہزار روپے پر اکاؤنٹنٹ مقرر کروا دیا تھا۔ کہاں قاضی صاحب اور کہاں حساب کتاب۔ ایک دن بابائے اُردو قاضی صاحب کے یہاں آئے اور ان سے یہ کہا کہ انجمن پر آپ کے مالی اور قلمی احسانات تو اتنے ہیں کہ انھیں گنوایا نہیں جا سکتا۔ اگر آپ انجمن کے کاموں میں مجھ سے تعاون کریں تو میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ چنانچہ ساڑھے چار سو روپے ماہوار تنخواہ پر قاضی کا انجمن میں تقرر ہوا اور پھر یہاں قاضی صاحب کے ساتھ کیا سلوک ہوا، یہ بڑی دردناک داستان ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس میں مولوی عبدالحق صاحب کا ہاتھ نہیں تھا۔ حفیظ ہوشیارپوری مرحوم نے غیر ملکی نشریات کے شعبے میں عربی ادب میں قاضی صاحب سے عربی میں ادبی مضامین لکھوا کر انھیں نشر کرنے کا ایک سلسلہ نکالا تھا۔ ہوم سروس میں بھی اُن کی تقریریں ہوتی رہتی تھیں۔

پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر ممتاز حسن اور حفیظ ہوشیارپوری اور یہ ناچیز دوسرے تیسرے دن وقت نکال کر قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے استفادہ کرتے۔ میری حیثیت تو ایک طفلِ مکتب کی تھی، لیکن پیر صاحب اور ممتاز حسن صاحب اور حفیظ ہوشیارپوری خود بھی بڑے عالم تھے۔ علومِ شرقیہ اور غربیہ کے تینوں کو لمیں جب اپنی اپنی علمی و ادبی دُنیاؤں کی دریافت کا احوال بیان کرتے تو میں متحیر ہو جاتا اور یہ سوچتا کہ ہزار برس میں اتنی سیاحت علم و ادب کی دُنیا کی نہیں ہو سکتی جتنی ان بزرگوں نے تھوڑی سی زندگی میں کر لی ہے۔

قاضی صاحب ان کولمبسوں میں ایسے کولمبس تھے جنھوں نے اپنی دُنیا کے علاوہ ان کولمبسوں کی دُنیا بھی دیکھی تھی۔ یہ ان کی دیکھی ہوئی دُنیا کے اَن دیکھے تاریک علاقوں پر بھی روشنی ڈالتے۔

اور پھر یہ ہُوا کہ پیر حسّام الدین راشدی، ڈاکٹر ممتاز حسن اور ڈاکٹر بلوچ نے سندھ یونیورسٹی میں قاضی صاحب کو اسلامی تاریخ کے شعبے کا صدر مقرر کروا دیا اور قاضی صاحب حیدر آباد چلے گئے۔ اس عرصے میں میری ان سے بہت کم ملاقاتیں ہوئیں جن کا انھیں بھی رنج تھا اور مجھے بھی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ قاضی صاحب مجھ سے ملنے میرے گھر آرہے تھے کہ راستے میں ایک حادثہ ہو گیا، اور ان کی ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ جب مجھے یہ علم ہُوا تو میں قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ مجھے دیکھ کر وہ آبدیدہ ہو گئے اور کہنے لگے مجھے اپنے احباب سے دُور رہنے کی وجہ سے بڑی تکلیف ہے۔ پھر قاضی صاحب کا ایک خط حیدرآباد سے آیا۔ ایک صاحب سے انھیں کام تھا۔ مجھے یہ لکھا کہ چوں کہ تمھاری اُن سے دوستی ہے لہٰذا یہ کام کروا دو۔ کام بہت معمولی تھا، سی ٹی کالج میں ایک صاحب زادے کو داخلہ دلوانا تھا۔ جب یہ کام نہیں ہوا تو قاضی صاحب نے ایک بڑا پیارا خط لکھا۔ یہ ان کا آخری خط تھا۔ اور مضمون اس کا یہ تھا۔ "انسان کو پہچاننے میں تم ہمیشہ ٹھوکر کھاتے رہے ہو۔ تم نے کتنے ہی دھوکے کھائے، نہ جانے کس طرح اس مکر و فریب کی دُنیا میں زندگی گزار دو گے"۔

اور پھر ایک دن یہ خبر آئی کہ قاضی صاحب حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مولوی الطاف علی بریلوی صاحب نے قاضی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا ہے اور ان کے خطوط اور کتابیں بھی چھاپی ہیں لیکن قاضی صاحب تو ایک سمندر تھے اور سمندر پر پُل کون باندھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر تاثیر

درمیانہ قد، دہرا بدن، سپید رنگت، بڑا سر، ابھری ہوئی پیشانی، ستواں ناک، دانتوں میں کالی ریکھیں، آواز میں کھنک، ہزاروں میں بیٹھے ہوں تو دور سے اپنی مخصوص آواز اور قہقہوں سے پہچانے جاتے آنکھیں روشن اور بڑی بڑی اور پھر ان آنکھوں میں بچوں کی سی معصوم شرارت، مرحوم کبھی نچلے نہیں بیٹھ سکتے تھے کبھی ایسے پھڈا بھی آ سے۔ البتہ دھول دھپے کی نوبت نہ آنے دیتے اور آنچ تو صاف بچ نکلتے۔

جب امرتسر میں انجمن اسلامیہ۔ نے ایم اے او انٹرمیڈیٹ کالج کی داغ بیل ڈالی تو ایم اے او ہائی سکول کے نامی گرامی اینگلو انڈین ہیڈ ماسٹر مسٹر مرکینڈ کو ان کی دیرینہ اور اعلیٰ خدمات کے اعتراف کے طور پر اس کالج کا پہلا پرنسپل بنا یا گیا۔ پھر مسٹر مرکینڈ کے ریٹائر ہونے کے بعد انجمن نے اس کالج کو ڈگری کالج بنانے کا فیصلہ کیا۔ ایم اے او ڈگری کالج کی کلاسیں موسم گرما کی تعطیلات کے بعد کھلنے والی تھیں۔ ایک دن شہر میں ایک قد آدم اشتہار نظر سے گذرا جس میں ڈگری کالج کے افتتاح کا اعلان کیا گیا تھا۔ اور ڈگری کالج کے اساتذہ کے نام کے علاوہ ان کی ڈگریاں بھی اس پوسٹر میں لکھی گئی تھیں۔ ان میں فیض احمد فیض (ایم اے انگلش) مسٹر کرامت حسین (ایم اے فلاسفی) کے نام بھی شامل تھے۔ اور سب سے اوپر یہ لکھا تھا کہ ملک کے مایۂ ناز ادیب اور شاعر ایم ڈی تاثیر جو برصغیر میں کیمبرج یونیورسٹی کے انگریزی ادب میں واحد پی ایچ ڈی ہیں، اس کالج کے پرنسپل ہوں گے۔ گویا ڈاکٹر تاثیر ایم اے او کالج میں اپنی پوری ٹیم کے ساتھ وارد ہوتے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل صاحبزادہ محمود الظفر خان تاثیر سے پہلے مسٹر مرکینڈ کی پرنسپلی کے زمانے میں اس کالج کے وائس پرنسپل تھے۔ وہ تاریخ کے استاد تھے اور آکسفورڈ کے گریجوایٹ تھے۔ ان کی اہلیہ مشہور کمیونسٹ لیڈر اور افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں تھیں۔ اور ان دونوں کا گھر پنجاب کے ترقی پسندوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ صاحبزادہ صاحب خود بھی بہت قابل تھے۔ لیکن وہ اپنی زندگی میں اپنی بیوی کے گرہن سے نہیں نکلے۔ رشید جہاں کا گھر ہو یا ان کا مطب ہر جگہ ترقی پسند ادیبوں کا جمگھٹا رہتا۔

"تاثیر اور ان کے رفقا کی آمد آمد سے امرتسر جو ایک خالص تجارتی شہر تھا، ادبی زندگی کا محور بن گیا۔ فیض میرے گھر کے سامنے ایم اے او کالج کے کچھ اور پروفیسروں کے ساتھ رہتے تھے۔ فیض سے روزانہ ملاقات ہوتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فیض کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ مشاعروں میں جاتے تو شرماتے سے شرماتے سے۔ وہ دُبلے پتلے تھے۔ خوب صورت اور دیدہ زیب۔ ان کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تھے۔ اگر یہ روایت سے ہٹ کر بھی کوئی نظم یا غزل پڑھتے تو ان کے رعبِ حسن کی وجہ سے لوگ برداشت کر لیتے۔ اور پھر یہ پروفیسر بھی تھے اور اس زمانے کے پروفیسر واقعی پروفیسر ہوا کرتے تھے۔

"تاثیر کا فیض پر بہت اثر تھا۔ تاثیر مکمل ہو چکے تھے۔ فیض تکمیل کے مراحل سے گذر رہے تھے۔ (اور ابھی تک گذر رہے ہیں) پھر اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ فیض کا ڈاکٹر رشید جہاں کے ہاں آنا جانا شروع ہوا اور وہاں سے ہم نے کسی کو لوٹتے نہیں دیکھا۔ جو گیا وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ مجاز کب لوٹ کر آئے۔ نہ جو فیض آتے۔ رشید جہاں کے مکتب میں فیض کی ذہنی، سیاسی اور نظریاتی تربیت ہوئی اور اس طرح فیض تاثیر سے دور اور رشید جہاں سے قریب ہوتے گئے۔ بیچ میں صاحبزادہ محمود الظفر خاں مفت میں مارے گئے۔ انہیں ایم اے او کالج سے نوکری چھوڑ کر اور ڈاکٹر رشید جہاں کو اپنے ساتھ لے کر امرتسر سے نکلنا پڑا۔

"تاثیر نہ کمیونسٹ تھے نہ ترقی پسند وہ محض تاثیر تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انہیں اپنے مذہب اور ہم مذہبوں کے مسائل سے گہری دلچسپی تھی۔ اقبال کا رنگ ان پر اتنا گہرا چڑھا تھا کہ اسے انہوں نے کھرچنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن لاحاصل۔ ہاں چھیڑ چھاڑ ان کی یہاں بھی جاری رہی۔ "تاثیر سیماب صفت ہونے کی وجہ سے کوئی کام جم کر نہ کر پاتے۔

بخاری گروپ میں ان کی کسی سے نہ بنی اور خود اپنا کوئی حلقہ بھی نہ بنا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا مطالعہ اپنے ہم عصروں میں سب سے وسیع تھا۔ اور وہ ان سب سے زیادہ ذہین بھی تھے۔ لیکن انہیں چھپنا آتا تھا سمٹنا نہیں آتا تھا۔ اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی بھی تھی اور کمزوری بھی۔ وہ عجلت پسند تھے اور تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ شہرت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ حاسد بھی تھے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ وہ کسی کو نقصان پہنچانے یا زک دینے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ منصوبہ بنا کر کام نہیں کرتے تھے۔ ان کے حریفوں کے ہاں باقاعدہ منصوبہ بندی ہوتی۔ ان میں ایکا بھی تھا۔ ایک دوسرے کو سہارا دیتے اور سنبھالتے بھی تھے۔ تاثیر تن تنہا ان سب کا مقابلہ کرتے۔ وہ دوست بنانے سے زیادہ دشمن بنانے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ خود اپنے سب سے بڑے دشمن تھے۔ جہاں تک ان کی شرارتوں

اور جہاں تک چھیڑ چھاڑ کا تعلق ہے تو تاثیر کی صلاحیتیں اور ان کی قابلیت انہی کے ذریعے زیادہ نمایاں ہوئی۔

۲۸، دسمبر ۱۹۴۸ء کو لاہور میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کی اخبار نویسی کی سلور جوبلی منائی گئی۔ یہ قصہ الگ ہے کہ یہ سلور جوبلی سالک صاحب کی اخبار نویسی کی تھی یا ان کے کالم" افکار وحوادث" کی۔ تاثیر صاحب نے اس موقعہ پر ایک قطعۂ تاریخ پڑھا جس میں انہوں نے "ملک عبدالمجید خاں سالک" سے سلور جوبلی کی تاریخ نکالی۔ بڑی واہ واہ ہوئی۔ لیکن دوسری صبح جب لوگوں نے اعداد جوڑے تو کم نکلے۔ لوگوں نے سوچا کہ ممکن ہے کہ اگر پہلے مصرعے میں اتنے اعداد کا تعمیہ ہوا تو پھر کیا بات ہوئی۔ مولانا حسرت کو خدا یہ موقع دے۔ وہ اسے اپنے کالم "حرف وحکایت" میں لے اڑے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"میدان تاثیر کے ہاتھ رہا، یعنی ان کی تقریر میں بھی لطیفے تھے اور تقریر کے خاتمہ پر قطعۂ تاریخ پڑھا تو وہ بھی لطیفہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت سب تھیا کھا گئے" تاثیر نے مولانا حسرت کے نام ایک خط لکھا، جس کا مضمون یہ ہے۔

"واحسرتا کہ آپ جیسے مورخ نے میری تاریخ کی یہ قدر کی۔ لطیفۂ غیبی کو محض لطیفہ بنا دیا سالک صاحب کے سنانے کے لئے جو تاریخ کہی تھی وہ بلاتخرجہ وتعمیہ تھی آپ نے اور انہوں نے بھی سن کر داد دی۔ لیکن وہ ناقابل طباعت ہے۔ عام محفل کے لئے میں نے ہجری وعیسوی دونوں طرح کی تاریخیں، ملک عبدالمجید خاں سالک ہی کے نام سے تعمیہ کے ساتھ نکالیں، ایک سے زیادہ، مثلاً:

گوہر نور رچ جسم وجان سالک
دلبر ویار مہربان سالک
گفت تاریخ او بموقع جشن
ملک عبدالمجید خاں سالک

کیونکہ موقع جشن جوبلی کا تھا جس کا اضافہ برمحل تھا، عیسوی تاریخ کے لئے تکبیر امصرعہ "گشت تاریخ بر طریقۂ مطلوب" بنا دیا تھا۔ اس طرح تعمیہ کا ذکر بھی آگیا جشن کے موقعہ پر جو تاریخ میں نے سر عام پڑھی تھی، اس کا تعمیہ واضح تھا۔ کیونکہ تیسرے مصرع میں میں نے ہاتف کی بجائے دبیر فلک کہا اور اس کے "اد" ملا کے تین سو بادن کی کمی پوری کر دی گئی تھی۔

گفت تاریخ او دبیر فلک
ملک عبدالمجید خاں سالک

یہ ایک غیر معمولی سیدھی سادی تاریخ تھی، نہ اس میں لطیفہ تھا نہ ابہام مگر اسے غلط کہنا

سراسر غلط ہے۔ چنانچہ آپ نے یہ غلطی نہیں کی لطیفہ سازی کی ہے۔ سو وہ آپ کا کام ہے۔ یوں بڑے بڑے شاعروں نے تعمیہ برتا ہے اور اسے خوبی کے طور پر برتا ہے۔ سودا نے میرزا مظہر جان جاناں کی شہادت تعمیہ سے نکالی۔ مومن نے کیا عمدہ تخرجہ کیا ہے، اپنی بیٹی کی نال کٹنے پر کہا:

نال کٹنے کے بعد ہاتف نے

کہی تاریخ : دختر مومن

نال کے عدد "دختر مومن" کے عدد سے نکال کے تاریخ ولادت پوری کی۔ البتہ لطیفہ یہ ہوا کہ بعض حضرات نے میرے تعمیہ کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ بحمداللہ کہ نکتہ تنقید سے سکوت عین اوجھل ہو گیا۔ عبدالمجید کی عین کا گرنا نظر نہ آیا۔ گو کہ میں سکوتِ عین کو ناجائز نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ اردو میں عین کا تلفظ الف کی طرح ہے اور الف حرفِ علت ہے جس کا گرنا جائز ہے۔

اور پھر لکھتے ہیں: "بہرصورت تاریخ گوئی محض ایک کرتب ہے۔ فرصت ہو تو تاریخ پہ تاریخ کہتے جاؤ۔ سالک صاحب کو قدرت نے دلکش حسن عطا کیا ہے اسی سے تاریخ کہہ لو۔ "لحن دل کش عبدالمجید خاں سالک"۔ ان کے علم و فضل کا تذکرہ کرنا ہے تو "دیدۂ روزگار عبدالمجید خاں سالک"۔ اگر خاں کا لفظ ہٹا کر فقط عبدالمجید سالک کہنا ہے تو پھر "مخزن شرافت عبدالمجید سالک" سے عیسوی تاریخ ہو جائے گی۔ غرض کہ اس طرح الٹ پھیر کرنا کیا مشکل ہے۔ البتہ کبھی کبھی الہامی تاریخیں نکلتی ہیں۔ امرتسر کی مسجد شیخ خیرالدین مرحوم کی تاریخ تعمیر شاید مولانا حالی نے کہی تھی:

جزاک اللہ فی الدارین خیرا

اور ۹۶۹ھ میں جب نواب ہیبت خاں کے ہاں بیٹا کوثر علی پیدا ہوا تو کسی نے تاریخ کہی ہے۔ اعطینٰک الکوثر! یہ الہامی تاریخیں ہیں۔ ورنہ حضرت علامہ اقبال کہا کرتے تھے کہ فن تاریخ کی کتاب پکڑی اور عدد شماری کر لی۔ چنانچہ برادوں کی تاریخ وفات انہوں نے کسی کتاب سے لی تھی۔

اور پھر لکھتے ہیں "اگر آپ اس سال اپنی سوانح عمری لکھیں تو "احوال چراغ حسن" کتنی مناسب تاریخ ہے۔ اور میری غلطیاں نکالیں تو میں "چراغ حسن گزیدہ" ہو جاؤں۔ غالباً اس سال آپ کی جوبلی بھی منائی جائے گی۔ تاریخ ہو گی "میرت حسرت"

اور نہ منائی گئی تو تاریخ ہوگی "حسرتِ مسرت"۔ مدعا یہ کہ یہ ایک کھیل ہے۔ اس پہ داد کیا اور بے داد کیا۔ مگر خدا لگتی کہنا جوبلی کے یئے "جشنِ ملک عبدالمجید خاں سالک" بری تاریخ نہیں"۔

اس خط میں ڈاکٹر صاحب کی وہ ساری خصوصیات موجود ہیں جن کا میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ سالک صاحب کی سلور جوبلی تقریب میں انہوں نے آخری مصرع پر اتنا زور دیا کہ لوگوں کا باقی مصرعوں کی طرف دھیان ہی نہیں گیا اور وہ آخری مصرعے کو دہرانے اور اسی پر واہ واہ کرتے اپنے اپنے گھروں کو سدھارے اور باقی مصرعے انہیں یاد نہیں رہے۔ پھر یہ قطعۂ تاریخ تاثیر صاحب نے لکھ کر بھی نہیں دیا تھا بلکہ زبانی پڑھا تھا اور ڈاکٹر صاحب کا مقصد ہی یہاں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں اور تاریخ نکالنے والوں کو غچا دینا تھا اور وہ غچا دے گئے مگر اگر انہوں نے تعمیہ نکالا اور ظاہر ہے کہ ان حالات میں وہ تعمیہ ہی کے ذریعے آخری مصرع کو دھیان میں رکھ کر جو زبان زد ہو چکا تھا چھکا پا سکتے تھے لیکن مولانا چراغ حسن حسرت کے اعتراض پر انہوں نے جو جوابی خط لکھا ہے وہ ان کی قابلیت اور علمیت کی دلیل ہے۔ غرض کہ تاثیر کی زندگی میں ایسی باتیں آپ کو بہت سی ملیں گی۔

لائل پور کے ایک مشاعرے میں جس میں جگر صاحب نے بھی شرکت کی تھی، ایک بزرگ ہر شاعر کے اشعار پر بلند آواز سے اچھل اچھل کر داد دے رہے تھے۔ تاثیر بھی اس مشاعرے میں شامل تھے اور انہوں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ موصوف سخن فہمی میں کورے ہیں۔ لہٰذا جو صاحب ان کے پیچھے بیٹھے تھے، تاثیر نے انہیں اپنے پاس بلایا اور ان کے کان میں کچھ کہا اور جب جگر صاحب نے اپنی غزل کا چوتھا شعر پڑھا تو داد دینے والے صاحب کے جو پیچھے بیٹھے تھے انہوں نے آہستہ سے کہا۔ "سبحان اللہ کیا ایطائے جلی ہے"۔ چنانچہ موصوف نے بلند آواز سے کہا۔ "واہ جگر صاحب۔ سبحان اللہ کیا ایطائے جلی ہے"۔ اب اس کا اندازہ خود لگا لیجئے کہ جگر صاحب پہ کیا گذری ہوگی اور مشاعرے کا کیا حال ہوا ہوگا۔ یہ واقعہ مجھے حمید نسیم صاحب نے سنایا ہے جو تاثیر صاحب کے شاگردِ رشید تھے اور اس مشاعرے میں ان کے قریب بیٹھے تھے۔

تاثیر صاحب ایک ادبی محفل کی صدارت کرنے والے تھے۔ ایک مشہور ادیب دوست کو انہوں نے ایک تحقیقی مقالہ لکھنے پر مجبور کیا اور اسے یہ بتایا کہ تم فلاں ایرانی شاعر پہ اپنا مقالہ لکھو۔ اس نے کہا میں نے تو اس کا نام آپ ہی سے پہلی مرتبہ سنا ہے۔ تاثیر صاحب نے اسے پورا مقالہ لکھوا دیا اور جب اس نے تاثیر کی صدارت میں یہ مقالہ پڑھا تو فارسی ادب کے محققین جو وہاں موجود تھے حیران رہ گئے۔ یہ مقالہ خاصا معلوماتی اور پر مغز تھا۔ اس میں اس شاعر کے دو چار اشعار اور اس کی غیر مطبوعہ کتابوں کا حوالہ بھی تھا۔ حاضرینِ جلسہ نے ادیب کی محنت اور تلاش پر اسے دل

کھول کر داد دی۔ لیکن آخر میں تاثیر صاحب نے اس مقالے کے پرزے اڑا دیے اور یہ فرمایا کہ فلاں کتاب جو آپ نے اس کی بتائی ہے وہ اس کی نہیں ہے بلکہ یہ فلاں ایرانی ادیب کی ہے جو اس سے پچاس سال پہلے گزر چکا تھا۔ فلاں شعر بھی اس کا نہیں ہے اور اسے ایک اور غیر معروف ایرانی شاعر کیساتھ منسوب کیا۔ چنانچہ تاثیر صاحب کی اس تنقید پر اس غریب کا جو حال ہونا تھا وہ تو ہوا ہی تھا تاثیر صاحب کو لوگوں نے اس سے زیادہ داد دی۔ قسمت کا مارا یہ ادیب تاثیر صاحب کا شاگرد بھی تھا۔ جب یہ محفل اختتام کو پہنچی تو اس نے تاثیر صاحب سے شکایت کی۔ تاثیر صاحب نے کہا۔ "برخوردار استاد اور شاگرد میں تمیز ضروری ہے"۔ اس نے کہا "آپ اس کے قلمی نسخے دکھا دیجیے"۔ فرمایا "یہ آدمی ہی نہیں ہے تو اس کے قلمی نسخے کہاں ہوں گے"۔

تاثیر صاحب اعلیٰ پائے کے ادیب تھے، نقاد تھے، محقق تھے اور شاعر بھی تھے۔ ان کی جہت مقرر نہیں تھی۔ ان کے مزاج میں جو چلبلاپن اور شوخی تھی اس نے ان کو جم کر کسی سمت میں دل جمعی سے کام کرنے نہیں دیا اور اس طرح وہ بکھر کر رہ گئے۔

جب پاکستان وجود میں آیا تو تاثیر نے دل کھول کر اس کا خیر مقدم کیا اور پاکستانی ادب کی تحریک کی ابتداء کی۔ اس وقت ان کا ایک شعر یاد آ گیا۔

ہزار ہم سخنی ہو ہزار ہم نظری
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

تاثیر کی نظم "رس بھرے ہونٹ" اردو میں علامتی شاعری کا شاہکار نظم ہے۔

میں نے پہلے بھی یہ عرض کیا ہے کہ علامہ اقبال تاثیر کے مرشد تھے۔ تاثیر کے نظریات، اور ان کے عقیدوں پر علامہ اقبال کی چھاپ ہے۔ لیکن تاثیر نے اپنی شاعری کی جہت نہیں بدلی علامہ کی نظر میں تاثیر کا مرتبہ بحیثیت شاعر بہت ارفع تھا۔ وہ اکثر ان کے اشعار سنتے اور جھومتے۔ ایک مرتبہ جب تاثیر نے انہیں اپنی غزل کا یہ شعر سنایا۔

زلفِ آوارہ گریباں چاک اے مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے دردآشنا سمجھا تھا میں

تو علامہ مضطرب الحال ہو گئے اور کرب کی حالت میں انہوں نے وہ نظم کہی۔

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں

ڈاکٹر تاثیر علامہ اقبال سے متاثر تھے۔ وہ حسین اے رحمان کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"دورِ حاضر کے شعرا میں اقبال کا رنگ ہی قابلِ توجہ اور محبوب ہے، کیونکہ شاعر جس فضا، جس ماحول کا ترجمان ہے وہ ماحول اقبالی ہے۔ ہیتم اگر میر دم گر نہ روم ہیتم کی تفسیر

ضروری تھی۔ اور آپ نے خوب حق تفسیر ادا کیا۔ میں یہ ان لوگوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھ رہا ہوں جو کہتے ہیں اقبال کا تتبع مزاج شاعری کے خلاف ہے۔ آپ اور ہیں تو اقبالی مجرم ہیں۔

تاثیر کی ذہانت، فطانت اور اردو زبان اور اس کے محاورے پران کی گرفت کی ان کے حریفوں نے بھی تعریف کی ہے۔ ان میں تنقید کی بے مثال قابلیت تھی۔ انہوں نے بےشمار مضامین قلمی ناموں سے لکھے۔ نیازمندان لاہور میں تاثیر کی نشاندہی مشکل ہے۔ سچ تو یہ ہے یہ انہیں کی اپج تھی اور وہی اس کے روح رواں تھے اور جیسا میں نے پہلے کہا ہے کہ تاثیر اپنی بے پناہ شوخی اور چلبلاہٹ کی وجہ سے بکھر کر رہ گئے تو اب یہ کام کسی محقق کا ہے کہ وہ انہیں سمیٹے۔ اس میں ویسے خود بھی بکھر جانے کا خطرہ ہے۔

میرے والد خواجہ محمد عمر مرحوم مسلم ہائی سکول امرتسر کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انجمن کے ایک عہدیدار سے ناچاقی کے باعث اپنی ملازمت سے مستعفی ہوکر ریاست جاورہ چلے آئے۔ امرتسر کے تمام سکولوں اور کالجوں کے طلبہ نے یہ مطالبہ کیا کہ انہیں عزت و آبرو کے ساتھ دوبارہ ان کے عہدے پر فائز کیا جائے۔ اس سلسلے میں امرتسر کی کئی درسگاہوں میں کئی مہینے تک ہڑتال رہی۔ آخر امرتسر سے ایک وفد انہیں واپس لانے کے سلسلے میں جاورہ بھیجا گیا جس کے سربراہ مولانا غلام محمد ترنم مرحوم تھے اس سارے رگڑے جھگڑے میں طلبہ اور انتظامیہ نے تاثیر صاحب کو بیچ میں ڈالا اور تاثیر صاحب نے والد صاحب کے نام ان کے ایک خط کے جواب میں جو خط لکھا تھا وہ میرے پاس محفوظ ہے جس یہ خط یہاں درج کرتا ہوں۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۳۸ء

مخترمی و مکرمی خواجہ صاحب!

السلام علیکم! آپ کا نوازش نامہ ملا۔ میں چار دن باہر رہا اور تین دن کالج بند رہا۔ تعطیلات کے سلسلے میں۔ اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔

آپ سن چکے ہوں گے کہ مسلم ہائی سکول کے متعلق تصفیہ ہوگیا ہے اور آپ کی عزت اور آبرو پر کوئی حرف نہیں آیا۔ بلکہ بدگو حضرات جھٹلائے گئے ہیں۔ میں آپ کو مبارکباد عرض کرتا ہوں۔ جس استاد کی اس قدر عزت طلبہ کے دلوں میں ہو وہ استاد ہر اعتبار سے دنیا کے معزز ترین اشخاص میں شمار ہونے کا اہل ہے۔ کاش مسلمان اکابر میں مردم شناسی کا جذبہ موجود ہو۔ فرمایئے — امرتسر واپس آیئے گا۔

برخوردار کو سلام۔ والسلام مخلص تاثیر

خیر والد صاحب امرتسر واپس نہیں آئے۔ البتہ تاثیر صاحب سے ان کی خط وکتابت جاری رہی۔ تاثیر صاحب کے سلسلے میں یہ بتاتا چلوں کہ وہ کیمبرج سے نکلے نگوڑے نہیں آئے تھے۔

ایک فرنگی خاتون اور اس کی ایک بہن اپنے ساتھ لائے تھے۔ فرنگی خاتون سے تو علامہ اقبال نے ان کے دو بول پڑھوا دیے البتہ فیض میں تاثیر نے اپنی ہم زلفی کی ساری صلاحیتیں پاکر ان سے اپنی سالی کا رشتہ کر دیا۔ تاثیر کی اہلیہ تو عمر بھر اہلیہ ہی رہی لیکن فیض صاحب کی اہلیہ نے ہمیشہ شوہری کی، گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کو پالنا پوسنا بلکہ فیض صاحب کو بھی انہوں نے ہی پالا پوسا ہے۔

پھر کچھ مدت کے بعد پتا چلا کہ تاثیر صاحب پرتاب کالج سری نگر کے پرنسپل ہو گئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس زمانے میں خواجہ غلام السیدین صاحب کشمیر میں ناظم تعلیمات تھے۔ میں اسی زمانے میں سری نگر گیا تھا اور وہاں تاثیر صاحب سے دوسرے تیسرے ملاقات ہوتی۔ وہ میرے استاد تھے۔ اگرچہ فیض مجھ سے پانچ چھ سال بڑے ہیں اور وہ بھی میرے استاد تھے لیکن ہم میں استادی شاگردی کے علاوہ دوستی بھی رہی۔

تاثیر مرحوم سے میری آخری ملاقات ۴۸ء میں ریڈیو پاکستان کے کل پاکستان مشاعرے میں ہوئی۔ میں ان کے قریب ہی بیٹھا تھا اور میرے آس پاس حفیظ ہوشیارپوری اور حمید نسیم تھے۔ جب شاعر اپنا کلام سناتے اور لوگ داد دیتے تو حمید نسیم نے میرے کان میں کہا کہ تاثیر کو غور سے دیکھو۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنا پورا منہ کھولتے ہیں لیکن آواز نہیں نکالتے۔ داد دینے میں ایسی خسّت!

تاثیر مرحوم یوں تو حضرت مولانا ظفر علی خاں کی قابلیت اور ان کی خداداد صلاحیت کے بڑے معترف تھے۔ لیکن وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آتے۔ ایک دن مرحوم نے ظفر علی خاں کے بارے میں یہ اڑا دی کہ وہ بدیہہ گو نہیں ہیں، زود گو ضرور ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کل کہاں کہاں جانا ہے اور کس کس سے ملنا ہے لہذا رات کو بیٹھ کر اشعار کہہ لیتے ہیں۔ پھر چونکہ حافظہ اچھا ہے اس لئے یہ اشعار انہیں یاد رہ جاتے ہیں۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت مولانا کو ایک جلسے میں تقریر کرنی تھی۔ آغا شورش کاشمیری نے انہیں جلسہ گاہ میں ایک کاغذ پر ایک مصرع لکھ کر دیا جس کی زمین انتہائی سنگلاخ تھی۔ اور انہیں یہ بتایا کہ تاثیر نے ان کے بارے میں لاہور کے ادبی حلقوں میں کیا اڑا رکھی ہے اور یہ بھی کہا کہ آپ کو اس مصرعے پر فی البدیہہ اشعار کہنے ہیں۔ مشکل سے پانچ منٹ بعد ہی مولانا کا نام پکارا گیا اور مولانا نے جلسہ گاہ میں ساری بات کہہ سنائی۔ اور فی البدیہہ اس مصرعے پر سات آٹھ اشعار کہہ ڈالے۔ اور ساتھ ساتھ تاثیر کے بھی پرزے اڑا ڈالے۔ اس سلسلہ میں تاثیر نے بتایا کہ اگرچہ بیچ میں میں ضرور آیا ہوں لیکن یہ مصرع میں نے نہیں دیا۔ میں ظفر علی خاں کی قابلیت کا معترف ہوں۔ یہ مصرع ان لوگوں نے دیا تھا جو میرے اور مولانا کے حریف ہیں واللہ اعلم!

تاثیر کی اپنی شرارتوں کے علاوہ ان کے حریفوں نے بہت سی غلط باتیں ان سے منسوب

کردی ہیں۔ مثلاً علامہ عبداللہ یوسف علی کا اسلامیہ کالج لاہور کی پرنسپل شپ سے اس لئے مستعفی ہونا کہ ایک جلسے میں جس سورت کا ان سے انگریزی ترجمہ کروانا تھا اس کی جگہ دوسری سورت پڑھ دی گئی۔ اور علامہ نے پہلی سورت کا ترجمہ کردیا۔ دراصل اس میں تاثیر کے حریفوں نے انہیں ملوث کرنا چاہا تھا لیکن اس کی اسی زمانے میں صفائی ہوگئی تھی۔ علامہ عبداللہ یوسف علی نفسی اور اچھے خاصے بدحواس آدمی تھے۔ ترجمہ کرنے کھڑے ہوئے تو انہوں نے یہی سوچا کہ قاری صاحب نے وہی سورت پڑھی ہوگی جو انہیں بتائی گئی تھی۔ اس معمولی سی بھول چوک پر ہنگامہ اٹھانا انہیں ناگوار گذرا اور وہ مستعفی ہوگئے۔

تاثیر کے ایم اے او کالج سے مستعفی ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ جو لوگ ڈاکٹر رشید جہاں کے گروپ کے حامی تھے چونکہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تھا اور کالج کے اندر اور باہر ان کا زور تھا، لہذا رشید جہاں اور صاحبزادہ صاحب کے امرتسر سے جانے کے بعد تاثیر کا یہاں ٹھہرنا مشکل ہوگیا تھا۔ لیکن تاثیر میدان چھوڑ کر بھاگنے والے نہیں تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بزم یاراں نیرِل اب بکھر رہی تھی۔ بخاری پہلے ہی آل انڈیا ریڈیو کے ہوکر رہ گئے تھے۔ فیض اور حسرت نے فوج میں ملازمت اختیار کرلی۔ لاہور میں بھی وہ پہلی سی ادبی رونق نہیں رہی تھی۔ اور یوں بھی تاثیر کو کشمیر پسند تھا۔ لیکن تاثیر نے معلمی کا پیشہ آخری وقت تک نہیں چھوڑا۔ اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں وہ آخری وقت تک مصروف رہے۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب پنجاب میں نہ سنگ رہے تھے نہ سنگ زن۔ اور وہ پہلی سی بہاریں اور وہ علمی و ادبی سرگرمیاں بھی نہیں تھیں۔

لیکن جب پاکستان بنا تو تاثیر اپنے شہر واپس آگئے۔ اور اس زمانے میں انہوں نے پاکستان ٹائمز میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ اور پاکستانی ادب اور پاکستانیت کے موضوع پر بڑے کام کے مضامین لکھے۔

تاثیر حقیقت میں نام تھا ایک تحریک کا۔ بھرپور اور توانا زندگی کا۔ ایسے لوگ ہنگاموں اور ہنگامہ آرائیوں میں اپنی تمام صلاحیتوں اور قابلیت کیساتھ ضائع ہو جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اگر تاثیر کے بکھرے ہوئے کاموں کو سمیٹا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ہمیں بہت کچھ دے گئے ہیں۔

پیر حسام الدین راشدی

پیر صاحب جذباتی آدمی تھے۔ وہ اہلِ دل تھے۔ صوفی منش تھے۔ تضادات کا مجموعہ ہوتے ہوئے بھی بے پناہ مخلص اور پیارے انسان تھے۔ آپ سے انھیں کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں لیکن اس کے باوجود اگر آپ سے ان کے مخلصانہ تعلقات ہیں تو وہ اس رشتے کو توڑنے کے خیال سے بھی کانپ جاتے اور یہی ان کی ہر دل عزیزی کا باعث تھا۔ چناں چہ وہ لوگ جو ان کے قریب رہ چکے تھے، پیر صاحب کے اسی خلوص کی وجہ سے ان سے اپنے تمام اختلافات کے باوجود مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ پیر صاحب کے سامنے آتے ہی سب کچھ بھول جاتے۔

پیر صاحب کی شخصیت بڑی من موہنی تھی۔ وہ اس بچے کی طرح تھے جس کا بھولپن ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کی شرارتوں پر غصہ آنے لگتا ہے۔ لیکن اس کی معصومیت کی وجہ سے ہم اس کی شرارتیں بھی گوارا کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ دل کے اچھے ہوتے ہیں اور پیر صاحب تو واقعی دل کے بہت اچھے تھے۔

پیر صاحب سے میری پہلی ملاقات بابائے اردو کے یہاں ہوئی۔ اردو اور بابائے اردو سے ان کے تعلقات پاکستان بننے سے پہلے کے تھے۔ اور جب بابائے اردو نے ہندوستان میں اردو کا مستقبل نہیں دیکھا تو وہ پاکستان چلے آئے۔ بابائے اردو سے یہ معلوم ہوا کہ کراچی میں انجمن ترقی اردو کے قیام کے سلسلے میں پیر صاحب نے اُن کی بہت مدد کی تھی۔ اور یہ خواہش انھی کی تھی کہ کراچی میں انجمن کا صدر دفتر کھولا جائے۔ پیر صاحب انجمن کے عہدے دار بھی تھے اور اردو زبان کے گنے چُنے محققین میں ان کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی جو جونا گڑھ کے رئیس اور اہلِ علم اور محقق تھے، کسی زمانے میں بابائے اردو جونا گڑھ میں ان کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے اور ان سے اور ان کے ذریعے دوسروں سے انجمن کے لیے چندہ لاتے تھے لیکن جب قاضی صاحب کو دیس نکالا ملا تو چند روز بعد پیر صاحب نے انھیں ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ کروا دیا۔ اور اب قاضی صاحب جونا گڑھ کے رئیس نہیں تھے۔ یہاں انھیں قلم

کے ذریعے روزی کمانا پڑی۔ پھر مولوی صاحب انھیں انجمن میں اٹھا لائے اور یہاں انھوں نے انجمن کی بڑی خدمت کی۔ قاضی صاحب نے مولوی صاحب کی فرمائش پر ولی گجراتی پر ایک معرکہ آرا مقالہ لکھا۔ پیر صاحب سے پہلے بھی ان کی یاد اللہ تھی، اور اب تو دوستی ہوگئی۔ دلچسپیاں اور مشاغل مشترک تھے۔ اور پھر جب حفیظ ہوشیارپوری کا ریڈیو پاکستان لاہور سے کراچی تبادلہ ہوا تو یہ بھی محققین کی اس ٹولی میں شامل ہو گئے۔ ممتاز حسن صاحب تو پہلے ہی کراچی میں موجود تھے۔ چناں چہ حفیظ صاحب نے میرے ذمّہ یہ کام سونپا کہ میں اردو زبان کے ان اجنّہ سے ریڈیو پاکستان کے لیے ایسے موضوعات پر مضامین لکھواؤں جن پر اب تک لکھا نہ گیا ہو۔ یا جو تشنہ رہ گئے ہوں۔ یا ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہوں۔ چناں چہ میں نے ان سے مسلمان موسیقاروں، موجدوں اور سائنس دانوں پر مضامین لکھوائے۔ یہ مضامین ہمارے ادب کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں لیکن ریڈیو پاکستان کے حکّام کی غفلت، تساہل اور عدم توجہی کی وجہ سے یہ سارے مسوّدے ضائع ہو گئے۔

پیر صاحب سندھی زبان میں بھی بلند پایہ تحقیقی مقالے اور کتابیں لکھ چکے ہیں۔ صوفیہ کا تعلق کسی علاقے سے نہیں ہوتا، پوری کائنات سے ہوتا ہے۔ پیر صاحب نے سندھ کے صوفیوں کے کارناموں کو اردو زبان میں منتقل کر کے اردو زبان کا دامن وسیع کر دیا۔

پیر صاحب سیاست کے آدمی نہیں تھے۔ سیاست سے انھیں نفرت تھی۔ وہ اسے بازاری لوگوں کا مشغلہ سمجھتے تھے۔ اگرچہ ان کے بڑے بھائی پیر علی محمد راشدی صاحب نے ادب سے زیادہ صحافت اور سیاست سے کام لیا۔ راشدی صاحب ادیب بھی ہیں، صحافی بھی ہیں اور سیاست اُن کی گھٹی میں پڑی ہے۔ وہ صحافت کے ذریعے عملی سیاست میں نکل آئے۔ لہٰذا انھیں وہ عزت و احترام نصیب نہیں ہوا جو اُن کے چھوٹے بھائی حسام الدین راشدی کے حصّے میں آیا۔ ویسے قابل دونوں بھائی ہیں۔

شادیاں دونوں بھائیوں نے خوب کیں لیکن اس معاملے میں بھی بڑے بھائی چھوٹے سے بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔

پیر حسام الدین راشدی کے کتب خانے میں ہر مضمون پر اور ہر موضوع پر سندھی، اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبان کی ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔ ان کا ایک کتب خانہ ان کے گاؤں میں بھی ہے۔ مصر میں عربی زبان میں جو کتابیں چھپتی تھیں، پیر صاحب کے یہاں ان کی فہرست آجاتی تھی، وہ اُن میں سے، اُن کی جیب جتنی کتابوں کو خریدنے کی اجازت دیتی، خرید لیتے اور پھر انھیں کہیں سے کوئی نایاب کتاب ملتی تو اُسے بھی خرید لاتے۔ کتاب خوانوں اور محققین کی یہ ٹولی (جناب ممتاز حسن صاحب، قاضی احمد میاں، حفیظ ہوشیارپوری) پرانی کتابوں کے کباڑیوں کے یہاں نکل جاتی اور یہ گاڑی

پھر کر کتابیں خریدلاتے۔ ویسے بھی شہر کے کباڑیوں کا ان کے یہاں آنا جانا رہتا۔ جب یہ علمی اور ادبی موضوعات یا کتابوں پر بات کرتے تو ہم ایسے لوگوں کو اپنی جہالت کا احساس اور اندازہ ہوتا۔

پیر صاحب مہمان نواز بھی تھے لیکن ان کے یہاں مہمان بھی انھی ایسے آتے اور دنوں ان کے یہاں قیام کرتے اور ان کی خوب خوب تواضع ہوتی اور پھر یہ مہمان پیر صاحب کے کتب خانے میں بیٹھ کر ان کی کتابیں چاٹتے۔ پیر صاحب کے کتب خانے میں صرف کتابیں ہی نہیں تھیں، بلکہ "الہلال"، "کامریڈ" اور "معارف" کے مکمل فائل بھی تھے۔

آپ کو جس موضوع یا جس شخصیت پر مضمون لکھنا ہو بس اُس کا ذکر پیر صاحب سے چھیڑ دیجیے اور پھر دیکھیے پیر صاحب کی گلُ افشانیٔ گفتار۔ یوں لگتا کہ جیسے اس موضوع پر جتنے مصنفین نے لکھا ہے، وہ سب آپ سے ہم کلام ہیں۔

ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل سید ذوالفقار علی بخاری نے ہم ریڈیو ملازمین کو کہ جن کا تعلق پروگراموں سے تھا، یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ ریڈیو پاکستان سے تقریروں میں لہجے کی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ ایک مرتبہ پیر صاحب کے مسوّدے میں میں زبان درست کر رہا تھا کہ عزیز حامد مدنی صاحب نے میرے ہاتھ سے مسوّدہ چھین لیا اور کہا کہ پیر صاحب کا اپنا لہجہ ہے۔ اُن کی اپنی زبان ہے۔ وہ جس لفظ کو جس طرح چاہیں، لکھیں یا ادا کریں۔ آپ کو یا ریڈیو پاکستان کو یہ حق نہیں ہے کہ ایسی عظیم اور نامی گرامی شخصیتوں کو آپ زبان سکھائیں۔ اور جب پیر صاحب کی یہ تقریر نشر ہوگئی تو بخاری صاحب مجھ پر گرجنے برسنے لگے۔ اتنے میں مدنی صاحب بھی آگئے۔ انھوں نے بتایا کہ مَیں نے ان کے ہاتھ سے مسوّدہ لے لیا تھا۔ اور اسے اپنی ذمّہ داری پر نشر کروایا تھا۔ اگر آپ اس طرح زبان پر قدغن لگاتے رہے تو زبان محدود ہو جائے گی۔ اور لوگ جو آج زبان کی خدمت اہلِ زبان سے زیادہ کر رہے ہیں، وہ اس میں دلچسپی لینا چھوڑ دیں گے۔

آخری عمر میں پیر صاحب میں خاصی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ وہ سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے جس سے کسی زمانے میں وہ متنفر تھے۔ ان میں تھوڑی سی عصبیت بھی پیدا ہوگئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ قلندری اور درویشی اور ادب کے دائرے سے نکل رہے ہیں اور ان کا حلقۂ یاراں بھی تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے جو پہلے پیارے تھے وہ دُور ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن ان کے پیاروں کو بھی یہ احساس تھا کہ اب پیر صاحب کی سوچ بدل رہی ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ ان کا پیار نہیں بدلا تھا۔ لہذا ہر پھر کے اُن کے پیارے پھر اُن کے اِرد گِرد جمع ہو جاتے۔

پیر صاحب بعد میں ادبی سیاست میں بھی حصہ بننے لگے ۔ یہ ایسی بات تھی، جس سے ہم ایسے ان کے بے شمار نیاز مندوں کو ان کے اس رویے سے بہت تکلیف پہنچی، اور ان سے اس پر اپنی خفگی کا اظہار بھی کیا، اور ہم نے بہت کچھ لکھا بھی ۔ اور پھر یہ بھی سوچا ۔ پیر صاحب آخر انسان ہیں، فرشتہ تو نہیں ۔ ممکن ہے کچھ لوگوں یا کسی طبقے سے گزشتہ ہو کر ان میں یہ تبدیلی آئی ہو ۔ لیکن اس پر بھی ہمیں یہ سوچ کر افسوس ہوتا کہ ہم لوگ پیر صاحب کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ گرد و پیش کے حالات سے اتنے بدل جائیں گے ۔
لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نہ جانے پیر صاحب کی شخصیت میں ایسی کیا کشش تھی یا ہم میں ان کی طرف سے ایسا کیا خلوص چھپا ہُوا تھا کہ اُن کو بُرا بھلا کہنے کے باوجود جب وہ سامنے آتے تو ہم سب کچھ بھول جاتے ۔ اور پیر صاحب ایسے ہی معلوم ہوتے، جیسے پہلے تھے ۔ پیر صاحب کو بھی اس کا احساس تھا چنانچہ انتقال سے چند روز پہلے ایک تقریب میں ان سے ملاقات ہو گئی ۔ میں نے انھیں سلام کیا تو کہنے لگے ۔

" نصراللہ خان ۔ تم تو ہم سے خفا ہو ؟ "

پیر صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ اور میں نے اٹھ سے چمٹ کر کہا ۔ " پیر صاحب ! اس تمام خفگی کے باوجود آپ سے جو پیار ہے، اس میں کمی نہیں آئی ۔ لیکن ہم لوگ اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ آپ پھر پہلے کی طرح ہو جائیں اور آپ کے دل کی گھٹن دُور ہو جائے ۔ اور آپ کا دل پہلے کی طرح کھل جائے ۔ " اور پیر صاحب مسکرا دیے ۔ یوں لگا جیسے وہ مسکرا نہیں رہے ہیں بلکہ میری دعا پر آمین کہہ رہے ہیں ۔

سید فخرالدین ماتری

لانبا قد، گندمی رنگ، فلسفیوں کی طرح سوچتی ہوئی نیم وا آنکھیں، خوب صورت چہرہ، اُلٹی مانگ، مستانہ چال، آواز میں گھن گرج، بے باک نڈر بذلہ سنج، جملے باز، انجمن آرا، جس محفل میں بیٹھتے شمعِ محفل بن جاتے۔ جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ ہوتی اور فاقے گزر جاتے لیکن چہرے مہرے سے ظاہر نہ ہونے دیتے۔ نام سید فخرالدین۔ گجرات کے ایک گاؤں ماتری میں پیدا ہوئے۔ علوی سید تھے۔ ان کے آبا و اجداد عرب اور ایران سے ہوتے ہوئے ہندوستان آئے اور صوبہ گجرات میں بس بسا گئے۔

ان کے جدِ امجد شاہ وجیہہ الدین رح مشہور صوفی شاعر ولی گجراتی کے بھائی تھے۔ شاہ وجیہہ الدین اپنے وقت کے بڑے عالمِ دین تھے۔ ان کا گھر دینی علوم کا سرچشمہ تھا۔ اُس کی حیثیت ایک جامعہ کی تھی جہاں دُور دُور سے تشنہ کامانِ علم آتے اور سیراب ہوکر جاتے۔ شاہ وجیہہ الدین رح نے اکبر بادشاہ کا زمانہ پایا تھا اور جب اکبر بادشاہ نے علما سے حضرت مجدد الف ثانی رح کے خلاف فتویٰ لیا تو شاہ صاحب نے اختلافی نوٹ لکھا۔ یہ جرأت و بے باکی ماتری مرحوم نے اپنے جدِ امجد سے ورثے میں پائی تھی۔

۱۹۶۲ء میں ایک شام ماتری صاحب نے اپنی گاڑی بھیج کر مجھے اپنے گھر بلوایا اور کہا کہ میں اُردو زبان میں ایک روزنامہ (اخبار) نکالنا چاہتا ہوں اور مجھے تمھارے تعاون کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا میں تیار ہوں۔ چناں چہ کچھ دنوں بعد یہ معلوم ہوا کہ جب ماتری صاحب ترکی گئے تھے تو وہاں انھوں نے "حُریت" نام کا ایک اخبار دیکھا تھا اور یہ نام انھیں بہت پسند آیا تھا کچھ دنوں کے بعد ماتری صاحب نے "حُریت" کا ڈیکلیریشن لے لیا۔ ماتری مرحوم حریت کو اخبار نہیں بلکہ ایک تحریک کی صورت میں چلانا چاہتے تھے۔ وہ بڑے سچے مسلمان اور محبِ وطن تھے۔ وہ برِ صغیر کے ان نوجوانوں میں شامل تھے جنھوں نے قائدِ اعظم کی راہ نمائی میں حصولِ پاکستان کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی۔

ماہرؔی صاحب افسانہ نگار بھی تھے اور ناول نویس بھی۔ اعلیٰ درجے کے سیاست داں، صحافی اور شاعر بھی۔ گجراتی ادیبوں میں ان کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ ماہرؔی مرحوم نے مجھے بتایا کہ جب میں نے گجرات میں گجراتی زبان میں ایک اخبار نکالا تو میں اپنے جدِّ امجد شاہ وجیہہ الدین کے مزار پر گیا۔ اور میں نے اپنا قلم مزار پر رکھ کر کہا

"بابا۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجیے کہ وہ میرے قلم میں ایسا زور اور اثر پیدا کرے کہ میں جو کچھ لکھوں وہ میرے پڑھنے والوں کے دِلوں میں اُتر جائے میں حق اور سچائی کا ساتھ دُوں اور باطل کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی مجھ میں جرأت اور حوصلہ ہو۔"

اور پھر یُوں محسوس ہُوا کہ جیسے میرے جدِّ امجد کی دُعا قبول ہو گئی۔

ماہرؔی صاحب کو بمبئی کے وزیرِ اعلیٰ کے۔ ایم منشی نے پاکستان بننے کے بعد دیس نکالا دیا۔ اور ایک ڈکوٹے کے ذریعے انھیں پاکستان بھیج دیا۔

قائدِ اعظم اور محترمہ فاطمہ جناح اُن سے اولاد کی طرح محبّت کرتے میں نے ماہرؔی مرحُوم کو ٹیلی فون پر مادرِ ملّت سے غصّے کی حالت میں اُونچی آواز میں بولتے دیکھا۔ ہُوا یوں کہ جب مادرِ ملّت نے ایوّب خان کے عہدِ حکومت میں صدارت کے لیے انتخاب لڑنے کا اعلان کیا تو بہت سے اخباروں نے اس اعلان کا خیرمقدم کیا لیکن ماہرؔی صاحب کے اخبارات یعنی حُریّت، لیڈر اور ملّت خاموش رہے، تو اس پر محترمہ نے ٹیلی فون پر ماہرؔی صاحب سے نہ صرف شکایت کی بلکہ ان پر طنز بھی کیا۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے، انھوں نے محترمہ سے کہا۔ کیا آپ کو یہ نہ چاہیے تھا کہ اِس سلسلے میں آپ مجھ سے مشورہ کرتیں۔ اگر آپ مجھ سے پوچھتیں تو میں آپ کو کبھی یہ رائے نہ دیتا۔ کیوں کہ آپ پاکستان کی آبرُو ہیں۔ قائدِ اعظم کی ناموس ہیں۔ اور ایوب خان کی حکومت آپ کو بدنام اور رُسوا بھی کر سکتی ہے۔ آپ کو یہ چاہیے تھا کہ آپ کسی دوسرے شخص کو صدارت کے لیے کھڑا کر کے پبلک سے اسے کامیاب بنانے کی اپیل کرتیں۔ اتنا کہہ کر ماہرؔی صاحب نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ اور یہ فرمایا کہ اب ہمیں ان کا ساتھ دینا ہوگا اور مُلک کے تمام اخباروں سے بڑھ چڑھ کر ہمیں ان کی حمایت کرنی ہوگی ——— چناں چہ جب ماہرؔی صاحب کے قلم سے ایوّب حکومت کے خلاف شعلے بھڑکنے لگے تو ماہرؔی صاحب کے تمام اخباروں کے اشتہارات بند کر دیے گئے۔

ماہرؔی مرحوم جب پاکستان آئے تو اُن کے تن پر صرف ایک جوڑا تھا اور ان کی جیب خالی تھی۔ انھوں نے فاقے کیے لیکن اُن کی آن میں کوئی فرق نہ آیا۔

ایک دن ماتری صاحب ایک دوست کی دکان پر بیٹھے تھے ۔ ایک جوڑا قریب سے گزرا۔ بیوی نے برقعہ اوڑھا تھا ۔ میاں آگے آگے اور بیوی پیچھے پیچھے ۔ وہ شخص مڑ مڑ کر ماتری صاحب کو دیکھتا تھا ۔ پھر اس نے اپنی بیوی سے کچھ کہا تو وہ بھی مڑ کر دیکھنے لگی ۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ شخص ماتری صاحب کے قریب آیا اور اس نے پوچھا " کیا آپ فخر ماتری ہیں ؟" ماتری صاحب نے کہا " ہاں " اس نے ماتری صاحب کے پاؤں کو ہاتھ لگایا اور کہا " بمبئی کی حکومت نے مجھ پر قتل کا مقدمہ چلایا تھا ۔ آپ نے اپنے اخبار میں ایسے زوردار اداریے لکھے کہ حکومت نے مقدمہ واپس لے لیا ۔ یہاں میری مالی حالت بہت اچھی ہے ۔ یہ بتائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کروں ؟"

ماتری صاحب نے کہا کہ میں یہاں سے اپنا اخبار ملّت نکالنا چاہتا ہوں ۔ اس کے لیے ایک چھاپے کی مشین کی ضرورت ہے اور فلاں ہندو کے پاس ، جو ہندوستان جا رہا ہے ، یہ مشین موجود ہے ۔ وہ اسے بیچنا چاہتا ہے اور دس ہزار روپے مانگ رہا ہے ۔ چناں چہ اس شخص نے وہیں ماتری صاحب کو دس ہزار کا چیک کاٹ کر دے دیا اور ماتری صاحب نے وہ مشین خرید لی اور نیپیر روڈ کے ہوٹل کی چھت سے انھوں نے " ملّت " نکالنا شروع کر دیا اور پھر کچھ دنوں بعد انھوں نے شام کا انگریزی اخبار " لیڈر " نکالا ۔ اور ۱۹۶۲ء میں روزنامہ " حرّیت " کا اجرا کیا ۔ حرّیت نے صحافت کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا ۔ " حرّیت " نے اردو صحافت کو ایک نیا موڑ دیا ۔ یہ صحافت کے جدید تقاضوں کا حامل تھا ۔ ماتری صاحب نے پہلی مرتبہ اردو صحافت میں تصویری خبروں کو رائج کیا ۔ بڑی تصویر اور مختصر اور جامع خبر ۔ حرّیت کے اجرا سے پہلے اخباروں میں ، خواہ وہ اردو کے اخبار ہوں یا انگریزی کے ، اداریے اس طرح لکھے جاتے تھے جیسے جواب مضمون لکھے جاتے ہیں ۔ ایک موضوع پر دو کالموں میں خانہ پُری کی جاتی ۔ ماتری صاحب نے مختصر ، جامع اور فکر انگیز اداریے اور شذرے لکھنے کا رواج ڈالا ۔ ان کا اسلوب ڈرامائی ہوتا اور ہر قاری ان کے اداریے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ۔ چناں چہ دوسرے اخباروں نے بھی اداریہ نویسی کا یہ طریقہ اپنایا ۔ اردو اخباروں میں کالم واضح نہیں ہوتے تھے نہ کالموں میں سپیدی چھوڑی جاتی تھی ۔ اور نہ بین السطور سپیدی ہوتی تھی ۔ اس سے پڑھنے والے کی نظر کو ٹھوکر لگتی ۔ چناں چہ " حرّیت " میں کالموں کے فاصلوں کے علاوہ سطروں کے درمیان بھی سپیدی چھوڑی جانے لگی ۔

حرّیت اردو کا پہلا اخبار ہے جس میں کھیلوں اور تجارتی خبروں کے لیے علیحدہ صفحات مقرر کیے گئے ۔ اور جیسا میں نے پہلے کہا ہے ، اس اخبار نے تصویری صحافت کا آغاز کیا ۔

ماتری مرحوم نے اپنی زندگی میں صحافت کو ایک مشن بنایا۔ وہ بھی پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کرنے کے بعد۔ اُن کے رفقا بھی دن رات اُن کے ساتھ مزدوروں کی طرح کام کرتے۔

ماتری مرحوم بڑے وضع دار انسان تھے۔ جس سے جتنے اور جیسے تعلقات ہوتے تھے، وہ اسے اسی طرح نبھاتے۔ اگر کسی محکمے کا سیکرٹری یا کوئی وزیر ان کے پاس آتا تو وہ اس سے ایسا ہی برتاؤ کرتے جیسا وہ اپنے نادار دوستوں سے کرتے جو اس محفل میں موجود ہوتے۔ دوپہر کو ان کے سارے دوست اور ساتھی اپنا اپنا کھانا ساتھ لاتے اور سب مل جل کر کھاتے۔ ماتری صاحب، اور ان کے ساتھی ایک دوسرے کے کھانے میں شرکت کرتے۔ اگر کوئی ساتھی تکلیف میں ہوتا تو وہ تکلیف ماتری صاحب کی تکلیف بن جاتی۔ اُن کا ہاتھ بہت کھلا تھا۔ ایک دن ایک عورت آئی۔ وہ بیوہ تھی۔ جب اس نے ماتری صاحب کو اپنی بپتا سنائی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر اُسے دیا۔ بیوہ اپنی داستان سناتی رہی۔ ماتری صاحب کے جی میں جانے کیا آئی کہ انھوں نے چلّا کر کہا۔ بس اب چلی جاؤ۔ اور جب وہ عورت چلی گئی تو ماتری صاحب نے ایک قہقہہ لگایا اور مجھ سے کہا۔ "تم بھی کیا کہتے ہوگے کہ عجیب آدمی ہے۔ اس کی مدد بھی کی اور اُسے ڈانٹ بھی دیا" اور پھر مسکراتے ہوئے کہا "بات یہ ہے کہ میری جیب میں یہی ایک نوٹ تھا اور جب میں نے اُسے نوٹ دیا اور وہ اپنی بپتا سناتی رہی تو میرے جی میں آئی کہ میں اس سے سو روپے کا نوٹ واپس لے کر اور اُسے تڑوا کر پچاس روپے اسے دے دوں اور باقی پچاس روپے خود رکھ لوں۔ لہٰذا میں نے اسے ڈانٹ کر نکال دیا"

ماتری مرحوم سے کسی نے پوچھا۔ آپ گجراتی زبان کے ادیب اور صحافی ہیں لیکن آپ اردو زبان میں اخبار نکال رہے ہیں، تو یہ کیسے ہوگا؟ ماتری صاحب نے کہا کہ اُردو پر میرا سب سے زیادہ حق ہے۔ کیوں کہ میرے جدّ امجد وَلی گجراتی اُردو کے پہلے شاعر تھے اور اردو زبان سیکھنے کے لیے میں نے ایک ٹیوٹر رکھ لیا ہے جسے میں تین لاکھ روپے ماہانہ دیتا ہوں اور اس کا نام "حُرّیت" ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ دو چار سال کے بعد ماتری صاحب بڑی روانی سے اُردو میں اداریے لکھوانے لگے۔

"حرّیت" کے اجرا سے پہلے ماتری صاحب الیوب خان سے اُن کی تصویر لے کر آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ حُرّیت کے پہلے شمارے کے ٹائٹل پر یہ تصویر چھاپیں گے لیکن ماتری صاحب نے میرے سامنے ایک تصویر رکھی جس میں بے شمار کسان اور مزدور اور عوام ایک جگہ بیٹھے تھے۔ ماتری صاحب نے کہا کہ اس تصویر کے نیچے یہ لکھو کہ یہ پاکستان کے

اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ ہیں۔ اور میں نے تصویر کے نیچے یہ لکھا :

"یہ پاکستان کے عوام ہیں۔ یہ اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ ہیں۔ یہ ملک انھوں نے بنایا ہے اور یہ ملک انھی کا ہے۔ یہی اِس ملک کے مالک ہیں۔ "حریت" پاکستان کے عوام کو، پاکستان کے اقتدارِ اعلیٰ کو سلام کرتا ہے۔"

مائزی صاحب قرضوں پہ قرضے لیتے رہے اور "حریت" کو بہتر سے بہتر پرچہ بنانے میں مصروف رہے۔ جب شام کو قرض خواہ ان سے ٹیلی فون پر مطالبہ کرتے تو وہ ہم سب کو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں یہ کہہ کر لے جاتے کہ آؤ شامِ غریباں منائیں۔ اور پھر ٹیلی فون پر قرض خواہ کو، جو ایک کاغذ والے بزرگ تھے، جی بھر کے جلی کٹی سناتے۔ وہ بولتے رہتے اور ہم ان کے پاس بیٹھے رہتے۔ ہمارے بیٹھنے سے ان کو تقویت پہنچتی۔

وہ آپس میں مشورہ کرنے کو مشاعرہ کہا کرتے تھے۔ ایک دن مجھ سے اور سید حسن مثنیٰ صاحب سے یہ کہنے لگے کہ آج اللہ میاں کچھ خفا معلوم ہوتا ہے۔ دوپہر ہو گئی اور کوئی مصیبت یا پریشانی نہیں آئی۔ وہ آفات و مصائب میں قہقہے لگاتے اور ان قہقہوں سے دن بھر کی تھکن دور ہو جاتی — اور پھر یہ ہوا کہ یہ جواں سال صحافی اور ادیب چپ چاپ ۴۴ برس کی عمر میں ہم سے رخصت ہو گیا۔ جب مائزی صاحب کا انتقال ہوا تو ان کے گھر میں پورا مہینہ چلانے کے لیے صرف پندرہ سو روپے تھے۔ اور اخبار پہ بے پناہ قرضے چڑھے ہوئے تھے۔ مائزی ایسے انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

مت سہل "انھیں" جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں!!

سیماب اکبرآبادی

علامہ سیماب اکبرآبادی کے شاگردوں کی نفری داغ دہلوی کے شاگردوں سے کم نہ تھی۔ داغ کے بارے میں تو یہ سنا ہے کہ اگر کوئی نوآموز شاعر ان کے قریب سے گزر جاتا تو وہ اُس کا نام اپنے شاگردوں کے رجسٹر میں لکھ لیتے لیکن سیماب صاحب کے یہاں تو باقاعدہ شاگردوں کا دفتر تھا۔ وہ اپنے شاگردوں سے فیس بھی لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا شاعری سکھانے کا ایک اسکول بھی تھا۔ وہ معاوضہ لے کر غزلیں، نظمیں، سہرے وغیرہ بھی لکھا کرتے تھے۔ وہ ریلوے کے محکمے میں ملازم تھے۔ اور جب وہاں سے ریٹائر ہوئے تو پھر شاعری کو انھوں نے باقاعدہ ذریعہ معاش بنالیا۔ وہ پُرگو ہونے کے باوجود اچھے شعر کہتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ساغر نظامی کا بڑا شہرہ تھا۔ آخر میں استاد شاگرد میں اَن بن ہوگئی اور تعلقات ہمیشہ کے لیے بگڑ گئے۔

مسلمان ریاستوں میں سیماب صاحب کے بہت سے شاگرد تھے اور خاص طور سے اُن میں رؤسا اور شہزادے شامل تھے اور امریکہ میں ہمارے سابق سفیر مسٹر ایس ایم خاں کے بڑے بھائی صاحبزادہ سلطان حامد خاں کی جو ثروت تخلص کرتے ہیں، سیماب صاحب سے خط و کتابت رہتی۔ وہ اُن کی غزلوں کی اصلاح کرتے۔ میرے ماموں زاد بھائی عبدالمتین خاں متین گلشن آبادی مرحوم بھی اُن کے شاگرد تھے۔ سیماب صاحب سے میری ملاقات سلطان حامد خاں کے یہاں ہوئی۔ میرے ایک رشتے کے نانا جو عبدالمتین خاں کے حقیقی نانا تھے، بڑے عالم فاضل اور صوفی بزرگ تھے۔ اُن کا نام یوسف خان تھا اور جو پیرجی محمد یوسف کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ یہ وہی پیرجی محمد یوسف ہیں جنھوں نے مولانا روم کی مثنوی کا ترجمہ کیا اور جو پیراہن یوسفی کے نام سے مشہور ہے اور جسے منشی نولکشور نے چھاپا تھا۔ اُس کا ایک نسخہ عبدالمتین خاں نے اپنے استاد گرامی کی خدمت میں پیش کیا تھا اور سیماب نے اس سے استفادہ کیا۔

میں جب حیدرآباد سے اجمیر آیا تو علامہ فضائی مرحوم جو اجمیر کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے رُوح و رواں تھے، میرے عزیز ترین دوست جناب شاہ نورخاں کے تعاون سے، جو بڑے پائے کے شاعر

اور علم موسیقی کے ماہر ہیں، معینیہ اسکول میں آل انڈیا مشاعروں کا اہتمام کرتے تھے۔ رضیہ سجّاد ظہیر کے والد سید رضا حسین صاحب معینیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور میرے کرم فرما تھے اور شہر کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا کرتے تھے، چنانچہ اجمیر کے مشاعروں کے سلسلے میں بھی میری سیماب صاحب سے ملاقات ہوتی رہتی۔ سیماب صاحب ترنّم سے پڑھتے تھے اور ان کی آواز بہت اچھی تھی۔ اور جب پاکستان بن گیا تو سیماب صاحب بھی پاکستان چلے آئے۔ ۱۹۴۹ء میں جب ریڈیو پاکستان کے کراچی اسٹوڈیوز کا اجرا ہوا تو اس وقت میں ریڈیو پاکستان پشاور میں ملازم تھا۔ دو تین مہینے وہاں رہنے کے بعد میرا کراچی ریڈیو اسٹیشن پر تبادلہ ہو گیا۔ ریڈیو پاکستان انٹیلی جینس اسکول کی ایک فوجی بارک میں تھا۔ بخاری مرحوم نے ہندوستان کے ان تمام ادیبوں اور شاعروں کو جو خانماں برباد ہو کر یہاں آئے تھے اور نہایت کسمپرسی کی حالت میں تھے، کسی نہ کسی طور سے ریڈیو پاکستان میں کھپا لیا تھا۔ روزانہ ایک شاعر سے اس کا کلام سنوایا جاتا۔ پھر ہفتے میں ایک بار ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہو جاتا اور مہینے کے آخر میں ایک بڑے مشاعرے کا اہتمام کیا جاتا۔ ان میں سے کچھ ادیب اور شاعر سٹاف آرٹسٹ ہو گئے اور کچھ ایسے تھے جنھیں مہینے بھر میں سو دو سو روپے کے پروگرام مل جاتے۔ بخاری صاحب نے علّامہ سیماب اکبرآبادی کے لیے ایک نیا پروگرام "مصدر نامہ" شروع کیا تھا۔ اس میں وہ مصدر اور مصدر کے مشتقات اور مضارع وغیرہ بتاتے اور اس کا معاوضہ پانچ سو روپے ماہانہ پاتے۔

ایک مرتبہ نہال سیوہاروی مرحوم میرے پاس بیٹھے تھے سیماب صاحب بھی تشریف لے آئے۔ سیماب صاحب نے کہا "ہم کیسے کیسے نوادر ہندوستان میں چھوڑ آئے۔ پھر جب ملک کی تقسیم ہوئی تو ہندوستان سب کچھ دبا کر بیٹھ گیا۔ اس تقسیم میں ہمیں کیا ملا۔" نہال صاحب نے کہا: "بجا فرمایا۔ اب شاعروں ہی کو دیکھیے۔ پاکستان کے ہاتھ کیا آیا۔ یا آپ آئے اور یا میں آیا۔" سیماب صاحب سب کی سنتے اور سب کچھ سنتے۔ اور خاموش رہتے۔ وہ بڑے ضبط کے آدمی تھے۔ اگر انھوں نے شاعری کو ذریعۂ معاش بنایا اور لوگوں کی فرمائش پر لکھا اور اس کا معاوضہ لیا تو اپنے حالات کے مطابق انھوں نے برا نہیں کیا۔ کچا ساتھ تھا، بڑا کنبہ تھا۔ آخر اتنے سارے لوگوں کا پیٹ وہ کیسے پالتے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ اپنی صلاحیتیں اور اپنا قیمتی وقت تجارتی اصولوں پر بھینٹ چڑھانے کے باوجود ان کی شاعری کے معیار اور ان کی شاعرانہ عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج بھی برِصغیر پاک و ہند کے چوٹی کے شاعروں میں ان کا نام آتا ہے۔

سیماب صاحب میانہ قد و قامت کے آدمی اور فربہ اندام تھے۔ کشادہ پیشانی۔ بھرے بھرے رخسار کسی زمانے میں گورے چٹے تھے آخری عمر میں تھوڑے سے سنولا گئے تھے۔ ایک نشست میں ایک غزل کہہ ڈالتے۔ کچھ وقت شاگردوں کی غزلوں کی اصلاح میں گزر جاتا۔ پھر کچھ فرمائشیں پوری کرتے۔

کچھ وقت تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا۔ گویا دن ہو یا رات، وہ کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی طرح کے کاموں میں لگے رہتے۔ اس میں لالچ کا دخل نہیں تھا بلکہ زندگی کی گاڑی کو مارے باندھے دھکیلنا تھا۔ اور پھر یہ سانحہ کہ ان پر فالج کا حملہ ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیّد محمد جعفری، ظریف جبل پوری، مولانا ماہر القادری، ڈاکٹر عبدالرحمٰن خاں، شاہد احمد دہلوی، شمس زبیری، ڈاکٹر اسلم قریشی اور اس حقیر فقیر کا ٹھیا ڈاکٹر یاور عباس کا مطب تھا اور سیماب صاحب ڈاکٹر یاور عباس کے زیرِ علاج تھے۔

جب یہ خبر کہ علامہ سیماب اکبرآبادی پر فالج کا حملہ ہوا ہے، ہم لوگوں کو پہنچی تو ہم سب ڈاکٹروں کی معیت میں سیماب صاحب کے مکان پر پہنچے۔ سیماب صاحب ہوش میں تھے لیکن اُن کی زبان پر فالج کا اثر تھا۔ اور یہ گویا سیماب صاحب سے آخری مُلاقات تھی۔ اُنھوں نے ڈاکٹر یاور عباس سے کہا کہ میری عمر کا بڑا حصّہ پیٹ پالنے کے کاموں کی نذر ہوگیا۔ میں معیاری شاعری کرنا چاہتا تھا، لیکن مجھے مزدوری سے فرصت نہ ملی اور مجھے اپنی زندگی میں اطمینان کی سانس لینا نصیب نہ ہوئی۔ ہاتھ تھک گیا اور دماغ مفلوج ہوگیا۔ اور یہ کہتے کہتے اُن کی آنکھیں بھیگ گئیں اور اُن کی آواز بھرا گئی ـــ اور ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اور پھر ایک دن یہ سُنا کہ سیماب صاحب قیدِ حیات و بندِ غم سے چھٹکارا پا گئے۔ اور اُنھوں نے اِس دُنیا میں جو آخری سانس لی تو شاید وہی ان کی نجات اور اطمینان کی پہلی سانس تھی۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے۔ (آمین)

اختر شیرانی

گندمی رنگ - ادھ کھلی غلافی آنکھیں - دُہرا ڈیل - سر کے بال اُلٹے جمے ہوئے - انار کے دانوں کی طرح چھوٹے چھوٹے دانت - تھوڑا سا لمبوترا چہرہ - کھڑی ناک - درمیانہ قد - لٹھے کی شلوار اور ریشمی قمیص - باریک کتری ہوئی مونچھیں -

شراب نہیں پیتے تو بجھے بجھے سے رہتے - یوں لگتا جیسے چراغ میں تیل ختم ہو گیا ہے - یا جیسے کوئی پھول کمھلا گیا ہے - ایسی حالت میں اُن سے مل کر ہول آتا - وہ کھُل کر بات نہ کر پاتے اور نہ اُن کی بات میں مزا ہوتا - اور جب شراب پیتے اور سرور گھٹتا تو اپنے خول سے نکل آتے - اور یہ دوسرے ہی اختر ہوتے -

ایک مرتبہ میں نے اپنے ایک دوست سے اختر کا تعارف کرایا - اختر خوب پیے ہوئے تھے - اُن کی بھولی بھولی باتیں سن کر اور اُن کی بچوں ایسی شرارتیں دیکھ کر میرے دوست نے کہا :

"یار اگر شراب پی کر انسان ایسا ہی معصوم ہو جاتا ہے تو شراب ضرور پینی چاہیے -"

بات یہ ہے کہ شراب پی کر اندر کا انسان باہر آجاتا ہے - اور در اصل انسان یہی ہوتا ہے -

اختر سراپا پیار تھے - خلوص تھے - اُن کا بچپن اُن کی جوانی میں بھی اُن پر مسلط رہا - وہی بھولپن - وہی بچوں ایسی معصوم معصوم سی شوخیاں - وہی ضد - بڑھاپا تو خیر ایسے لوگوں پر آتا ہی نہیں ہے -

وہ عشق کرنے کی آرزو میں مرتے رہے لیکن ان میں روایتی عشق کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی - (یہ تو فن شاعر حجاب ہے) اور اختر کا مزاج سیمابی تھا - وہ بلا کے شرمیلے تھے - یوں عشق کرنے کو اُن کا بہت جی چاہتا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح شروع کریں - اگر وہ دُور سے کسی لڑکی کو دیکھ لیتے تو تڑپ اٹھتے - اگر کسی مکان کی کھڑکی میں کسی کی جھلک دیکھتے تو دل پکڑ کر بیٹھ جاتے اور پھر ان کے عشق کا افسانہ شروع ہو جاتا - البتہ لڑکی کی نشان دہی اس کی رُسوائی کی وجہ سے نہ کرتے - اور پھر کوئی لڑکی بھی ہو - وہ تو لڑکی کی جھلک کو ہی لڑکی سمجھ لیتے تھے اور پھر وہ لڑکی کا کوئی اچھا سا نام رکھ لیتے - یہ ضرور ہے کہ ان کی رومانی شاعری کی وجہ سے بہت سی لڑکیاں اُن پر مرنے لگی تھیں - ان کو محبت بھرے خطوط بھی موصول ہوتے لیکن اختر کا جواب بڑا عصمت مآب ہوتا - ان کا حال یہ تھا کہ اگر کوئی لڑکی اُن کے قریب آکر بیٹھ جاتی تو ان کی نظریں زمین سے نہ اٹھتیں اور وہ سوچتے کہ کسی طرح کھڑکی سے چھلانگ لگا کر بھاگ جائیں -

یہ جو اختر کی شاعری میں سلمیٰ، عذرا اور ریحانہ ہیں، وہ حقیقی شخصیتیں نہیں ہیں جس نے ایک جھلک دکھا کر ان کا دل موہ لیا بس اسی کا کوئی اچھا سا نام رکھ دیا۔ اور اس پہ کوئی نظم ہو گئی یا اس سے متاثر ہو کر کوئی غزل کہہ دی یا وہ جھلک کسی سانیٹ کا موضوع بن گئی۔ غرض کہ ہر شہر میں اختر کی کوئی محبوبہ ضرور تھی۔ امرت سر آئے تو کہا:

امرت سر اُس پری کا نشیمن ہے آجکل

کبھی خیبر کی نواحی میں انھوں نے کسی فتنۂ محشر کو خراماں دیکھ کر یہ کہا:

خیبر اور اس کے نواحی میں ٹہلنے والو

کبھی لاہور کے لارنس کو بھی یاد کرو

گجرات میں تو خیر سلماؤں کا ہجوم تھا۔ پھر ایک ایسی بھی وادی تھی جہاں ریحانہ رہتی تھی۔

اختر راجپوتانے کے شرفا اور پٹھانوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ویسے اُن کا قبیلہ اور ان کے بزرگوں کا وطن صوبہ سرحد اور بلوچستان کی سرحد پہ تھا۔ اس خاندان میں اخلاقی پابندیاں پہاڑوں کی چٹانوں سے زیادہ سنگین تھیں۔ اختر اس خاندان کا ایک باغی بچہ تھا، اور اس بغاوت کی سزا وہ اپنے سخت گیر باپ سے عمر بھر پاتا رہا۔ اس نے اُردو شاعری میں بھی بغاوت کا نشان اُٹھایا۔ پہلے غزل میں درباری رنگ تھا۔ یہ خلوت کی شاعری تھی۔ اس میں بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔ اس کے آداب تھے۔ پابندیاں تھیں۔ بڑے صبر آزما قاعدے تھے اور شاعری میں عورت کا نام لینا گناہ تھا۔ آج ایسی شاعری کرنے کا کسی میں حوصلہ نہ تھا۔ حسرت بھی کھُل کھیلنے کی جُرأت نہ کر پائے۔ اقبال کی قومی شاعری کا چرچا تھا۔ ظفر علی خاں کی سیاسی نظمیں ذہنوں پر مسلط تھیں۔ لیکن متوسط طبقے کے لوگوں کے دل بند تھے۔ نئی نسل کمُلا رہی تھی۔ جوانی کی اُمنگوں کے اظہار کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ پھر بازاری اور درباری شاعری کے درمیان کوئی چیز نہ تھی۔ اختر نے بھرپور جوانی کی نشہ آور اور رنگ ترنگ کی شاعری کو رواج دیا۔ یہ پیار کی شاعری تھی۔ جوانی کی شاعری تھی۔ اس سے بھاری بھرکم شاعری کا بوجھ ہلکا ہوا۔ لوگوں نے نجات کا سانس لیا۔

اختر کی شاعری میں شوخی بھی ہے اور کھلنڈرا پن بھی۔ یہ خالص جذبات اور کہیں کہیں شدتِ جذبات کی شاعری ہے۔ اسی شاعری میں فیض اور راشد کی مسیں بھیگیں۔ فیض اور راشد نے شاعری میں نئے تجربے کیے۔ شاعری کی ہیئت بدلی۔ ان کی شاعری میں گہرائی بھی آئی اور گیرائی بھی۔ اس طرح اختر شاعروں کی نئی نسل کا پیش رَو ہے۔ وہ جذباتی شاعری یا رومانی شاعری کا امام ہے۔ اُس کی شاعری خواب و خیال کی شاعری ہے۔ ارمانوں اور امنگوں کی شاعری ہے۔ اس کی بحریں مترنم۔ قوافی نرم و نازک اور الفاظ شیریں۔ ہندی کے دل موہ لینے والے الفاظ استعمال کر کے وہ اپنی شاعری کی موسیقی میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اختر کی امیجری بڑی دل کش ہے۔ فطری جذبات کا اظہار کرتا ہے تو اُس پر امرؤالقیس کا گمان ہوتا ہے۔ تغزل میں حافظ کے قریب سے گزر جاتا ہے۔ کہیں وہ

شیلے ہے تو کبھی کیٹس ۔ اور کبھی دونوں کا دل کش امتزاج ۔ اختر فارسی کے تو خیر منتہی تھے ہی۔ عرب شعرا کا کلام اور عربی ادب بھی ان کی نظر سے گزر چکا تھا ۔ انگریزی خوب جانتے تھے ۔ ان کی معلومات اور حافظے کی یہ حالت تھی کہ خود ان کے والد مولینا محمود شیرانی مرحوم بعض باتیں ان سے دریافت کرتے ۔ مولانا محمود شیرانی ثقہ بزرگ تھے، اور صاحب زادے رند۔ لہٰذا دونوں باپ بیٹوں میں بنتی نہیں تھی ۔ ویسے میں نے اختر کو مولینا کا جتنا ادب کرتے دیکھا ہے شاید ہی کوئی بیٹا اپنے باپ کا اتنا ادب کرتا ہو ۔ مولینا ، اختر کی شراب نوشی اور اُس کی صحبت اور اُس کی بے باک شاعری کی وجہ سے اُس سے خفا رہتے تھے ۔ یہاں تک کہ انھوں نے اختر کو علیٰحدہ کردیا تھا ۔ اور وہ مولینا کے مکان کے سامنے ایک مکان کی دوسری منزل پر رہا کرتا تھا ۔ اُس کے کمرے میں مولانا چراغ حسن حسرت ، میراجی اور مولینا کے شاگرد رشید سید محمد جعفری بھی اکثر نظر آیا کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ مولینا محمود شیرانی جب دکن سے واپس آئے تو انھوں نے سید محمد جعفری کو بلوایا اور فرمایا :

" جانتے ہو تمھارے دوست کی وجہ سے میں کتنا بدنام ہو رہا ہوں ۔ دکن میں ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے اور کہنے لگے " شیرانی صاحب ! آپ کی یہ نظم ہمیں بہت پسند آئی ۔" میں نے کہا " کون سی نظم ؟" فرمایا ۔ " بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں ۔"

اختر سے میری پہلی ملاقات امرت سر میں ہوئی ۔ یہاں شہر کے بڑے بازار میں ، جس کا نام ہال بازار ہے ، ایک بڑا ہوٹل تھا ۔ اس ہوٹل کا مالک بھی عجیب دیوانہ تھا ۔ یہ خود نہ شاعر تھا نہ گویا ۔ لیکن اپنا مال اور اپنی ساری زندگی شاعروں اور موسیقاروں پر لٹاتا رہتا تھا ۔ اس کا نام عزیز (جیجا) تھا ۔ یہ اختر کا دوست بھی تھا اور بے پناہ معتقد بھی ۔ اور اختر ہی نے اس کے ہوٹل کا نام شیراز ہوٹل رکھا تھا ۔ شیراز ہوٹل پر اختر نے بیس بائیس اشعار کی ایک نظم بھی کہی ہے ۔ اختر ہر مہینے میں ہفتہ دو ہفتہ شیراز ہوٹل میں گزارتا اور یہاں بڑی رنگین محفلیں جمتیں ۔ شیراز ہوٹل میں شہر کے نامی گرامی ادیب ، آرٹسٹ اور موسیقار اُمڈ آتے ۔ شہید گنج کی تحریک اپنے عروج پر تھی ۔ مولینا ظفر علی خان مسجد شیخ خیرالدین میں تقریر کر رہے تھے ۔ اور اختر شیراز ہوٹل میں بیٹھے شراب پی رہے تھے ۔ اُدھر مسجد کی جانب سے یہ نعرے اُٹھ اُٹھ کر ہوٹل کی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے ظفر الملت والدین حضرت مولینا ظفر علی خان زندہ باد ۔ مسجد شہید گنج زندہ باد ۔

جیجے نے اختر سے کہا : ایک تم بھی ادیب اور شاعر ہو اور ایک مولینا ظفر علی خان بھی ادیب اور شاعر ہیں ۔ لیکن سارے ہندوستان میں اُن کا طوطی بول رہا ہے ۔ جہاں جاتے ہیں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں اور تمھیں کوئی پوچھتا ہی نہیں ؟

اختر نے کہا " ابے تو مجھے کیا سمجھتا ہے ۔ اگر ایک پرچہ لکھ کر بھیج دوں تو مولینا تقریر چھوڑ کر سیدھے یہاں چلے آئیں ۔"

جیجے نے کہا۔ "بے یار لکھ تو پرچہ۔ اگر مولینا آگئے تو ۲ بوتلیں وہسکی کی دوں گا۔"

اختر نے ایک پرچہ لکھا۔ جیجے نے کسی طریقے سے مولینا تک پہنچا یا۔ اور مولینا تقریر ختم کرنے کے بعد جیجے کے ساتھ سیدھے شیراز ہوٹل چلے آئے۔ سڑک پر مولینا کے چاہنے والوں کا ہجوم تھا۔ جیسے ہی مولینا ہوٹل میں داخل ہوئے اختر نے شراب کی بوتل چھپا دی۔ مولینا نے آگے بڑھ کر اُسے گلے سے لگا لیا۔ اگرچہ اختر کے منھ سے شراب کا بھبکا ضرور اُڑا ہوگا اور مولینا کو پتا بھی چل گیا ہوگا کہ وہ پیے ہوئے ہے۔ لیکن مولانا کوئی کٹھ ملا تو تھے نہیں۔ بڑے آدمی تھے، انھوں نے پتا بھی نہیں چلنے دیا۔ اتنے میں عزیز کہیں سے حُقّہ لے آیا جس کے مولانا رسیا تھے۔ پھر چائے آگئی۔ مولینا کے اصرار پر اختر نے چند اشعار سُنائے۔ اور مولینا سے فرمائش کی کہ وہ بھی چند اشعار بطورِ تبرک ارشاد فرمائیں۔ چنانچہ اختر ہی کی بحر اور قوافی میں مولینا نے بھی شیراز ہوٹل پر بیس اشعار کی ایک نظم کہی جس میں عزیز (جیجے) کو مولینا نے عزیزِ مصر بنا دیا۔

ایک دفعہ میں اور بالا اختر کے یہاں گئے۔ وہ ایک اونچی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ چارپائی کے نیچے سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ بالے نے پوچھا "یہ دُھواں کیسا ہے؟"

اختر نے آواز دی "مولانا تشریف لے آیئے۔ یہ لوگ غیر نہیں ہیں، اپنے ہی ہیں۔"

دیکھا تو یہ مولانا چراغ حسن حسرت تھے جو چرس سے بھرا ہوا سگریٹ پی رہے تھے۔

اختر امرت سر کے دِل دادہ تھے۔ امرت سر کی یادیں اُن کے اشعار میں بھی پائی جاتی ہیں۔ میری شادی کی تقریب میں انھوں نے فارسی زبان میں میرا سہرا کہا۔ یوں ان کا کلام فارسی میں بہت کم ہے اور شاید فارسی میں انھوں نے یہی سہرا کہا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

بہار در پردہ گل درکنار می آید — نسیمِ گل ز کدامی دیار می آید
خوشا ہوائے فرح بخش شہر امرت سر — کہ مست و بے خود و بے اختیار می آید
مگر بہ بزمِ طرب بار دادہ نصر اللہ — نسیم راکہ چو گل مشک بار می آید
زہے نشاطِ عروسی خجستہ فسون ہوا — کہ زندہم رود و مے گسار می آید
بصحنِ خانقہ بلبس قرابہ بشکستہ — ز بام "مدرسہ" بانگ ہزار می آید
ہزار بار مبارک عروسِ جاں خرام — کہ تہنیت ز زمین و یسار می آید
مگر بہ شوقِ دگر توبہ را شکست اختر — کہ سوئے مے کدہ مستانہ وار می آید

جب کبھی روزنامہ زمیندار میں لوگوں کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں اور وہ کام پر نہیں آتے تھے تو مولینا ظفر علی خان ایک پرچہ لکھ کر اختر کو بلا لیا کرتے تھے اور اختر زمیندار کے دفتر چلے آتے اور پھر وہ فی البدیہہ ایک نظم کسی سیاسی موضوع پر زمیندار کے سرورق کے لیے لکھتے اور مولانا منظوم اداریہ قلم بند کرتے۔ اختر کبھی منظوم اور کبھی نثر میں نکاہی کالم بھی لکھتے۔ اور پھر دو چار کالجوں کے لڑکے بیٹھ کر خبروں کا ترجمہ کر ڈالتے تھے۔

"زمیندار" کے سرورق پر اراکین ادارۂ تحریر میں مولینا ظفر علی خان کے سامنے اختر کا نام یوں لکھا جاتا:
"اختر شیرانی مدیر اعزازی"

اختر بہت شرمیلے تھے۔ ایک دن انارکلی میں ایک دکان پر بیٹھے تھے اور رفیق غزنوی سائیکل پر سوار تھے۔ رفیق نے کہا۔ "اختر صاحب! میں نے غزل کہی ہے آپ مجھے اپنا شاگرد بنالیں۔" اختر نے کہا۔ "میں کس قابل ہوں۔" رفیق نے پیڈل پاؤں سے دبایا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ "جب آپ اس قابل ہو جائیں تو مجھے مطلع کر دیں۔"

پروفیسر ڈاکٹر تاثیر امرت سر کے ایم او کالج کے پرنسپل ہو کر آئے تھے اور اسی کالج میں فیض بھی تھے۔ ایک زمانہ یہ تھا کہ تاثیر اور فیض اختر سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اختر شیراز ہوٹل میں آکر ٹھہرے اور یہاں کئی دن رہے۔ اُن سے ملنے کے لیے اُن کے کئی دوست احباب آئے اور نہیں آئے تو تاثیر اور فیض نہیں آئے جس کا اختر کو بہت قلق ہوا۔ ایک دن میں اور بالا شیراز ہوٹل میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو دیکھتے کیا ہیں کہ فیض اور تاثیر چلے آرہے ہیں۔ تاثیر کا مزاج خاصا مشفقانہ تھا۔ وہ اختر کو یہ سمجھانے لگے کہ زیادہ شراب پینا اچھا نہیں ہے۔ اور اس نے شراب پی کر اپنی جو درگت بنائی ہے تو اس سے اس کے دوست بھی شرمندہ ہیں۔ اختر نے کہا: آپ میری دوستی کی وجہ سے شرمندہ نہ ہوں۔ اگر آپ میرے پینے کی وجہ سے شرمندہ ہیں تو میں آپ کے نہ پینے پر بھی شرمندہ ہوں۔" جب یہ لوگ چلے گئے تو اختر مجھ سے کہنے لگے۔ "بات تاثیر نے ٹھیک کہی لیکن اُس کے لہجے نے مجھے دکھ پہنچایا ہے۔" اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے فی البدیہہ یہ شعر کہا:

کسی کو کیا خبر حالِ دلِ ناکام کیا ہوگا
میں اکثر غور کرتا ہوں مرا انجام کیا ہوگا

پھر بعد میں یہ غزل پوری ہو گئی۔

جب مجھ سے اختر کی بہت بے تکلفی ہو گئی تو وہ دو ایک دن شیراز ہوٹل میں رہ کر میرے گھر اُٹھ آتے تھے۔ میں اختر کی شراب کے لیے اپنے والد سے پیسے لیتا اور خود شراب خانے سے اس کے لیے ٹھرا خرید کر لاتا۔ پھر میں اور اختر کمپنی باغ میں جاکر ساری رات گزارتے۔ اور وہ کس کس طرح سے باغ میں ٹہلتا۔ گھاس پر لوٹتا۔ ستاروں کو دیکھ کر ناچتا۔ پھر صبح ہونے سے پہلے ہم گھر لوٹ آتے۔

اختر ایک آدھ روٹی سے زیادہ نہیں کھا سکتا تھا۔ البتہ ہر وقت سگریٹ پیتا یا شراب۔ گرمیوں میں "ٹب میں برف ڈال کر ٹھنڈے پانی میں اپنے پاؤں ڈال کر بیٹھ جاتا۔ میرے والد آتے تو وہ مجھ سے کہتا کہیں سے ٹوپی لے آؤ۔ میں ٹوپی لاتا اور وہ ٹوپی پہن کر بڑا مودب ہو کر بیٹھ جاتا۔

اختر کو شعر پڑھنا کبھی نہیں آیا۔ عزیز اس کے شعر ترنم سے پڑھتا۔ ایک مرتبہ ٹونک میں ایک پٹواڑی

نے اختر سے کہا:

"میاں تم بھی شعر کہتے ہو۔ لیکن ریڈیو سے شکیلؔ اور بہزادؔ کی غزلیں نشر ہوتی ہیں اور تمھاری غزلوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ آخر تم اتنے مشہور کیوں نہیں ہو؟" اخترؔ کو غصّہ آگیا۔ کہنے لگا "تو نہیں جانتا ہم کون ہیں۔ ہم ادیب الملک اخترؔ شیرانی الافغانی مدیر رومان ہیں۔ لا اسی بات پر ایک بیڑی پلا۔"

آغا حشرؔ کے یہاں ایک ادبی محفل تھی۔ اس میں اخترؔ بھی شامل تھے۔ آغا صاحب نے کہا۔" اپنی محبوبہ کو بہترین ماحول میں پیش کیا جائے اور اس سلسلے میں فی البدیہہ اشعار کہے جائیں"۔ کس نے کیا کیا کہا یہ تو مجھے یاد نہیں۔ البتہ آغا صاحب کے دو اشعار یاد آگئے ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

اُن کا رُخ منوّر ہے زلفِ خم بخم میں
یا چاند سو رہا ہے آغوشِ کہکشاں میں
اے حشرؔ ہو مبارک ہے آج وصل کی شب
اِک چاند ہے بغل میں اِک چاند آسماں میں

جب اخترؔ کی باری آئی تو اُس نے جو کچھ کہا اُس کے یہ تین مصرعے مجھے یاد رہ گئے ہیں:

وہ روتی ہے تو ساری کائنات آنسو بہاتی ہے
وہ ہنستی ہے تو فطرت مست ہو کر مسکراتی ہے
وہ سوتی ہے تو بزمِ کہکشاں کو نیند آتی ہے

سب نے بہت تعریف کی۔ اور آغا صاحب نے فی البدیہہ یہ شعر کہا:

کہو زاہد سے کیوں ہے اس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنّتیں آباد ہیں تخیّلِ اخترؔ میں!

اخترؔ اور مجازؔ علی گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر گھوم رہے تھے۔ ان کی نظر سیکنڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ پر پڑی جہاں دو لڑکیاں ترکی برقعے اوڑھے بیٹھی تھیں۔ ایک لڑکی نے دوسری سے کہا۔ وہ دیکھو اخترؔ شیرانی۔ اخترؔ نے مجازؔ سے کہا۔ بھاگ اور ٹکٹ خرید کر لا۔ ابھی یہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچے تھے کہ گاڑی چلنا شروع ہو گئی۔ اخترؔ کے ہاتھ کوئی کمپارٹمنٹ تو نہیں آیا، گارڈ کا ڈبّہ آگیا۔ جب اخترؔ گارڈ کے ڈبے میں داخل ہوئے تو گارڈ نے روکا۔ آپ نے گارڈ کو ڈانٹ کر کہا:

"SHUT UP IT IS A MATTER OF LOVE AND ROMANCE."

اخترؔ سے میری آخری ملاقات اجمیر میں ہوئی۔ میں نصیر آباد میں تھا۔ اخترؔ نے شاہ نور خان اخترؔ سے تار دلوایا میں اجمیر پہنچا اور اخترؔ سے ملا تو وہ مجھے گلے لگا کر بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا اور کہنے لگا۔ نصر اللہ۔ میرے ابّا مر گئے۔ حالانکہ اخترؔ کے ابّا کو مرے یہ دوسرا سال تھا۔ لیکن میں نے کہا ہے نا کہ اخترؔ بچہ تھا۔ جب اخترؔ اپنی

سوتیلی والدہ کا نام لیتا تو بڑے ادب سے لیتا۔

باتے نے کہا "یارتم اپنی سوتیلی والدہ کا نام اس طرح لیتے ہو جیسے کوئی کعبۃ اللہ کا نام لے رہا ہے۔"

کہنے لگا۔ "سوچو۔" اور یہ کہہ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "اگر میری اپنی اماں زندہ ہوتیں تو میں ان کا نام کس طرح لیتا۔"

مولینا محمود شیرانی صاحب کی دوسری بیوی بھی اختر کو اپنی بھرپور محبت دینا چاہتی تھیں لیکن مولینا پُرانے ڈھنگ کے آدمی تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ اس پیار سے کہیں وہ اور نہ بگڑ جائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قابل آدمی اور اچھا آدمی اچھا باپ بھی ہو۔ اور وہ پیار جو اختر اپنی ماں اور اپنے باپ سے دل کھول کر نہ پا سکا اسی پیار کے لیے وہ زندگی بھر ترستا رہا۔ اور اس نے کسی عورت سے شاید اسی ڈر کی وجہ سے پیار نہیں کیا کہ وہ اُسے اُس کی ماں کا پیار اگر نہ دے سکی تو کیا ہو گا۔ آخری عمر میں وہ عجیب عجیب باتیں کرتا۔ مجھ سے کہتا۔ دیکھو۔ جب میں رات کو پیشاب کرنے کے لیے صحن میں آتا ہوں تو چاروں طرف سے بلائیں آ کر مجھے گھیر لیتی ہیں۔ اور میں اس کے دل سے یہ وسواس مٹانے کے لیے کہتا۔ میری جان۔ جوانی کی سلمائیں اسی طرح بڑھاپے میں بلائیں نظر آنے لگتی ہیں۔

احسان دانش

رنگ سیاہ فام، درمیانہ قد، سر بالوں سے خالی، کلین شیو۔ ان کا بدن اس پہلوان کی طرح تھا جس نے زور کرنا چھوڑ دیا ہو۔ (ویسے انھوں نے جوانی میں پہلوانی بھی کی تھی) بڑی بڑی سیاہ سوچتی ہوئی آنکھیں جن میں کبھی کبھی اسکول کے بچوں کی طرح معصوم سی شرارت بھی جھانکنے لگتی۔ سر پر بالوں والی ٹوپی پہنتے اور کبھی ننگے سر بھی ہوتے۔ کبھی شیروانی، کبھی کتھئی رنگ کا لمبا کرتا اور پاجامہ پاؤں میں کبھی پمپ اور کبھی چپل۔ یہ تھے مزدور شاعر احسان دانش۔

مظفر نگر کے ایک قصبے کاندھلے کے باشندے تھے اس لیے کاندھلوی کہلاتے تھے۔ میں نے احسان دانش کو پہلی مرتبہ امرت سر کے ایک مشاعرے میں دیکھا جو ٹاؤن ہال میں سر عبدالقادر کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ اسٹیج پر فرخ امرت سری کے قریب منظور دلی وارثی بیٹھے تھے جو اس زمانے میں کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ اور یہ امرت سر کے رؤسا کے ایک مشہور خاندان کے فرد تھے۔ اسٹیج کے قریب زمین پر ایک شخص پھٹے حالوں بیٹھا تھا چہرے مہرے سے مزدور معلوم ہوتا تھا اور وہ بار بار فرخ امرت سری سے کچھ کہنا چاہتا اور وہ اس کا کاندھا دبا کر اسے بٹھا دیتے۔

منظور دلی وارثی نے فرخ صاحب سے آہستہ سے پوچھا۔ "یہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟"

جواب میں فرخ نے کچھ کہا ہوگا جو میں نہیں سن سکا۔ یہ ساری باتیں سرگوشیوں میں ہو رہی تھیں۔ اور پھر دو چار شاعروں کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ ایک صاحب احسان بن دانش جن کا نام ہماری فہرست میں نہیں ہے، اپنا کلام سنانا چاہتے ہیں، لہٰذا وہ تشریف لائیں۔

چنانچہ وہ شخص جسے فرخ صاحب بار بار بٹھا رہے تھے اپنی نشست سے اٹھا اور اسٹیج پر آیا۔ اسے دیکھ کر لوگوں کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی اور جب اس نے اپنا کلام سنایا تو سماں بندھ گیا۔ وہ داد ملی کہ جو شاید ہی اس سے پہلے کبھی شاعر کو ملی ہو۔ ایک تو آواز کا جادو اور پھر دل سے نکلی ہوئی اور درد میں ڈوبی ہوئی بات۔ اور جب مشاعرہ ختم ہوا تو سر عبدالقادر اسے اپنے ساتھ اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔ اور پھر احسان کے کلام کی ایسی شہرت ہوگئی کہ مشاعرہ اور

احسان لازم و ملزوم ہو گئے۔ ہندوستان میں جس شہر میں آل انڈیا مشاعرہ ہوتا، وہاں احسان دانش ضرور بلوائے جاتے۔ گویا مشاعرہ ان کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا۔

اسی لاہور میں احسان دانش نے مزدوری بھی کی اور اسی لاہور میں ایک باغ میں جو شملہ پہاڑی کہلاتا ہے، احسان نے اس میں چوکیداری بھی کی۔ احسان نے بھینسیں بھی چرائیں اور ان کا دودھ بھی دوہا۔ احسان بیلوں کی جگہ خود رہٹ چلا کر کنوئیں سے پانی بھی نکالتے رہے۔ اور وہ اس کا محنتانہ بھی لیتے رہے۔ غرض کہ محنت مزدوری کے بہت سے کام کر چکنے کے بعد انھوں نے لاہوری دروازے کے اندر کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان کھولی۔ وہ مزنگ میں رہتے تھے اور وہاں سے چل کر یہاں آتے تھے۔

مَیں شام کو ان کے یہاں پہنچتا۔ اتنے میں ان کے بہت سے شاگرد جو ہندو بھی تھے، سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی، یہاں جمع ہو جاتے۔ ان میں طالب علم بھی تھے، حکومت کے ملازم بھی اور دفتروں کے افسر اور اہلکار بھی۔ احسان ان کے اشعار کی اصلاح بھی کرتے اور پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں۔ خوب چہل پہل اور رونق رہتی۔ سورج ڈوبنے کے بعد ہم سب احسان کے ساتھ انارکلی کے ایک ہوٹل میں جا بیٹھتے اور پھر احسان مزنگ چلے جاتے اور میں امرت سر جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پہنچ جاتا۔

احسان نے غریبی اور افلاس کے دن بھی دیکھے اور پھر ایسا زمانہ آیا کہ ان کے حالات سُدھر گئے۔ جتنی محنت مزدوری اپنے جسمانی کاموں پر کی اتنی ہی محنت انھوں نے پڑھنے لکھنے اور شعر کہنے میں بھی کی۔ احسان شروع شروع میں تاجور نجیب آبادی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ پھر اُستاد سے ان کی دوستی یاری ہو گئی۔ کتابوں سے علم حاصل کرنے میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ تاجور صاحب کی صحبت میں آکر پوری ہو گئی۔ احسان کا شمار تھوڑے دنوں میں مُلک کے بڑے شاعروں میں ہونے لگا۔ وہ بڑے خود دار اور غیرت مند انسان تھے۔ وہ کسی سے کبھی جُھک کر نہیں ملے۔ مزدوری بھی کی تو غیرت اور خود داری کے ساتھ۔

احسان کے شاگردوں میں آغا شورش کاشمیری بھی تھے۔ یہ شاعری میں احسان کے شاگرد نہیں تھے بلکہ جب شورش اسکول میں پڑھتے تھے تو احسان انھیں ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے۔ شورش کا یہ زمانہ بھی مجھے اس طرح یاد ہے، جیسے کل کی بات ہے۔

شورش کسی سے دب کر نہیں رہے لیکن وہ مرتے دَم تک احسان کا ادب کرتے رہے۔ اور اگر کوئی شورش کی احسان سے شکایت کرتا تو وہ اسے بُلا کر ڈانٹ دیا کرتے تھے اور شورش سر جھکا کر سُنتے رہتے۔

احسان نماز روزے کے اتنے پابند نہیں تھے لیکن وہ سچے مسلمان اور عاشقِ رسولؐ تھے۔ وہ صوفی منش تھے۔ بزرگوں اور کرامات کے قائل تھے چناں چہ اسی لیے حکیم نیّر واسطی سے ان کی یاری تھی۔ نیّر واسطی کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے کہ وہ صاحبِ کرامت ہیں۔ احسان کی درویشوں سے ملاقات رہتی۔ نیّر واسطی صاحب ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کی دوائیں بھی اپنے مریضوں پر استعمال کرتے تھے۔ احسان بھی اکثر اپنے دوست احباب کا علاج ہومیوپیتھی سے کیا کرتے تھے۔

احسان کو کبوتر پالنے کا بھی شوق تھا۔ وہ ہر نسل کا ایک جوڑا اپنے یہاں ضرور رکھتے تھے۔ احسان بذلہ سنج بھی تھے اور لطیفہ گو بھی۔ احسان زندگی کی اونچ نیچ سے گزرے تھے۔ ان کی زندگی کا سفر بڑا کٹھن تھا۔ وہ جب اپنی آپ بیتی سنانے پہ آتے تو وقت کا احساس تک نہ ہوتا۔ ان کے یہاں ہر قماش کے لوگ آتے۔ ان میں ان کے پرانے زمانے کے ساتھی مزدور بھی ہوتے۔ طالب علم اور استاد بھی۔ اور اسمبلیوں کے ممبر اور رؤسا بھی۔ وہ ان میں کسی قسم کا فرق روا نہ رکھتے۔ میں جب کبھی لاہور آتا تو احسان کے یہاں ضرور آنا جانا اور پھر آدھی رات تک ان کے یہاں رہتا۔ اٹھنے کو جی نہ چاہتا۔ اور جو لوگ دور دراز سے آتے تو وہ وہیں سو جاتے۔ غرض کہ احسان کا گھر سب ہی کا گھر تھا۔ اسی طرح احسان بھی ہمارا آپ کا سب کا احسان تھا۔ وہ بڑا وضع دار اور کھلے دل کا انسان تھا۔

آغا محمّد اشرف

آغا صاحب بڑے مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ کشادہ پیشانی، گوراچٹّا رنگ۔ بڑی بڑی مسکراتی ہوئی آنکھیں، ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ اُجلا وَرَق جیسا لباس۔ دُبلے پتلے۔ کبھی سیاہ علی گڑھ شیروانی پہنتے اور کبھی سپید کوٹ پتلون۔ ان کے کھنکتے ہوئے نقرئی قہقہوں سے مُردہ دِلوں میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ آغا صاحب کی آواز میں لوچ بھی تھا اور کھنک بھی۔ ان کا لب و لہجہ ملائم و شگفتہ اور دل کھینچنے والا تھا۔

آغا صاحب مولانا محمد حسین آزاد کے پوتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام آغا محمد باقر دہلوی تھا۔ اور یہی نام ان کے پردادا کا بھی تھا جو استاد ذوقؔ کے دوست، اُردو زبان کے پہلے روزنامے کے مدیر اور پہلے صحافی تھے۔ یوں آغا صاحب کو اُردو ادب اور زبان ورثے میں ملے تھے۔

آغا اشرف بھی اپنے دادا کی طرح صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ ان کی نثر انتہائی سادہ، البیلی اور بامحاورہ ہوتی۔ ان کی زبان بول چال کی زبان تھی۔ اگر اُردو نثر میں سہل ممتنع کی مثال دی جاسکتی ہے تو جہاں اور بہت سے ادیبوں کی تحریریں بطور نمونہ پیش کی جاسکتی ہیں۔ وہاں آغا محمد اشرف کی تحریریں بھی پیش کرنا ضروری ہیں۔

شروع شروع میں آغا صاحب ڈون اسکول دہرہ دون میں استاد تھے۔ اور جب آل انڈیا ریڈیو کا اجرا ہوا تو وہ اس ادارے سے منسلک ہو گئے اور بڑی مدّت تک یہاں اناؤنسر اور نیوز ریڈر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ برِّ صغیر کے نامی گرامی براڈ کاسٹرز میں ان کا نام سرِفہرست آتا ہے۔

آغا صاحب کے بارے میں بخاری مرحوم نے اپنی سرگزشت میں ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ جارج پنجم کے انتقال کے بعد آغا صاحب آل انڈیا ریڈیو سے خبرنامہ پڑھ رہے تھے تو جب وہ یہ کہہ رہے تھے کہ "آج جہانی شہنشاہ معظم جارج پنجم نے مرنے سے پہلے یہ کہا" تو ان کو پھندا لگ گیا۔ آغا صاحب نے گھنڈی گھما کر اپنے مائیکرو فون کی آواز بند کردی لیکن اتفاق سے ان کا ہاتھ

قریب کے اسٹوڈیو کے مائکروفون کی گھنڈی پر پڑ گیا اور اس اسٹوڈیو کی آواز نشر ہو گئی اور وہاں ایک طبلچی اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "یہ میری ہتھوڑی کون حرام زادہ لے گیا؟" اور اس طرح یہ خبر یوں نشر ہو گئی۔ "آں جہانی شہنشاہ معظم نے مرنے سے پہلے یہ کہا کہ یہ میری ہتھوڑی کون حرام زادہ لے گیا"۔
آغا صاحب کچھ مدت کے بعد دوسری جنگ کے زمانے میں بی بی سی لندن سے خبریں پڑھنے لگے تھے۔
آغا صاحب بلا کے فرض شناس اور ذمہ دار انسان تھے۔ ایک مرتبہ جب نازی بمبار طیاروں نے لندن پر اندھا دھند بم باری کی تو ایک گولہ بی بی سی کی عمارت پر بھی پڑا۔ اس وقت آغا صاحب خبریں پڑھ رہے تھے۔ عمارت کے جس حصے میں وہ تھے وہاں آگ لگ رہی تھی۔ اگرچہ آغا صاحب یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے لیکن ان کی آواز میں کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں تھی۔ جب وہ خبروں کا پورا بلیٹن پڑھ چکے تو ایک کھڑکی سے کود کر باہر نکل گئے۔
آغا صاحب کا ایک کمال براڈکاسٹر کی حیثیت سے میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر ان کے سامنے یا ان کے پاس گھڑی نہ بھی ہوتی تو وہ اندازے اور تجربے سے مقررہ وقت میں اپنا اسکرپٹ ختم کر لیتے۔ وہ اس حساب سے کاغذ پر سطریں اور الفاظ لکھتے کہ وہ مقررہ وقت میں ختم ہو جاتے۔
آغا صاحب جیسا کمنٹیٹر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ وہ کمنٹری میں سماں باندھ دیتے اور پھر ان کی آواز دل کو الگ کھینچتی۔ آغا صاحب نے لندن میں بھی تعلیم پائی تھی۔ جب پاکستان وجود میں آیا تو آغا محمد اشرف وفاقی محکمۂ تعلیم میں اسسٹنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ میں اس وقت جیکب لائن اسکول میں استاد تھا۔ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مارٹن روڈ کے ایک کوارٹر میں رہنے لگا تو ایک صاحب اسٹیٹ آفس سے اس کوارٹر کا الاٹ منٹ لے آئے اور اسٹیٹ آفس نے میرے نام یہ فرمان جاری کر دیا کہ اگر میں نے دو دن میں یہ کوارٹر خالی نہ کیا تو مجھے پولیس کے ذریعے اس کوارٹر سے نکال دیا جائے گا۔ میں آغا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے انھیں یہ واقعہ سنایا تو وہ بہت افسردہ ہو گئے اور انھوں نے کہا کہ جب پولیس آ کر تمھیں نکالے تو تم بیوی بچوں کے ساتھ سڑک پر آ کر بیٹھ جانا۔ جب اپنا وطن اور اپنا گھر بار چھوڑ کر آئے ہو تو یہ بھی سہی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ نہ تو پولیس آئی اور نہ میں نے گھر بار چھوڑا۔
آغا صاحب نہ کسی کی برائی کرتے اور نہ کسی کی برائی سنتے۔ وہ اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ جتنے دن دنیا میں رہو، خوش رہو۔ اور جی بھر کر پیار اور محبت کرو۔ اور نفرتوں میں اپنا وقت اور اپنی عمر ضائع نہ کرو۔
آغا صاحب نے بچوں کے لیے بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے۔ آغا صاحب پاکستان کی ملازمت چھوڑ کر اقوام متحدہ میں ملازم ہو گئے۔ وہ کراچی میں اقوام متحدہ کے دفتر کے سربراہ بھی تھے پھر

ان کا صدر دفتر ہیں تبادلہ ہو گیا اور وہ کراچی سے چلے گئے۔

میری آخری ملاقات ان سے اس وقت ہوئی جب ان کی زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ ان کی عمر اس وقت پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ حکیم محمد سعید صاحب اور فضل حق قریشی صاحب کے علاوہ کسی کو یہ علم نہ تھا کہ موت نے اپنے پنجے ان کے جگر میں گاڑ دیے ہیں۔ وہ جگر کے سرطان میں مبتلا تھے۔

وہ جب نیویارک میں بہت بیمار اور لاعلاج ہو گئے تو انھیں وطن واپس لایا گیا۔ وہ طیارے سے اُترنے کے قابل نہیں تھے۔ انھیں اسٹریچر سے اتارا گیا اور پھر انھیں پہیوں والی کرسی پر بٹھایا گیا۔ اُن کے چہرے پر ویسی ہی مسکراہٹ تھی جیسے پہلے ہُوا کرتی تھی۔ وہ ضد کر رہے تھے کہ انھیں کھڑا کیا جائے تاکہ وہ اپنے دوستوں سے پہلے کی طرح گلے مل سکیں۔ اس حالت میں بھی طیارہ گاہ کی فضا ان کے نقرئی قہقہوں سے جو اُن کی زندگی کے آخری قہقہے تھے، گونج رہی تھی۔ اور پھر کچھ مدت کے بعد یہ بلبلِ خوش نوا اور خوش ادا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

شاہد احمد دہلوی[1]

(۱)

جب چڑے چڑیا کی کہانی سننے اور پڑھنے کا زمانہ گزر گیا اور حسن و عشق کے البیلے قصوں میں راتیں کالی کرنے میں مزا آنے لگا تو اس وقت "پھول" کی جگہ "ساقی" نے لے لی۔

افسانوں اور مضامین سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ مجھے اہلِ قلم کی زندگی کے حالات معلوم کرنے کی چینک سی لگی رہتی تھی۔ بات یہ ہے کہ فن کے مطالعہ سے زیادہ دل چسپ "خالقِ فن" کا مطالعہ و مشاہدہ ہے۔ ہمیشہ سے میری یہ خواہش رہی ہے کہ یہ معلوم کروں کہ فن کار کی شخصیت کی تربیت اور اس کی ذہنی تربیت میں کون کون سے اثرات و عوامل شامل ہیں؟ اس کا ذہنی پس منظر کیا ہے؟ اس کے گرد و پیش کے حالات کیا ہیں؟ اس کے کردار نے ان حالات کا اثر کہاں تک قبول کیا؟ ورثے میں اس نے کیا پایا؟ اور معاشرے سے اس نے کیا لیا؟ پھر یہ تمام اثرات و عوامل اس کی ادبی تخلیق میں کہاں تک نمایاں ہوئے؟

میں ساتویں درجے میں پڑھتا تھا۔ جب خشک درسی کتابیں زندگی کا رس چوس لیتیں تو میں "ساقی" سے پیاس بجھاتا۔ "ساقی" بلا کا رند و بے باک اور شوخ و طرار رسالہ تھا۔

ایک مرتبہ "ساقی" میں انصار ناصری کا ایک افسانہ "چندرا موہنی" چھپا۔ مجھے یہ افسانہ بہت پسند آیا۔ اس کا انجام المیہ تھا۔ شاہد صاحب نے غضب یہ کیا کہ چندرا موہنی کی تصویر بھی چھاپ دی۔ میں نے اس تصویر کو فریم کروایا، اور اپنے کمرے میں لگا دیا۔ کچھ دنوں بعد یہ رسالہ کہیں گم ہو گیا۔ دوسرا رسالہ کہاں سے لاتا، جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے، معاً میرے ذہن میں ایک "تدبیر" آئی، شاہد صاحب کو ایک خط لکھا جس کا نفسِ مضمون اب تک یاد ہے، کچھ اس طرح تھا "شاہد صاحب! چندرا موہنی کا افسانہ بہت پسند آیا۔ نمونے کے طور پر "ساقی" کا وہ پرچہ بھجوا دیجیے جس میں یہ افسانہ

---

[1] اس مضمون کے دو حصے ہیں پہلا حصہ مرحوم کی زندگی میں لکھا گیا اور دوسرا انتقال کے بعد۔

چھپا ہے۔ اگر یہ پرچہ پسند آگیا تو میں ساقی کا خریدار بن جاؤں گا" اپنی اس کارستانی پر میں بہت خوش ہُوا۔ اور زیادہ خوش تو اُس وقت ہُوا جب شاہد صاحب میرے چکمے میں آگئے اور انھوں نے ایک کی بجائے دو رسالے بھیجے اور ایک خط بھی بھیجا جس میں لکھا تھا کہ "خریدار بننے کی ضرورت نہیں۔ تمھاری پسند کے رسالے بھجوا رہا ہُوں" کبھی کبھی "ساقی" میں شاہد صاحب کا مضمون بھی چھپ جاتا۔ میں نفسِ مضمون سمجھنے کی کوشش نہ کرتا۔ زبان میں کھو جاتا کیسی پیاری زبان لکھتے ہیں۔ جُملے کے جُملے اور بے شمار الفاظ اُڑا لیتا۔ اور ان الفاظ اور جملوں کو استعمال کرنے کے لیے مضمون لکھتا۔

۱۹۳۹ء کا ذکر ہے۔ دہلی سے ایک بزرگ مستنصر باللہ جاورے سے تشریف لائے۔ مدار المہامی میں اُن سے مُلاقات ہُوئی۔ اگلے وقتوں کے لوگ نادر و غریب، دُبلے پتلے، ہاتھ میں ایک چھڑی جو اُن کے قد اور وزن سے کچھ ہی کم تھی۔ چھڑی پر چاندی کی مُٹھ تھی۔ چھڑی کیا تھی، مقیاسِ دولت تھی۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ مستنصر صاحب کی مالی حالت کیا ہے؟ تو ان کی چھڑی پر چاندی کے پتروں کے طول و عرض کو ناپ لو۔ آمدن زیادہ ہوتی تو یہ ایڑی سے چوٹی تک پڑی جگ مگ کرتی۔ اور اگر مالی حالت پتلی ہوتی تو اس سے چاندی اترنا شروع ہو جاتی۔ دِلّی کا نام زبان پر آتے ہی میں نے مستنصر صاحب سے پوچھا۔ کیوں صاحب آپ شاہد احمد دہلوی کو جانتے ہیں؟ فرمانے لگے۔ بھئی جاننے کی آپ نے ایک ہی کہی، وہ میرے کنبے کے ایک فرد ہیں۔ مستنصر صاحب نے وعدہ کیا کہ جب کبھی میں دِلّی جاؤں گا وہ شاہد صاحب سے میری ملاقات کرا دیں گے۔ چنانچہ میں دِلّی گیا۔ مستنصر صاحب کے ہاں قیام کیا۔ لیکن شاہد صاحب سے مُلاقات نہ ہو سکی۔

۱۹۴۸ء میں ریڈیو پاکستان پشاور میں ملازم ہُوا۔ جنوری ۱۹۴۹ء کی شام جب میں ٹرانسمشن ڈیوٹی پر تھا تو ایک گویّا میرے کمرے میں آیا اور کہنے لگا "پروگرام کے مطابق ایک ٹھمری گانا ہے لیکن میوزک والوں نے اس کے بول نہیں دیے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں خسرو کی وہ غزل "ز حالِ مسکیں" یہ سچ امی ردی" گا دوں۔ یہ کہہ کر وہ "آرام کُرسی پر بڑے ٹھسّے سے بیٹھ گیا۔ ایک پاؤں زمین پر ایک کرسی پہ۔ میں نے اس گوّیے کو بغور دیکھا۔ بالکل گویّا۔ ڈھیلی موری کا پاجامہ۔ بڑی بدنما سی شیروانی۔ نہ پُوری شیروانی اور نہ پُوری اچکن۔ کوئی بیچ کی چیز۔ رنگ گیہواں سیاہی مائل۔ آنکھیں بہت روشن جن پر سیاہ فریم کا چشمہ تھا۔ سر پر کشتی نما سیاہ بالوں والی ٹوپی۔ مُنہ میں بجھی ہُوئی بیڑی۔ جسے وہ بار بار ماچس سے سلگا رہا تھا۔ آنکھوں میں نخوت اور چہرے پر بے دماغی کی ایک جھلک۔ میں حیران تھا کہ آخر یہ گویّا کس بات پر اِترا رہا ہے۔ ہم نے بڑے بڑے قوالوں اور گویّوں میں بھی یہ بات نہیں دیکھی۔ بخشا قوال اور واعظ قوال بڑے منکسر المزاج تھے۔ رجب علی خان اور عاشق علی خان بھی اتنے بے دماغ نہ تھے۔ میں اس گویّے کی بے دماغی سے کچھ ٹھٹھک سا گیا تھا۔ ورنہ جی میں تو یہ آئی تھی کہ اسے ڈیوٹی روم

سے باہر نکلوا دوں۔ خیر میں نے پیچھا چھڑانے کے لیے گویّے صاحب کو خسرو کی غزل گانے کی اجازت تو دے دی لیکن ان کا تلفظ صحیح کرنے کے لیے میں نے اس سے کہا کہ وہ پہلے مجھے غزل سُنا دے بنگال چپ وہ مُسکرا دیا اور اُس نے بڑے اچھے لب ولہجے میں وہ غزل سُنا دی۔ میں کچھ اور پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ اسٹوڈیو کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے اسٹوڈیو میں گیا۔ میں نے یہ پہلا گویّا دیکھا جس کی سازندوں نے بڑی عزّت کی۔ معلن نے اعلان کیا۔

"ایس احمد سے خسرو کی غزل سُنیے۔"

ایس احمد ـــــ ؟ میں نے سوچا۔ یہ صالح محمد قوّال کا بڑا بھائی ہوگا۔ اس کا نام صالح احمد ہوگا ـــــ لیکن یہ ایس احمد کہلاتا ہے؟ ـــــ تھوڑی سی انگریزی پڑھ گیا ہوگا۔ خیر اس سے کیا۔ وہ ایس احمد ہو یا صالح احمد۔ بہرحال ہے گویّا۔ دوسرے دن ایس احمد صاحب میرے کمرے میں تشریف لائے۔ سب کے سب تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے۔ ایس احمد نے تاج صاحب سے (جو پروگرام ایگزیکٹو تھے) دو پوسٹ کارڈ مانگے۔ تاج صاحب نے پوسٹ کارڈ دیے۔ ایس احمد نے قیمت دینی چاہی لیکن تاج صاحب نے قیمت لینے سے انکار کر دیا اور یہ کہا "کیا ہم آپ کی اتنی سی بھی خدمت نہیں کرسکتے۔"

واقعی تاج صاحب گویّوں کا بڑا خیال رکھتے تھے اور ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں محمود نظامی صاحب اسٹیشن ڈائرکٹر کے کمرے میں جانا پڑا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایس احمد صاحب وہاں بھی کرسی پر اسی انداز سے براجمان ہیں جس انداز سے میں نے انھیں ڈیوٹی رُوم میں دیکھا تھا۔ محمود نظامی صاحب اُن کی تواضع میں مصروف ہیں۔ علمی و ادبی مسائل زیرِ بحث ہیں۔ ایس احمد صاحب مختصر افسانوں کی تکنیک پر تبصرہ فرما رہے ہیں۔ یا اللہ یہ گویّا تو معمّا بن گیا ہے؟ بے تکان بول رہا ہے۔ خیالات میں جامعیت، زبان میں سادگی، لوچ اور شیرینی۔ جب گویّے صاحب رخصت ہوئے تو میں نے نظامی صاحب سے پوچھا۔ "یہ کون بزرگ ہیں؟" انھوں نے اپنے وزن سے دُگنے وزن کا قہقہہ لگایا اور کہا، "تم اتنا بھی نہیں جانتے۔ یہ شاہد احمد دہلوی ہیں۔"

"یا اللہ ـــــ بے چارے شاہد احمد ایسے کیوں ہو گئے!"

میں شاہد صاحب کے پیچھے بھاگا۔ ریڈیو اسٹیشن کے پھاٹک کے قریب انھیں جالیا۔ ان سے چمٹ گیا اور اپنی عقیدت مندی اور اشتیاق کا اظہار کیا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ شاہد صاحب سے برابر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ایس احمد میرے لیے شاہد احمد اور پھر رفتہ رفتہ شاہد بھائی بن گئے۔

شاہد احمد بڑے یار باش آدمی ہیں پہلی ملاقاتوں میں کڑوے کسیلے، دُنیا دار، لالچی، مطلبی،

مُنھ نوچ اور کنجوس معلوم ہوتے ہیں لیکن جتنا ان کے قریب آؤ ان کی شخصیت اتنی ہی قابلِ محبت ہو جاتی ہے۔ شاہد بھائی کے یہ سب عیوب پیانہ کے چھلکے ہیں۔ اور وہ بھی بہت تیز آنسو نکالنے والے۔ شاہد بھائی کی کرواہٹ میں بڑی مٹھاس ہے۔ ان کی دُنیاداری دنیاداروں کو دُور رکھنے کا ایک بہانہ ہے۔ ان کی کنجوسی بے وقوف بنانے والوں اور مطلب نکالنے والوں کو ٹالنے کا طریقہ ہے۔ اُن سے دوستی کرنا آسان نہیں ہے۔ ان کے دوستوں کو کبھی کبھی ان کی ڈانٹیں بھی سہنی پڑتی ہیں اور پھر غضب تو یہ ہے کہ وہ تنہائی میں ڈانٹتے بھی نہیں، سب کے سامنے ڈانٹ دیتے ہیں۔ شاہد بھائی اپنی پہلی ملاقات میں یا اجنبیوں کی محفل میں ایک کنواری شرمیلی لڑکی کی طرح بے طرح شرماتے ہیں لیکن دو چار مُلاقاتوں کے بعد ملاقاتی شرماتے ہیں اور وہ پُھلجھڑی بن جاتے ہیں۔

یوں تو ان کے دن رات ان کے دوستوں کے لیے وقف ہیں لیکن تین وقت ایسے ہیں جب وہ کسی سے ملنا جُلنا اور اپنے ہاں کسی کا آنا جانا پسند نہیں کرتے۔ ایک تو رات کا وقت، ایک علی الصبح اور ایک قیلولے کا وقت۔ میرے ایک دوست کارپوریشن کے انتخاب میں حصّہ لے رہے تھے۔ مَیں نے ان کی سفارش کی۔ کہنے لگے "اچھا جسے تم کہو گے اُسے ووٹ دے دُوں گا کیوں کہ میں ان لوگوں سے واقف نہیں۔ یہ لوگ نہ تو گویّے ہیں اور نہ ادیب۔" مگر امیدوار صاحب کو چین کہاں۔ سُولی پر لٹکے ہوئے تھے۔ رات کے بارہ بجے بہ نفسِ نفیس شاہد صاحب کے مکان پر جا پہنچے۔ شاہد بھائی آرام کر رہے تھے۔ انھیں اندر بُلایا۔ آنے کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے اپنا تعارف کرایا اور مطلب کی بات کہی۔ بس شاہد صاحب بگڑ گئے اور کہنے لگے "ارے صاحب! اگر وہ کم بخت مجھ سے یہ کہہ دیتا کہ کُتّے کو ووٹ دے دو تو مَیں دے دیتا۔ جب مَیں نے اُس سے وعدہ کر لیا تھا تو پھر آپ کیوں تشریف لائے؟ کیا کروں۔ مَیں وعدہ خلافی کرنا نہیں چاہتا، ورنہ آپ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ آپ کو ووٹ دیا جائے۔ بھلا یہ کسی شریف آدمی کے آنے کا وقت ہے؟ ممبر بننے سے پہلے آپ کو ہماری تکلیفوں کا خیال نہیں ہے تو ممبر بننے کے بعد کیا ہوگا؟" بے چارا اُمیدوار کھسیا کر چلتا بنا۔ اور دوبارہ اُس نے اس طرف رُخ نہ کیا۔

شاہد بھائی کے بارے میں شروع شروع میں میرا یہ خیال تھا کہ یہ حضرت پیتے پلاتے بھی ہوں گے اور "کارِ دگر" سے بھی کب درگزر فرماتے ہوں گے۔ مگر شاہد صاحب کے یہاں بالکل خشک سالی ہے۔ نہ جانے ان کا دل اس طرف کیوں نہیں آیا۔ لیکن یہاں معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ نہ پوری رندی اور نہ پوری پاک بازی۔ واللہ بڑی کافر طبیعت پائی ہے۔ اصل میں ان پر بس ایک چیز کا اثر ہے۔ اور وہ ہے نغمہ۔ زندہ و متحرک یہی ان کا محبوب ہے اور یہی ان کا مسجود۔

شاہد احمد دہلوی شاہد کم ہیں اور دہلوی زیادہ ہیں۔ انھیں دہلوی ہونے پر بڑا فخر ہے۔ یوں تو

سب دہلی والوں کا یہی حال ہے۔ مگر یہ اپنے حال میں بہت بے حال ہیں۔ اگرچہ وہ دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان کو اس ملک کی آب و ہوا کے لیے ناموافق اور اس ترقی یافتہ دور میں اس کی پیروی و استعمال کو نامناسب سمجھتے ہیں لیکن جب کبھی زبان کے معاملہ میں کوئی نزاعی امر درپیش ہوتا ہے تو وہ جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان کا حوالہ دیتے ہیں۔ خود ان کی تحریر میں جگہ جگہ دہلی کی ٹکسالی زبان کے چٹخارے ملتے ہیں۔ اور ایک مرتبہ جب چٹخاروں کی عادت پڑ جاتی ہے تو پھر یہ عادت جاتی نہیں۔ اور پھر شاہد بھائی نے یہ چٹخارے ورثے میں پائے ہیں لیکن ان چٹخاروں کے لیے انھیں محنت اور کاوش نہیں کرنا پڑتی۔ یہ چٹخارے ان کے خون میں شامل ہیں۔ غیر محسوس طور پر زبان اور قلم سے نکل جاتے ہیں۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ چٹور پن تو آپ جانیے، دلی والوں کی فطرت میں داخل ہے۔ ایک اتوار کی صبح میں اور شاہد بھائی نہاری کھانے دلی کے ایک مشہور نہاری والے کی دکان پر جا پہنچے۔ شاہد بھائی زبان کی بوٹی کھا رہے تھے۔ فرمانے لگے "یہاں آ کر معلوم ہوا کہ دلی کی گائیں بھی اہلِ زبان تھیں۔ ذرا کراچی کی گائے کی زبان چکھ کر تو دیکھو، بے مزا پھیکی"۔

شاہد صاحب ادیب بھی ہیں اور ایڈیٹر بھی۔ مترجم بھی ہیں اور موسیقار بھی۔ ادیب، مترجم اور موسیقار کے سامنے سرِ تسلیم خم۔ لیکن شاہد احمد ایڈیٹر کی ایڈیٹری کے کمالات سے مجھ مضمون نگار کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ دوست آشنا کا مضمون محض اس کی شخصیت پر اعتماد کر کے بغیر دیکھے بھالے چھاپ دینا کہاں کی ایڈیٹری ہے؟ ایڈیٹری میں مروّت اور دوست نوازی کیا معنی؟ پھر اس مروّت اور دوست نوازی نے شاہد صاحب کو بدنام بھی کیا اور تباہ حال بھی۔ بے شمار ادیبوں نے شاہد صاحب سے ہزاروں روپے پیشگی لیے، اور وہ اسے شیرِ مادر کی طرح ہضم کر گئے۔ جب دلی میں تھے تو آئے دن دوست آشناؤں کے مضامین بغیر دیکھے بھالے، ان کی شخصیت اور ان کے خلوص پر اعتماد کر کے چھاپنے کی وجہ سے عدالتوں میں کئی بار گھسیٹے گئے۔ انھوں نے ہزاروں روپے جرمانے کے طور پر ادا کیے۔ اس زبوں حالی اور ان مالی پریشانیوں میں بھی وہ اپنی وضع داری اور دوست نوازی پر قائم ہیں۔ آج کل بھی ان پر دو مقدمے چل رہے ہیں۔ اگرچہ ان کی مالی ساکھ بگڑ چکی ہے اور حالات کے پیشِ نظر انھیں شپا شوربا اور گنی بوٹی پر اُتر آنا چاہیے۔ لیکن دعوتیں اب بھی ان کے یہاں ہوتی رہتی ہیں۔ جس وقت جائیے، چلیے حاضر۔ اگر لاہور سے کوئی گویا آ گیا ہے تو پانچ سات دوستوں کو بھی بلوا لیا۔ قورمہ، قلیا، روغن جوش اور شیرمال دسترخوان پر موجود۔

معاف کیجیے۔ ایڈیٹری سے دسترخوان پر آ گیا۔ ہاں تو شاہد صاحب کی یہ بات بھی مجھے پسند نہیں کہ وہ اچھا لکھنے والوں سے مضمون کا طلب کرنا بھی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ شاہد صاحب نے "ساقی" کو نو آموزوں کی بازی گاہ بنا رکھا ہے۔ "ساقی" کے صفحات نئے نئے ادبی تجربوں اور جدت پسندوں کی

اتحادِ طبع اور اظہارِ بیاں کے لیے ہمیشہ وقف رہے ہیں عظیم بیگ چغتائی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک نے "ساقی" کو تختۂ مشق بنایا۔ اور جب وہ رواں ہو گئے تو وہ "ساقی" کو بھول گئے اور "ساقی" انھیں بھول گیا۔ آج بھی "ساقی" نئے نئے ستاروں کی چمک دمک سے آسمانِ ادب کو جگمگا رہا ہے۔ شاہد بھائی پچھلے ۲۵ برس سے اپنے جلوس میں بے شمار ادیبوں کو لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو بہت آگے نکل گئے، اور کچھ ان کے ساتھ ساتھ آ رہے ہیں۔ جب یہ بھی آگے بڑھ جائیں گے تو شاہد کے ساتھ کچھ اور صلاحیتوں والے آ کر شامل ہو جائیں گے۔ وہ ترقی کی منزل کی جانب بڑھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ اگر شاہد احمد ادیب نہ ہوتے تو ان کی یہی خاموش ادبی خدمت کیا کم تھی۔ کون تھا جو انھیں محسنِ ادب نہ مانتا؟

شاہد احمد آج کل بہت کم لکھ رہے ہیں۔ کیا کریں فکرِ معاش نے انھیں کہیں کا نہیں رکھا۔ "ساقی" سے تو خود ساقی کا پیٹ نہیں بھرتا۔ شاہد صاحب کو کیا مل جاتا ہوگا۔ اب نہ باپ دادا کی جائیداد پاس ہے اور نہ ساقی بک ڈپو۔ وہ ریڈیو میں بھی چل نہ سکے۔ حکومت کے کسی دفتر میں انھیں جگہ نہ ملی۔ حکومت کے حسّاس افسروں کو ان کی قابلیت کا اعتراف ہے لیکن کیا کریں۔ اتنے بڑے آدمی کے لائق ان کے یہاں کوئی جگہ بھی تو نہیں۔ خدا بھلا کرے بخاری کا الٹی سیدھی دھنیں بنواتا ہے۔ اناپ شناپ فیچر لکھواتا ہے اور بے تُکے موضوعات پر تقریریں کرواتا ہے لیکن کسی نہ کسی طرح شاہد صاحب کا گھر پورا کر دیتا ہے۔ مگر بخاری کے بعد کیا ہوگا؟

شاہد بھائی کی موسیقی پر بڑی گہری نظر ہے۔ وہ عملی اور نظری علم کے ماہر ہیں۔ انھوں نے بڑے بڑے استادوں اور پنڈتوں سے گانا سیکھا۔ بڑی بڑی سنگیت سبھاؤں میں شامل ہوئے۔ جس سے جو ملا لے لیا اور خوب ریاض کیا۔ اور آج تو ان کا یہ حال ہے کہ بڑے بڑے گائیک ان کے سامنے کان پکڑتے ہیں۔ برِصغیر کی موسیقی کے ارتقا کی تاریخ ان کی نوکِ زبان پر ہے۔ میاں تان سین سے لے کر میاں رمضان خاں تک، ہر ایک کے انگ سے وہ کماحقہٗ واقف ہیں۔ ناچ کی کوئی قسم ایسی نہیں جس پر اُن کی نظر نہ ہو۔ بھارتیہ ناٹیم، کتھک، کتھا کلی ہر ناچ کے توڑے انھیں زبانی یاد ہیں۔ وہ رقص اور موسیقی کی تاریخ کے آزاد ہیں اور اس کی تنقید کے شبلی اور حالی۔ انھوں نے اس فنِ لطیف کو ادب میں محفوظ کر لیا۔ یہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اور ان کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

شاہد احمد کے ساتھ شمس زبیری کا ذکر نہ کرنا مضمون کو تشنہ رکھنا ہے۔ شمس شاہد بھائی کے ہمزاد ہیں (اور شاید ہمراز بھی)۔ شمس کو جہاں کہیں دیکھیے سمجھ لیجیے شاہد بھائی بھی یہیں کہیں

موجود ہوں گے۔ شمسؔ صاحب نا بیٹھے لنگوڑے ہیں اور ولم پُولد۔ غزل خوب کہتے ہیں۔ شاہد بھائی کو شاعروں سے چڑ ہے لیکن شمسؔ کے بغیر وہ سانس بھی نہیں لے سکتے۔

کراچی میں بسوں کا انتظام اچھا نہیں ہے۔ بس سٹاپ پر کھڑے کھڑے سویرا ہو جاتا ہے۔ شمسؔ صاحب کے مشورے سے شاہدؔ بھائی نے ایک موٹر سائیکل خریدلی۔ موٹر سائیکل بھی کیا سواری ہے۔ سوار پر سواری کا گمان گزرتا ہے۔ شاہدؔ بھائی نے شمسؔ صاحب سے کھلے میدان میں موٹر سائیکل چلانا سیکھ تو لی لیکن ہم نے ایک مرتبہ بھی انھیں سڑک پر موٹر سائیکل چلاتے نہیں دیکھا۔ ہم نے تو جب دیکھا یہی دیکھا کہ شمسؔ صاحب موٹر سائیکل چلا رہے ہیں، اور شاہد بھائی پہلی مرتبہ سسرال جانے والی دُلہن کی طرح شرمائے لجائے کیریر پر بیٹھے ہیں۔ شمسؔ بھائی زندگی میں بڑے پاپڑ بیل چکے ہیں۔ بلکہ سُنا ہے کہ پاپڑ بیلنا ان کا محبوب ترین مشغلہ ہے شمسؔ صاحب نے جب شاہدؔ بھائی کی موٹر سائیکل کو ٹرک کی طرح چلانا شروع کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ موٹر سائیکل کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے۔ اور اسے لوہے کے بھاؤ اونے پونے بیچ دینا پڑا۔ موٹر سائیکل بیچنے کی چیز نہیں تھی۔ اسے صنعتی نمائش میں رکھنا چاہیے تھا۔ شمسؔ صاحب نے اس پر محنت اور بڑی مغز پچی کی تھی۔ اس کی ہیئت بدل دی تھی۔ شمسؔ صاحب نے پٹرول کی ٹنکی کو ٹھونک پیٹ کر ہشت پہلو بنا دیا تھا۔ انجن کی آواز کو بھینس کی آواز سے ملا دیا تھا۔ یوں نام تو اس کا موٹر سائیکل تھا مگر نہ تو کام اس کے موٹر سائیکل کے تھے اور نہ اس کی شکل موٹر سائیکل سے ملتی جلتی تھی۔ کچھ عجیب سی چیز بن گئی تھی۔

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو "بتائے" نہ بنے

سچ پوچھیے تو یہ موٹر سائیکل بھی بڑی ستم ظریف تھی۔ کبھی تو شمسؔ صاحب اُسے چلاتے اور کبھی یہ شمسؔ صاحب کو چلاتی۔ میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ شاہدؔ صاحب موٹر سائیکل کے کیریر پر بیٹھے ہیں اور شمسؔ زبیری اسے کھینچے لیے جا رہے ہیں۔ شاہدؔ صاحب بار بار کہہ رہے ہیں۔ "شمسؔ صاحب کیا اُتر جاؤں؟" مگر شمسؔ صاحب ایک نہیں مانتے۔ فرماتے ہیں۔ "نہیں نہیں آپ بیٹھے رہیے، ابھی چلتی ہے ذرا انجن گرم ہو جائے۔" انجن تو کیا گرم ہوتا، شاہدؔ بھائی گرم ہو جاتے اور کیریر سے اُتر کر بگڑ کر کہتے۔ "میاں شمسؔ کیا مصیبت ہے۔ مجھے تم نے پیر تسمہ پا بنا دیا ہے اپنے لیے بھی اور موٹر سائیکل کے لیے بھی۔" مگر شمسؔ صاحب کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ وہ تو اس بات کے قائل تھے کہ تنکے میں بھی جان پڑ سکتی ہے یہ تو موٹر سائیکل ہے۔ انسان کوشش کرے تو موٹر سائیکل کو ہوائی جہاز بنا سکتا ہے۔ چناں چہ جب موٹر سائیکل کی طبیعت ذرا سنبھل جاتی اور شمسؔ صاحب پھر اسے ٹرک کی طرح چلاتے تو وہ واقعی رفتار میں ہوائی جہاز بن جاتی۔ اور اپنے

"پسِ گرد" بے شمار ٹریفک کے سارجنٹوں کو ہاتھ دکھاتا اور سیٹیاں بجاتا چھوڑ آتی۔ ایک مرتبہ شمس صاحب شہ سواری کے زعم میں فراٹے بھر رہے تھے اور شاہد بھائی حسبِ معمول کیریر پر بیٹھے تھے۔ راستے میں ایک گڑھا آیا۔ موٹر سائیکل اچھل کر اُس پار ہوئی۔ لیکن اِس بار شاہد بھائی سجدۂ شکر بجا لا رہے تھے۔

غالبؔ سے جو عقیدت میرن صاحب کو تھی وہی عقیدت شمس صاحب کو شاہد بھائی سے ہے۔ شاہد بھائی کی ہم نشینی کا اثر شمس صاحب پر بھی پڑا۔ چناں چہ شمس صاحب کو موسیقی سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ سارنگی نواز حامد علی کو اُستاد بنایا۔ جب حامد ان سے جبڑا شکن تانیں لگواتے تو وہ ہر تان کے زور میں اُٹھ کھڑے ہو جاتے۔ آخر تھک ہار کر اُنھوں نے ریاض چھوڑ دیا۔ اور شاہد صاحب کی موسیقی کی مہارت کے پہلے سے کہیں زیادہ قائل ہو گئے۔ فرمانے لگے۔ "عجیب گر دے کا آدمی ہے یہ شاہد احمد بھی۔ بیٹھے بیٹھے وہ تانیں لگاتا ہے کہ ہر تان پر مجھ ایسا لمبا تڑنگا آدمی اگر کھڑا بھی ہو جاتا ہے تو پھر بھی تان ختم نہیں ہوتی۔"

شاہد بھائی تعلّی نہیں کرتے۔ چپ چپاتے اپنے چھوٹوں کی باتیں بڑی دل چسپی سے سُنتے ہیں اور خود کو کچھ اس طرح سے ظاہر کرتے ہیں جیسے انھیں کچھ نہیں آتا۔ ہر بات کی کرید کرتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک طالب علم کی زندگی ہے۔ جس بات کو نہیں جانتے، بلا تکلّف دُوسروں سے پوچھ لیتے ہیں۔ وہ اپنی حد سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ یہ حد بندی خود انھوں نے قائم کی ہے۔ حالاں کہ ان کی جولانیِ طبع اور روانیِ بیان ان حدوں سے کہیں آگے بڑھ جاتی ہے۔ دِلّی کی بپتا صرف بیان نہیں ہے۔ بڑے جان دار خیالات اس میں سموئے ہُوئے ہیں۔ یہ ایک زوال آمادہ قوم کے انجام اور ایک نو زائیدہ اور توانا قوم کے آغاز کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس موضوع پر شاہد کا کلکِ گوہر بار و گوہر بیز نشترِ چنگیزی بن گیا ہے۔ کردار نگاری میں ان کا جواب نہیں۔ کیا مجال جو جسم کا ایک بال اور چہرے کا ایک خال تک نہ دکھائیں۔ وہ کاغذ پر باطن کا عکس اتار کر رکھ دیتے ہیں۔ ڈرامہ ہو یا افسانہ، کردار بنیادی چیز ہے۔ اور جو شخص کردار نگاری کا کامل عکّاس ہو، اس کے قلم کی جولانیوں سے ادب کا کوئی شعبہ بچ نہیں سکتا جس خارزار میں چاہتا ہے سدا بہار پھول کھلاتا ہے۔ وہ جس طرف رُخ کرے گا موتی بکھیرتا جائے گا۔ لیکن شاہد صاحب نے ادب کو بہت نقصان پہنچایا بلا کی خِست سے کام لیا۔ انھوں نے اپنی تمام صلاحیتوں اور اپنے قیمتی وقت کو موسیقی کے لیے وقف کر دیا۔ اور ادب رونی صورت بنائے ان کے سامنے کھڑا زبانِ حال سے کہہ رہا ہے "شاہد! تم غاصب ہو۔ تم نے مجھ سے میرا حق چھین لیا ہے۔"

شاہد کچھ ایسے "بائیس خواجہ" کی چوکھٹ پر دھونی رمائے بیٹھے ہیں کہ اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

دیس نکالا ملا۔ مگر" ہائے دِلّی وائے دِلّی" دِلّی کی یاد اُن کے دِل سے نہیں مٹتی۔" پھُولوں والوں کی سیر" "دِلّی کے البیلے مشاہیر" کے حالات۔" دِلّی کے گلی کوچوں کا آنکھوں دیکھا حال" کرخنداروں کی زبان، بیگماتی زبان، "ساون بھادوں" کے نقشے، شاہد صاحب کا قلم، دِلّی کے مقامی حالات کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اور یہ اُردو ادب کی بدقسمتی ہے۔ پاکستان کی بدقسمتی ہے۔ نئے دیس کے بے شمار نظّارے ان کی بوقلمونیوں کے لیے بکھرے پڑے ہیں۔ اگر شاہد ایسے رنگین قلم چاہیں تو زبان کے لوچ اور رنگینی سے اس مُلک پر بہار بے خزاں مسلّط کر سکتے ہیں۔ شاہد کے ہم خیال اور ہم اسلوب اگر چاہیں تو سندھ اور پنجاب کے پانی میں گنگا جمنی تہذیب کے دِل آویز رنگ ملا کر اس ملک کے اَدَبی سرمایہ کو دِل فریب بنا سکتے ہیں لیکن موسیقار ایس احمد، ادیب شاہد احمد پر مسلّط ہو گیا۔ اس میں شاہد احمد کا بھی کیا قصور؟ بے چارہ موسیقی کا سہارا لے کر اپنے بال بچّوں کا پیٹ پالتا ہے۔ راگ راگنیوں کی تانوں میں دل سے اٹھنے والی چیخوں کو چھپا کر فضا میں بکھیر دیتا ہے اور اک گونہ تسکین پاتا ہے، باقی رہا اَدَب تو پاکستان میں ادب بھی ایک صنعتی پیداوار ہے۔ مقرّر اور متعیّن کل پرزوں سے پِسی اور مخصُوص سانچوں میں ڈھلی ہُوئی شے۔ اَدَب پر احتساب کی چوکسی ہے۔ اَدَب کو جُزدان میں رکھنے اور رحل پر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اَدَب آداب میں شامل ہو گیا ہے۔ زندگی اور معاشرے سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ تلاشِ معاش میں سرگرداں اور غمِ روزگار کے ستائے ہوئے شاہد احمد کے پاس پھر لکھنے پڑھنے کی فرصت کہاں؛ فکرِ معاش سے زندگی کا ایک لمحہ بھی خالی نہیں۔ شہرت سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اَدَبی زمرے میں فرومائیگانِ ادب کی چھاؤنی چھا رہی ہے۔ شاہد احمد اور ان جیسوں کا یہاں گزر کہاں؟

شاہد صاحب نے محکمہ اطلاعات اور ریڈیو پاکستان کے دفتروں کی دھول چھانی اور جس افسر سے بات کی اُس نے ٹھنڈی سانس بھر کر یہ کہا۔" آپ کہاں اور یہ ملازمتیں کہاں؟ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے لائق کوئی جگہ نہیں" ریڈیو پاکستان اور محکمہ اطلاعات تو کیا شاہد بھائی کے لیے پورے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں۔ ان کا قصور یہ ہے کہ وہ اتنے قابل کیوں ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے پوتے کے لیے دِلّی کے جیّد علماء کے خاندان کے چشم و چراغ کے لیے اعلیٰ درجے کے اہلِ قلم اور بے مثل مترجم کے لیے۔ موسیقی کے ماہر و مبصّر کے لیے "ساقی" کے ایڈیٹر کے لیے۔ ایک بھولے بھالے شریف انسان کے لیے ریڈیو پاکستان میں، محکمہ اطلاعات میں اور پاکستان کے کسی دفتر میں کوئی جگہ نہیں۔ پورے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں۔

شاہد بھائی نے اب نوکری کا خیال ہی چھوڑ دیا ہے۔ جو کچھ مل جاتا ہے اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ ریڈیو کے پروگراموں پر گزر بسر ہو رہی ہے۔" امریکہ تمہارا شکریہ" کے نام سے فیچر لکھتے ہیں۔

اور یہ "ردّی توکسی طور کما کھائے مچھندر" پر عمل کرتے ہیں۔ شام کے وقت ان کی بیٹھک میں شاگردوں کا جمگھٹا رہتا ہے مگران سے کچھ آمدنی نہیں ہوتی۔ کچھ ان پر خرچ ہی ہوتا ہے۔ نان پر نان اُڑتی ہے۔ چائے کا دَور چلتا ہے۔ بیڑیاں سُلگتی ہیں (دل سُلگتے ہیں) اور اس طرح وہ تھک ہار کر پڑ رہتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔

(۲)

ایوب خاں کے عہدِ حکومت میں جب رائٹرز گلڈ قائم ہوئی تو اس کے فاؤنڈر ممبرز میں شاہد بھائی بھی شامل تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ان کے قدر دانوں اور ان کے نیاز مندوں نے ان کی عزت و تکریم میں کوئی کسر اُٹھا کر نہیں رکھی۔ ان کی مالی حالت بھی نسبتاً بہتر تھی۔ انھوں نے مشرقِ بعید کے چند ملکوں کا دورہ بھی کیا تھا۔ اور وہاں برِّصغیر کی موسیقی پر تقریریں کیں۔ یہ حقیقت ہے کہ موسیقی کے علم اور اس کی تاریخ پر شاہد بھائی کی بڑی گہری نظر تھی۔ اور یہ علم انھوں نے صرف کتابوں سے حاصل نہیں کیا تھا بلکہ موسیقی کے بڑے بڑے گیانیوں کی صحبت میں بیٹھ کر اُن سے سیکھا تھا۔ شاہد بھائی بہت اچھا گاتے بھی تھے۔ لیکن ان کی آواز میں رَس نہیں تھا۔ وہ سُر کے پکّے تھے لیکن آواز ساتھ نہیں دیتی تھی۔ بڑے بڑے گائک ان کے سامنے کانوں پر ہاتھ رکھتے۔

شاہد بھائی پہلے توکسی سے ٹکر نہ لیتے لیکن اگر کوئی ان سے اُلجھ ہی پڑتا تھا تو وہ کسی گھر بند نہ تھے وہ سنانے کہ دھری جاتی نہ اٹھائی۔ ان کے قلم کی جولانیاں دیکھنے کے قابل ہوتیں۔ اس نوعیت کی اُن کی تحریریں پڑھ کر یہ یقین نہ آتا کہ یہ وہی شاہد احمد ہیں جو عام زندگی میں انتہائی منکسر المزاج اور شرمیلے ہیں۔ ایک مرتبہ جوشؔ صاحب نے اُن کے دادا ڈپٹی نذیر احمد کی زبان اور محاورے پہ کہیں اعتراض جڑ دیا تھا۔ بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ افکار کے جوشؔ نمبر میں شاہد بھائی کا مضمون پڑھ لیجیے۔ مصحفی اور انشا کی ادبی جنگ اور چکبستؔ و شررؔ کے معرکے کے بعد یہ تیسرا اہم معرکہ ہے۔ ایک طرف ایک عظیم شاعر تھا، ایک طرف ایک عظیم نثر نگار۔ یہ نثر اور شاعری کا معرکہ تھا جس کا فیصلہ آنے والی نسلیں ہی کر سکیں گی۔ اِس سلسلے میں مشفق خواجہ کا یہ لطیفہ بھی سُن لیجیے۔ کہیں کوئی جلسہ ہو رہا تھا۔ جلسے کے منتظم نے خواجہ صاحب سے کہا، دو شاہد بھائی اور جوشؔ صاحب دونوں کو اپنے ساتھ لے آنا۔" خواجہ صاحب نے کہا کہ "اگر راستے میں دونوں کی صلح ہو گئی تو کون ذمہ دار ہوگا؟"

شاہد بھائی ریڈیو پاکستان میں اسٹاف آرٹسٹ تھے اور جب بخاری مرحوم نے شاہد بھائی کو ملازمت سے الگ کر دیا تو وہ بخاری صاحب کے خلاف ہو گئے۔ بخاری صاحب کا کہنا تھا کہ شاہد بھائی بس حاضری لگا کر چلے جاتے ہیں اور کام نہیں کرتے۔ لہٰذا ہم ان کے لکھے ہوئے ہر فیچر پر انھیں معاوضہ

دینے کے لیے تیار ہیں۔ شاہد بھائی اللہ بخشے بہت حساس اور زود رنج تھے۔ اس سے انھیں نقصان بھی بہت پہنچا۔ ان کے بہت سے دوست ان سے علیحدہ ہو گئے۔ کمال کی بات تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ وہ وضع دار بھی تھے اور ان میں مروّت بھی تھی۔ اس وضع داری اور مروّت سے جہاں شاہد بھائی کو نقصان پہنچا وہاں "ساقی" کو بھی پہنچا۔ خود "ساقی" بھی ان کی وضع داری کا ایک نمونہ تھا۔ اپنا اور اپنے بال بچّوں کا پیٹ کاٹتے اور "ساقی" کا پیٹ بھرتے۔

شاہد بھائی مترجم ایسے تھے کہ ترجمے کو اصل کر دکھاتے۔ شاہد بھائی کے طالب علمی کے زمانے میں جب اسٹیج ڈرامہ دم توڑ رہا تھا تو شاہد بھائی اور ان کے کالج کے رفقا نے اس میں جان ڈالی۔

اس زمانے کے جواں سال اور ہونہار ادیبوں میں یہ نام آتے ہیں۔ جناب شاہد احمد۔ جناب فضل حق قریشی۔ جناب انصار ناصری۔ جناب تابش دہلوی۔ جناب ظفر قریشی۔ جناب صادق الخیری۔ ماسٹر ممتاز۔ اخلاق احمد دہلوی۔ خمار دہلوی۔ اس برات کے دُولھا شاہد احمد تھے یہی وہ حضرات تھے جو "ساقی" کے اجرا میں شاہد بھائی کے معاون تھے۔ اور "ساقی" آئینہ دار تھا دلّی کی تہذیبی زندگی کا۔ "ساقی" اُردو ادب میں دلّی اسکول کا نمائندہ بھی تھا۔ "ساقی" ترقّی پسند ادب کا سرچشمہ بھی تھا۔ ساقی کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اور اتنا وسیع ہُوا کہ یہ ہندوستان کی تمام ادبی تحریکوں کا محور بن گیا۔ ساقی کے قلمی معاونین میں منشی پریم چند، اختر حسین رائے پُوری، منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، مرزا عظیم بیگ چغتائی وغیرہ تھے۔ شاہد بھائی کے جواں سال ساتھیوں کو اُس وقت کے ممتاز اہلِ قلم کی سرپرستی حاصل تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہی لوگ اپنے بزرگوں کی میراث کے وارث بھی تھے۔ ساقی کی اس ٹیم نے ساقی کو کامیاب بنانے میں نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ ساقی کے اجرا سے پہلے یہ نوجوان عربک کالج کی ڈرامائک سوسائٹی کے ممبر تھے اور کالج کی مالی امداد کے لیے ڈرامے اسٹیج کیا کرتے تھے۔ یہ ڈرامے لکھتے بھی تھے اور اسٹیج پر اداکاری بھی کرتے تھے۔ فضل حق قریشی جہاں ڈرامہ نویس تھے، وہاں وہ بڑے اچھے اداکار بھی تھے۔ جناب جبار غازی اور حکیم اقبال حسین مرحوم جو جماعتِ اسلامی کے بنیادی رُکن تھے، بڑے اچھے اداکار تھے۔ جبار غازی صاحب سوانگ ڈرامہ لکھنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے اپنے ڈرامے "ہنس پلیا" کی ڈائرکشن بھی خود کی تھی فضل حق قریشی کے ڈرامے "زبردستی کی شادی" میں حکیم اقبال حسین صاحب نے ہیرو کا اور اخلاق احمد دہلوی نے ہیروئن کا رول کیا تھا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ملک کے نام ور ڈرامہ نویس تھے انھوں نے اسٹیج اور ریڈیو کے لیے بے شمار ڈرامے لکھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بزم تہذیب اُردو کے لیے بھی اسٹیج ڈرامے لکھے۔

اور ان میں اداکاری بھی کی اور ایک مرتبہ ایک نرس کا رول بھی کیا۔ وہ اپنے ڈراموں کی ڈائرکشن خود کیا کرتے تھے۔ دِلّی کے ان نوجوان ادیبوں کی محفلیں "کتب خانۂ علم و ادب" میں جما کرتی تھیں۔ یہ کتب خانہ بڑی پُررونق جگہ پر تھا۔ پھر یہ نوجوان یہاں سے اُٹھ کر "ساقی" کے دفتر میں دھما چوکڑی مچاتے یہاں کام بھی ہوتا اور تفریح بھی ہوتی۔ "ساقی" کا دفتر اس حویلی کے ایک حصّے کے دو کمروں میں تھا جس میں کسی زمانے میں شاہد کے دادا ڈپٹی نذیر احمد کی علمی و ادبی محفلیں برپا ہُوا کرتی تھیں اور جہاں وہ تصنیف و تالیف کا کام کیا کرتے تھے۔

شاہد بھائی کی شخصیت کے ساتھ ان کے رفقاء کا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ شاہد بھائی مجلسی آدمی تھے۔ دوستوں کے بغیر ان کا کوئی کام پورا نہیں ہوتا۔ وہ اپنا شمار ادیبوں میں نہیں کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ میں ادیب نہیں ہوں، ایڈیٹر ہوں۔ اگر ان کی یہ بات مان لی جائے تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ مُلک میں ایسے کتنے ایڈیٹر ہوں گے جنھوں نے ادیبوں کی ایک نئی نسل کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مواقع فراہم کیے، اور ان کی ذہنی تربیت بھی کی۔ اور ان کی ایسی نگارشات کو جو دھماکہ خیز تھیں اور معاشرے کے ٹھیکے دار جن کی تحریروں پر ناک بھوں چڑھاتے تھے، انھیں اپنے رسالے میں شائع کیا۔

بے شمار ادیبوں نے انھیں لُوٹا اور وہ خوشی خوشی لٹتے رہے۔ انھوں نے ضرورت مند ادیبوں سے کتابیں لکھوائیں۔ اگرچہ یہ کتابیں ردّی کے بھاؤ بکیں لیکن شاہد بھائی نے ان کی عزت اور خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچنے دی اور اس طرح ان کی مالی امداد کی۔ ایک مشہور ادیب کی بیوہ لُٹ لُٹا کر کراچی آئی تو شاہد بھائی نے اُس کے شوہر کی بے شمار کتابوں کی رائلٹی کے کاغذات اُس کے حوالے کر دیے۔

آخری عمر میں شاہد بھائی وہ پہلے سے شاہد بھائی نہیں رہے تھے۔ زمانے کی گردش بیشتر انسانوں کو بدل دیتی ہے لیکن کچھ انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جو اِن حالات میں بھی اپنا مقام نہیں کھوتے اور اپنی جگہ ڈٹے رہتے ہیں اور مشکلات کا بڑی خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد شاہد بھائی کی خودداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لیکن دِل کا دورہ پڑنے سے سال دو سال پہلے وہ اپنے بیشتر پُرانے ساتھیوں سے کنارہ کر چکے تھے۔ شاہد بھائی مر گئے اور ایک دن ہمیں بھی مرنا ہے۔ اگر ان کی پوری زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اُن میں خوبیاں اتنی تھیں کہ تھوڑی سی کمزوریاں ان میں چھپ جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی رُوح پر اپنی رحمتیں نازل کرے (آمین)۔

عطیہ بیگم فیضی

عطیہ بیگم جوانی میں ایک رنگین داستان تھیں اور بڑھاپے میں وہ اس داستان کی داستان گو بن گئیں۔ اور اسی کے سہارے اور سائے میں وہ زندہ رہیں۔

میں نے عطیہ بیگم کو اُس عمر میں دیکھا جب اُن کی جوانی ڈھل رہی تھی۔ بُوٹا سا قد۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ ان آنکھوں میں بلا کی چمک اور ذہانت تھی۔ ہاں رنگ رُوپ وقت کے ساتھ بدلتا گیا۔ اب کچھ مٹیالا ہو کر سانولا ہو گیا تھا۔ ناک ستواں تھی۔ ساری پارسنوں کی طرح باندھتی تھیں۔ پاؤں میں گرگابی۔ ناپ تول کر قدم رکھتیں۔ آواز بڑی رُعب دار۔ ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے۔ گلے میں کبھی سیاہ دانوں کی مالا، کبھی کنٹھا۔ بغل میں چھتری۔ آگے آگے عطیہ اور پیچھے پیچھے اُن کے شوہر — فیضی رحیمین!

مشہور مصور فیضی رحیمین جو عطیہ کے عشق میں یہودی سے مسلمان ہو گئے تھے، عطیہ کے اشاروں پر ناچتے۔ ویسے عطیہ کے اشاروں پر کون نہ ناچا؟ کسی نے دل نذر کیا تو کسی نے ایمان! — عطیہ کے چاہنے والوں کی فہرست میں کئی نام آتے ہیں۔ ان میں وہ بزرگ شامل نہیں ہیں جو چپکے چپکے ان کے نام کی مالا جپتے رہے۔ عطیہ نے جس پر نظر ڈالی وہ ان کے نام کا کلمہ پڑھنے لگا۔ اُن کے عاشقوں میں مولوی شبلی کے علاوہ علامہ اقبال کا نام بھی آتا ہے۔ برناڈ شا نے ایک بار دیکھا تو رال ٹپک پڑی۔ اُن کے عاشقوں کے بے شمار خطوط اُن کے پاس محفوظ تھے۔ خود عطیہ نے (بقول ان کے) ان میں سے کسی کو گھاس نہیں ڈالی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سب ان کے دام میں پھڑکتے اور تڑپتے رہے اور وہ ان کا تماشا دیکھتی رہیں۔ عطیہ کے آخری عاشق یہی فیضی رحیمین تھے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ عطیہ کی شادی فیضی سے پہلے ان کے عاشقوں میں سے کسی سے ہو جاتی تو اُس کا بھی وہی حشر ہوتا جو بے چارے فیضی کا ہوا۔ وہ فیضی سے ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتیں اور اسے بُری طرح ڈانٹتیں اور بے پناہ غصّے کے عالم میں اسے یہودی کُتّا کہتیں۔ لیکن فیضی ہر وقت "جی بیگم صاحب! جی بیگم صاحب" کہتے اور ایک وفادار کُتّے کی طرح دُم ہلاتے رہتے۔ وہ فیضی کی تصویریں اِس طرح دکھاتیں کہ جیسے یہ اُن کی اپنی بنائی ہوئی تصویریں ہیں اور فیضی کی جگہ وہ ان تصویروں کی داد دلیتیں اور اکثر یہ کہا کرتیں۔ "یہ تصویر دیکھو! اس کا آئیڈیا میں نے فیضی کو

دیا تھا ــــ کیوں نیفی؟" اور فیضی حسبِ معمول کہتے۔" جی بیگم صاحب!"

عطیہ بمبئی میں پیدا ہوئیں۔ ان کی زبان پر کوکنی زبان کا اثر تھا لیکن انھیں اُردو اور فارسی کے بہت سے شعر یاد تھے۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی فراٹے سے بولتیں۔ ملک کے ممتاز ادیبوں اور علماء کی صحبتوں میں انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ انھیں بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔

عطیہ اور قلوپطرہ کی داستان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قلوپطرہ ایک ملک کی حکمران تھی۔ اس کے دامِ محبت میں سیزر اور انطونی اس طرح پھنسے جیسے مکڑی کے جال میں مکھی پھنس جاتی ہے۔ عطیہ کی زلفِ گرہ گیر کے گرفتار بڑے بڑے دانش ور تھے۔ وہ دلوں کی ملکہ تھیں۔ عطیہ کے بارے میں نواب محسن الملک کے سیکرٹری مرحوم عبدالحافظ باعکاظہ نے بتایا کہ جب میں جوان تھا تو عطیہ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ اس کے والد کا گھر ہمارے محلّے میں تھا اور جب ہم اپنے محلّے میں کرکٹ کھیلتے تھے تو یہ گیند اٹھا کر لاتی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے عطیہ کی جوانی بھی دیکھی ہوگی۔ آخر عطیہ میں ایسی کون سی بات تھی کہ جس پر وہ نظر ڈالتی، وہ اُس کا ہو جاتا۔ باعکاظہ صاحب نے کہا کہ اُس زمانے میں مسلمان خواتین گھر سے باہر نہیں نکلا کرتی تھیں۔ لیکن عطیہ شروع سے پردے کی پابند نہیں تھی۔ لہٰذا مسلمان علماء، ادیبوں اور شاعروں کے لیے وہ ایک نئی چیز تھی۔ پھر وہ مردوں کی محفلوں میں بیٹھتے اور ان سے کھل کر بات کرنے سے نہیں شرماتی تھی۔ اور مسلمانوں میں دل پھینک حضرات کی کمی نہیں ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن اس کے سوا بھی کچھ ضرور ہوگا۔ جہاں تک مولوی شبلی اور عطیہ کے عاشقے کا تعلق ہے تو عطیہ نے ایک انٹرویو میں مجھے بتایا کہ اُس کے والد کابل میں برطانوی حکومت کے ہائی کمشنر تھے اور ان کی مولوی شبلی سے دوستی تھی۔ عطیہ مولوی صاحب کو چچا کہتی۔ لیکن جب مولوی صاحب چچا کی حد سے آگے بڑھے تو بقول عطیہ اُس نے انھیں ڈانٹ دیا۔ لیکن یہ محض پردہ داری ہے۔ مولوی شبلی کے خطوط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ دو طرفہ تھا۔ اور دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ لیکن یہ بات آگے نہیں بڑھی اور یہ شاید افلاطونی محبت تک رہی۔

جس زمانے میں مَیں ریڈیو پاکستان سے عطیہ کے انٹرویو کا انتظام کر رہا تھا تو مولوی عبدالحق صاحب نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ تم عطیہ سے یہ بھی پوچھنا کہ مولوی صاحب کی ٹانگ میں گولی کیسے لگی تھی؟ میں نے یہ سوال عطیہ سے انٹرویو میں تو نہیں پوچھا، ایک نجی ملاقات میں پوچھ لیا۔ عطیہ اس پر بگڑ گئی اور کہنے لگی۔ تمھیں یہ بات مولوی عبدالحق نے بتائی ہوگی؟ اور میں آج تک یہ سوچ رہا ہوں کہ آخر یہ کیا بات تھی۔ ویسے میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ مولوی عبدالحق اور مولوی شبلی میں کافی کشاکش تھی اور مولوی شبلی کے خلاف مولوی عبدالحق صاحب نے محمود شیرانی مرحوم سے کام لیا تھا لیکن اس کے باوجود شعر العجم کی اہمیت اور مولوی شبلی کے مرتبے میں کوئی فرق نہیں آیا۔

عطیہ نے بتایا کہ سیرت النبیؐ کے سلسلے میں نواب صدیق حسن خاں اور ریاست بھوپال کی حکمران نواب سلطان جہاں بیگم کو انھوں نے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ مولوی شبلی سے حضورؐ کی سیرت پر کتاب لکھوائیں۔ اور مولوی صاحب نے عطیہ کو اس کام پر آمادہ کیا تھا۔ چناں چہ سیرت پر غیر زبانوں میں جتنا کام ہو چکا تھا اُس کے ترجمے عطیہ نے کروائے تھے۔ وَاللّٰہ اعلم۔ عطیہ نے اپنے انٹرویو میں یہ بھی بتایا کہ مولوی صاحب نے اسے لکھنؤ آنے کی دعوت دی تھی۔ چناں چہ اس نے تنہا ریل گاڑی میں بمبئی سے لکھنؤ کا سفر کیا۔ عطیہ نے کہا کہ جب میں لکھنؤ پہنچی تو بڑی دُھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب چھتری لگائے اسٹیشن کے ایک کونے میں کھڑے ہیں۔ ایک دس برس کا بچہ میرے کمپارٹمنٹ کے قریب اُس وقت آیا جب میں گاڑی سے اُتر چکی تھی۔ اُس بچے نے مجھ سے پوچھا۔ کیا آپ ہی عطیہ بیگم ہیں۔ میں نے کہا۔ ہاں میں ہی عطیہ بیگم ہُوں۔ بچے نے کہا۔ میرے ساتھ چلیے، مولوی صاحب بھی آئے ہیں۔ چناں چہ میں نے قُلی کے سر پر سامان رکھوایا اور پلیٹ فارم سے باہر نکلی۔ باہر ایک یکا پہلے ہی کھڑا تھا۔ قُلی نے اُس میں سامان رکھا اور وہ بچہ آگے بیٹھ گیا اور یکا چلا ... دیکھتی کیا ہُوں کہ میرے پیچھے کے یکے میں مولوی صاحب سمٹے سمٹائے بیٹھے ہیں۔ مولوی صاحب کی اس حالت پر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد یکا مولوی صاحب کے گھر پہنچا اور میں گھر کے اندر داخل ہُوئی۔ اتنے میں مولوی صاحب بھی آ گئے۔ مولوی صاحب کا گھر پُرانے زمانے کا تھا۔ ڈیوڑھی سے گزرو تو سامنے صحن۔ پھر برآمدہ، پھر دونوں طرف کمرے۔ مولوی صاحب کی اہلیہ اور ان کی بیٹی سے ملاقات ہُوئی۔ چُوڑی دار پاجامہ، ڈھیلا ڈھالا بنا کرتا۔ سر پر دوپٹہ۔ دونوں ماں بیٹیوں کے کپڑے گھر میں رنگے ہُوئے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں تھیں۔ ماں کے ہاتھوں اور پاؤں کی اُنگلیوں میں چھلّے، ناک میں لونگ اور کانوں میں بُندے تھے۔ بیٹی کی ناک میں نیم کا تنکا تھا البتہ کانوں میں بالیاں تھیں۔ دونوں کے بال اُلٹے تھے۔ میں یہاں ایک ہفتے رہی اور دونوں ماں بیٹیوں میں گھُل مل گئی۔ میں اُن سے اتنی بے تکلف ہو گئی کہ میں نے ان کے ساتھ مل کر ڈھولک پر ساون کے گیت گائے۔

ایک دن مولوی صاحب نے مجھ سے کہا کہ آزادیٔ نسواں کے سلسلے میں تمھارے جو خیالات ہیں۔۔ میں ان سے متفق نہیں ہُوں۔ تم یہ کہتی ہو کہ اسلام نے عورتوں کو آزادی دی ہے مگر علماء نے من مانی پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ میں نے علما کو آج دعوت دی ہے۔ وہ آئیں گے، بیچ میں پردہ ہو گا۔ تمھیں ان سے بحث کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ عطیہ نے کہا کہ جب علماء حضرات آکر بیٹھے اور میں پردے کے پیچھے ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی اور بات چیت شروع ہُوئی تو میں علماء کو ترکی بہ ترکی جواب دیتی رہی۔ پھر پردے کا مسئلہ آیا اور میں دورانِ تقریر اتنی جوش میں آئی کہ پردے سے نکل کر علماء حضرات کے درمیان آ بیٹھی۔ ایک بار تو علماء نے بیک آواز لاحول پڑھی اور پھر وہ غصے سے اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے کہا خود لاحول پڑھی اور خود چلے گئے۔

مولوی شبلی صاحب کا یہ حال تھا کہ ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا۔ وہ انتہائی غصے میں مجھ پر برسنے لگے اور انھوں نے کہا "عطیہ بیگم! اب میں علماء کو منھ دکھانے کے قابل نہیں رہا"۔ مولوی صاحب علماء کو منھ دکھانے کے قابل رہے یا نہ رہے لیکن واک آؤٹ کر کے علما نے ہی ثابت کر دیا کہ ان کے پاس میرے اعتراضات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

نواب سلطان جہاں بیگم کے بارے میں عطیہ بیگم یہ کہا کرتی تھیں کہ اگر بیگم صاحبہ چاہتیں تو بڑے بڑے نوابوں اور نواب زادوں کے رشتے موجود تھے لیکن انھوں نے ایک عالم بے بدل مولوی نواب صدیق حسن خاں سے شادی کی جن کے پاس علم کی دولت کے سوا اور کچھ نہ تھا اور بیگم صاحبہ ان کی اسی طرح خدمت کرتی تھیں جس طرح اس زمانے کی ایک عام عورت اپنے شوہر کی کیا کرتی تھی۔ بیگم صاحبہ ایک باپردہ خاتون تھیں۔

عطیہ حسن پرست اور عاشق مزاج تھیں۔ بمبئی میں وہ ساحل سمندر پر، جب چاند کی چودھویں ہوتی، تو ایک پارٹی کرتیں جس میں حسین عورتیں اور خوش رُو نوجوان سپید لباس پہن کے جمع ہوتے۔ عورتیں موتیا اور چمپا کے پھولوں کے ہار اور گجرے پہنتیں۔ جوڑے میں سفید پھولوں کا ہار لپٹا ہوتا۔ کان کی بالیوں میں بھی پھول پرو دئے ہوتے۔ پھر ساحل سمندر پر ساز کے ساتھ چاند اور چاندنی کے گیت گائے جاتے۔ آپس میں چہلیں بھی ہوتیں۔ چاندنی رات کی موسیقی عطیہ بیگم خود ترتیب دیتیں۔

عطیہ کی بہن نواب جنجیرہ کی بیگم تھیں۔ عطیہ کی زندگی میں عیش و عشرت اور دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ چناں چہ انھوں نے بھرپور زندگی گزاری۔ عطیہ کا کہنا تھا کہ ان کے دل میں کوئی ایسی خواہش نہیں تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔ عطیہ صورت شکل سے جادوگرنی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ مصر بھی گئیں اور فراعنۂ مصر کے زمانے کی تہذیب کی تاریخ کے سلسلے میں ان کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ وہ اس زمانے کے راگ راگنیوں کی شکلیں امراؤ بندو خاں اور دوسرے گانے والوں اور گانے والیوں کو بتا کر ان سے گواتیں۔ اور یوں لگتا جیسے ہم فراعنۂ مصر کے زمانے کے مصر میں پہنچ گئے ہیں ـــ وہی ہیبت، وہی خوف! وہ دیکھو فرعون کی سواری گزر رہی ہے۔ وہ اہرام مصر کی تعمیر کے لیے مصر کے باشندے، جو بیگار میں پکڑے گئے ہیں، زنجیروں سے بندھے ایک چٹان کو گھسیٹ کر لا رہے ہیں۔ چٹان پر اوورسیئر کھڑے مزدوروں کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسا رہے ہیں۔ اور وہ لہولہان ہو رہے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک ریگستان کی دھوپ میں گر کر مر گئے اور ان کی لاشیں گھسٹتی چلی آ رہی ہیں ـــ پھر وہ موسیقی، جب فرعون مر رہا ہے اور اس کی لاش کو چار دیواری میں بند کیا جا رہا ہے، اس کے سامنے اس کی ملکہ، کنیزیں، غلام اور اس کی دولت اور خوراک بھی دفن کی جا رہی ہے ـــ ملکہ اور کنیزوں کے دم گھٹنے کی آوازیں ـــ پھر دریائے نیل کا مدوجزر ـــ عطیہ راگ شروع ہونے سے پہلے راگ کی شکل پیش

کرتی اور راگ کے ساتھ ساتھ اس پر تبصرہ بھی کرتی جاتی۔ اس کے پاس اس زمانے کے ساز بھی تھے اور مصر کی موسیقی پر کتابیں بھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے فرعون کی ملکہ اہرام سے نکل آئی ہے اور اپنے زمانے کے حالات سُنا رہی ہے۔

عطیہ کو قیمتی پتھروں اور جواہرات کی بڑی پرکھ تھی۔ اس کے پاس ان پتھروں اور جواہرات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ عطیہ کی شخصیت انتہائی پُراسرار تھی۔ اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ وہ ایک پوری صدی کی تہذیبی زندگی کی امین تھی۔ اس کے نزدیک بیں ایسے تجربے بھی تھے جو اُس کے قیمتی پتھروں اور بے مثال جواہرات سے زیادہ نادر تھے اور جن کو شکار کرنا عطیہ کے علاوہ اور کسی کے بس میں نہیں تھا۔

فیضی عطیہ سے پہلے چل بسے بیگم جنجیرہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اب اِس بھری پُری دنیا میں عطیہ تنہا رہ گئیں۔ اور پھر جب وہ بیمار پڑیں اور ہاتھ پاؤں نے ساتھ نہ دیا تو جناح اسپتال میں داخل ہوگئیں۔ ان کی وفات سے چند دن پہلے ریڈیو پاکستان کے ایک نمائندے ایس ایم سلیم نے ان کا انٹرویو کیا اور اُن سے یہ سوال پوچھا: "بیگم صاحبہ! کیا ان حالات میں آپ یہ نہیں سوچتیں کہ آپ کی کوئی اولاد ہوتی ... کوئی بیٹا ہوتا اور وہ آپ کی خدمت کرتا۔" عطیہ نے کہا۔ "اور اگر وہ نالائق ہوتا؟" ...... سوال کرنے والے کے ہونٹ سِل گئے ... عطیہ دُنیا سے خوش خوش گئیں۔ انھیں زندگی سے پیار کرنا آتا تھا۔ وہ مرتے وقت ورثے میں خوشیاں دے گئیں ... اور وہ اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ اپنی قوم کے حوالے کر گئیں۔

مُلّا رموزی

مُلّا رموزی باغ و بہار آدمی تھے۔ ایک زمانے میں ملک میں کوئی اخبار یا رسالہ ایسا نہ تھا جس میں مُلّا صاحب کا مضمون نہ چھپتا ہو۔ مُلّا صاحب ندوہ کے فارغ التحصیل تھے۔ عربی فارسی کے عالم۔ بھوپال کے دیہات کے اسکول میں ماسٹر تھے۔ خالص ولایتی آدمی تھے۔ کرزن کٹ مونچھیں، رنگ گندمی علی گڑھی شیروانی پہنا کرتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں سر پہ ہیٹ لگاتے۔ سائیکل ان کی سواری میں رہتی۔ پچھلے پہیے کی کھونٹی سے سائیکل کو دھکیل کر اس پر سوار ہوتے۔ ایک دو فرلانگ چلنے کے بعد سائیکل کی چین اُتر جاتی تو یہ نیچے اُتر کر پتھر تلاش کرتے۔ اور پھر ٹھونک پیٹ کر چین کو ٹھیک کرتے اور اچھل کر سائیکل پر سوار ہو جاتے۔ ایک دن میں نے مُلّا صاحب سے کہا کہ آپ اپنی جیب میں پتھر کیوں نہیں رکھ لیتے؟ تو کہا کہ میں اپنے دوستوں سے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتا۔

مُلّا صاحب بولتے بہت کم تھے لیکن جب بھی وہ بولتے تو ان کے بولتے ہی محفل میں ایک قہقہہ بلند ہوتا۔ میں جب بھی بھوپال جاتا تو مُلّا صاحب سے ضرور ملتا۔

مُلّا صاحب کی جیب میں ایک بٹوہ رہتا جس میں بھوپال کا مشہور گلکا ہوتا اور چینیتی تو وہ اکثر اپنی مٹھی میں دبائے رکھتے۔ جہاں موقع ملتا چینیتی میں سے چونا نکال کر چاٹ لیتے۔ وہ اپنی تحریروں میں بھی اسی چونے سے کام لیتے اور بڑے مزے سے چونا لگا جاتے۔ آدمی تھوڑے سے اناڑی تھے۔ مکھن بھی لگاتے تو اُس پر بھی چونے کا گمان ہوتا۔ مُلّا صاحب دون کی بہت لیتے تھے۔ اپنے نام کے آگے فاضل الٰہیات اور ایم آر ایس (لندن) اور ایم آر ایس (امریکا) وغیرہ ضرور لکھا کرتے تھے۔ مُلّا صاحب ویسے تو سارے ہندوستان میں مشہور تھے لیکن بھوپال اگر اپنے تال (تالاب) کی وجہ سے مشہور تھا تو اُس کی شہرت کا باعث مُلّا صاحب بھی تھے۔ مُلّا صاحب بلا کے حسن پرست تھے۔ شہر کا کوئی حسین لڑکا ایسا نہ تھا جس سے مُلّا صاحب واقف نہ ہوں۔

بھوپال میں ایک اخبار فروش کی دکان پہ اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ یہی ان کا دفتر تھا۔ ان کی ڈاک یہیں آتی۔ خط کا جواب فوراً دیتے اور جواب وہ پوسٹ کارڈ پہ دیا کرتے تھے۔ کوئی رسالہ یا اخبار ایسا

نہیں تھا جو مضمون کے لیے مُلّا صاحب سے تقاضا نہ کرتا ہو۔ اُس زمانے میں اخبار اور رسالے
معاوضہ نہیں دیا کرتے تھے۔ اخبار زمیندار تو ایسا اخبار تھا جس میں کسی کا مضمون یا نظم شائع ہونا ہی
بڑی بات تھی لیکن مُلّا صاحب تو سب ہی سے معاوضہ وصُول کر لیتے۔ اس سلسلے میں وہ مروّت سے
کام نہیں لیتے تھے۔ مُلّا صاحب سے مولانا ظفر علی خان اور خواجہ حسن نظامی بھی اپنے خاص نمبروں
کے لیے مضمون لکھنے کی فرمائش کرتے تو مُلّا صاحب ایک روپیہ فی صفحہ کے حساب سے اپنا
مضمون بذریعہ وی پی بھجوا دیتے۔ یعنی مُلّا صاحب برِّصغیر کے ادیبوں میں پہلے کاروباری ادیب
تھے۔ ایک مرتبہ مَیں نے امرت سر سے ایک رسالہ آبشار کے نام سے نکالا تھا اور مُلّا صاحب سے
فرمائش کی کہ وہ اس کے لیے مضمون بھیجیں۔ اس کے جواب میں مُلّا صاحب نے یہ لکھا کہ تمھارے خط سے
یہ معلوم ہُوا کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ مَیں مضمون بغیر معاوضے کے لکھوں گا تو یہ خیال اپنے دِل سے نکال دو یہ لکھو کہ
کتنا معاوضہ میرے مضمون کا دو گے تاکہ مَیں اسی حساب سے مضمون لکھ کر تمھیں وی پی کے ذریعے بھیج دُوں۔

مُلّا صاحب شاعری بھی کرتے تھے لیکن ان کی شاعری نری تُک بندی ہوتی۔ مُلّا صاحب کے
مضامین کے کئی مجمُوعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "لاٹھی اور بھینس" بہت مشہُور رہے۔ ان کی گلابی اُردو
بھی بہت مقبُول ہُوئی۔ اُس زمانے میں مولوی صاحبان جس زبان میں وعظ کیا کرتے تھے، مُلّا صاحب
کی گلابی اُردو اُسی زبان کا چربہ تھی مثلاً ... امّا بعد۔ فرمایا گلیڈ اسٹون صاحب نے بیچ اپنی تقریر
کے کہ سُورج انگریزی اقتدار کا جو چمکتا ہے بیچ تمام مُلکوں میں ہمارے کے مزید آگر رہے گا دِن قیامت
کے نیزے سوا پر جیسا کہا ہے گرجا کے بڑے مولوی صاحب نے کہ کہا جاتا ہے ان کو پاپائے اعظم بھی۔
پس اس واسطے اے مسیح کی بھیڑو بشارت ہو تم کو واسطے سے ہمارے لندن ٹائمز کے کہ سایہ ہے
جس پہ ملکہ کا جو مادرِ مہربان ہے ہندوستان کے راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کی بالتحقیق بعد از
زوال کمپنی بہادر مرحُومہ کے...

مُلّا صاحب کے مضامین میں بھرتی اور خانہ پُری بھی ہوتی لیکن کچھ جملے ایسے کیلے بھی ہوتے
جو مزا دے جاتے اور برسوں یاد رہتے۔ مُلّا صاحب نیشنلسٹ مُسلمان تھے۔ وہ خلافت کے حامی
تھے۔ ترکوں کو دادِ شجاعت دیتے تھے۔ نئی روشنی اور مغربی تہذیب کے خلاف تھے۔

وہ شروع شروع میں محمد صدیق جو اُن کا اصلی نام تھا، کے نام سے لکھتے تھے۔ پھر یہ محمد صدیق
توحیدی کے نام سے لکھنے لگے اور آخر میں اُنھوں نے مُلّا رموزی کا قلمی نام اختیار کر لیا۔ گلابی اُردو میں
لکھنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ سرکاری ملازم تھے۔ بات پتے کی کہنا چاہتے تھے سو گلابی اُردو ایک پردہ تھی
جس میں وہ سب کچھ کہہ جاتے۔ اس میں شبہ نہیں مُلّا صاحب اپنے عہد کے سب سے بڑے طنز نگار تھے۔
مُلّا صاحب نے چار شادیاں کی تھیں۔ وہ اپنے مضامین میں اکثر اپنی بیویوں کا بھی ذکر کرتے

اور یہ لکھتے کہ بیوی نمبر ایک نے یہ کہا لیکن بیوی نمبر چار نے اس سے اختلاف کیا۔ مُلّا صاحب کا ایک گھر چاروں بیویوں کے لیے تھا لیکن دوسرے گھر میں وہ تنہا رہتے تھے اور یہاں وہ تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے۔

ملّا صاحب علمِ نجوم، جفر اور دست شناسی میں ماہر تھے۔ وہ ہاتھ کی ریکھا دیکھ کر قسمت کا حال بتا دیتے۔ صہبا لکھنوی (مدیر "افکار") کی ملّا صاحب سے بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک مرتبہ صہبا صاحب نے ملّا صاحب سے کہا "افکار" کے اعداد یہ بتاتے ہیں کہ یہ رسالہ قائم و دائم رہے گا۔ ملّا صاحب نے کہا "یہی تو مشکل ہے کہ جب تک یہ پرچہ قائم رہے گا، اس کا ایڈیٹر حیران و پریشان رہے گا"۔ ملّا صاحب کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ پرچہ نکل رہا ہے لیکن صہبا کا بُرا حال ہے۔
ملّا صاحب آدمی "شکّی" مزاج تھے۔ کبھی کبھی اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے منھ موڑ لیتے اور محفل سے اُٹھ کر چلے جاتے۔ جس اسکول میں وہ پڑھاتے تھے، وہاں ان کا یہ حال تھا کہ غصہ آجاتا تو لڑکوں کو دُھنک کر رکھ دیتے۔

ملّا صاحب کا مکان قبرستان کے اتنا قریب تھا کہ بس یہ سمجھیے کہ قبرستان ہی میں رہتے تھے۔ جب مرے تو اُسی قبرستان میں دفن ہوئے۔ گویا گھر کی بات گھر ہی میں رہی۔ ملّا صاحب کی شخصیت پر قبرستان کا خاصا اثر تھا۔ کوئی مرے یا جیے وہ یکسوئی سے اپنے کام میں لگے رہتے۔
اللہ بخشے بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔

ممتاز حسن

کِسے کو خبر تھی کہ ڈاکٹر ممتاز حسن ایسے خوش دِل اور خوش باش آدمی یوں چلتے پھرتے چٹ پٹ ہو جائیں گے۔ میں ممتاز حسن کی زندگی میں اُن پر لکھنا چاہتا تھا۔ اور لکھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ انھوں نے مجھے وقت سے پہلے لکھنے پر مجبور کر دیا۔ ممتاز حسن کے سارے کام ایسے ہی تھے۔ ممتاز حسن کی عمر چھیاسٹھ برس کی تھی اور یہ اُن کے مرنے کی عمر نہیں تھی۔ انھوں نے بہت سے کام پھیلا رکھے تھے۔ زندگی میں ایک صدمہ اور سب سے بڑا انھیں یہ پہنچا تھا کہ ان کی جوان بیٹی رفعت سلطانہ انتقال کر گئیں۔ ممتاز صاحب نے اپنی اس بیٹی کی یاد میں رفعت میموریل ٹرسٹ قائم کیا اور جب تک وہ زندہ رہے اور جو کچھ کماتے رہے اس ٹرسٹ کی نذر کرتے رہے۔ ریڈیو پاکستان اور ٹی وی سے انھیں جو بھی معاوضہ ملتا وہ رفعت سلطانہ ٹرسٹ کے فنڈ میں جمع کر دیتے۔ وہ بے شمار اداروں کی اس ٹرسٹ سے مدد کر رہے تھے۔

میں ممتاز حسن مرحوم کا نام اُس وقت سے سُن رہا ہوں جب وہ ایف سی کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ شاہد احمد دہلوی مرحوم ان کے ہم جماعت تھے۔ یہ زمانہ مجھے یاد نہیں۔ البتہ سراج الدین ظفر کا ایف سی کالج کا زمانہ یاد ہے۔ ممتاز صاحب بڑے ہونہار طالب علم تھے۔ ذکی الطبع، محنتی اور سعادتمند۔ ان کی ابتدائی تعلیم امرت سر میں ہوئی۔ یہاں انھوں نے پنجاب کے عربی کے سب سے بڑے عالم مولوی محمد عالم آسی سے عربی پڑھی فارسی بھی انھوں نے دِل لگا کر پڑھی اور اس زبان پر انھیں قدرت تامہ حاصل تھی۔ وہ انگریزی زبان کے اسکالر تھے۔ علامہ اقبال کی بہت سی نظموں کے انھوں نے انگریزی زبان میں ترجمے کیے۔ جرمنی زبان بڑے ذوق و شوق سے سیکھی۔

ممتاز حسن مرحوم کے والد غلام محمد مرحوم تھے جو ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ خوش دل تخلص کرتے تھے۔ گجرات (پنجاب) کے ایک موضع مونڈی میں پیدا ہوئے۔

ممتاز حسن کا خاندان پنجاب کے علماء و فضلاء کا خاندان تھا اور اس میں بے شمار ایسے افراد گزرے ہیں جو فارسی زبان کے نامی گرامی شعراء اور نثر نگار تھے۔

اسی خاندان کے ایک بزرگ محمد افضل خان تھے جو فارسی زبان کے نامور شاعر تھے۔ ممتاز حسن فارسی زبان کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ ۱۹۵۰ء میں جب ان کی ملاقات تہران میں ملک الشعرا بہار سے ہوئی تو انھوں نے اپنا یہ شعر سنایا۔

زحسنت کم نمی گردد اگر بالائی بام آئی
نقاب از رخ کشا یک لحظہ دیدن آرزو دارم

یہ شعر سن کر ملک الشعرا نے ان کی پیشانی چوم لی۔

ممتاز حسن مرحوم کی ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

رشتۂ رخشانت عیاں از پردۂ او بام من — من گرفتار طلسم امتیاز ماو تو
تازگی جوید ز دامانِ تو جانِ سوختہ — من گلِ پژ مردہ تو سرچشمہ ہر رنگ و بو
آستانِ یار را پنہاں ز چشمم می کند — صد تفو بر ہستی دنیا و ما فیہا تفو

اور اب عراقی کا رنگ ملاحظہ ہو:

چکنم بہ میہمانی کہ بمن دمی نسازد — نہ برون در نشینی نہ درون خانہ آئی
تو اگر بمن نگنجی بفلک چساں نشینی — ہمہ کائنات در من تو خدا و من خدائی
نہ اسیر بند ایم نہ رہین فکر آنم — کہ جہاں فروختم من بسرور بی نوائی
اگر از جمال شوخی سر محفلی بگویم — دل پادشا برآرم ز حریم پارسائی

ایک اور غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

تاسف میخورم از بے کسی ہائے تمنائم — کہ من چو تیز تر سوزم ترا بیگانہ تر بینم
چہ باشد احسن مضطر ترا انجام می ترسم — بہر روز یکہ می گزرد ترا آشفتہ تر بینم

ممتاز حسن میں بلا کا عجز و انکسار تھا۔ جب وہ فنانس سیکرٹری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے تو اس وقت بھی وہ تھوڑی سی رعونت جو بڑے افسروں میں آجایا کرتی ہے، ان کی شخصیت میں نہیں آئی۔ اگر انھیں چپراسی سے پانی منگوانا ہوتا تو وہ اس سے یوں کہتے۔ بھائی اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو تھوڑا سا پانی پلا دیجیے۔ ویسے بچے تو آپ کے اچھے ہیں۔ گھر میں تو خیریت ہے۔

بجٹ کی مار امار تیاریاں ہو رہی ہیں، میں اور ضیا جالندھری ان سے تقاضے کر رہے ہیں کہ آج ریڈیو سے آپ کو تقریر کرنی ہے اور وہ مسکرا کر کہتے ہیں کہ بھائی کل اسمبلی میں بجٹ پیش ہو رہا ہے، اب بتاؤ کیا کروں۔ پھر جب ہم انھیں مجبور کرتے تو کہتے ــــ اچھا شام کو سات بجے آنا۔ میں اسٹینو کو لکھوا دوں گا، اور پھر دیکھو کوئی وقت نکال لیں گے۔ اسٹیٹ بنک کے گورنر ہوگئے تو ان کے علمی ادبی ذوق و شوق میں کوئی فرق نہیں آیا اور نہ گورنری کی ان میں آن بان پیدا ہوئی۔ غرض کہ ہر بڑے سے بڑے عہدے پر ممتاز حسن

ممتاز حسن ہی رہے ۔ عہدے داری اُن کی شخصیت میں حائل نہ ہوئی ۔ اُن کی قلندری اور درویشی کو اُن سے چھین نہ سکی ۔

ہم نے عہدے داری سے اکثر انفرادیت کو ختم ہوتے دیکھا ہے لیکن ممتاز حسن اس کوچے سے اپنا سب کچھ بچا کر نکلے ۔ جب ممتاز حسن ریٹائر ہوئے تو انھیں پلاننگ کمیشن میں ایک عہدہ دیا گیا ۔ اُن کے دفتر کا چوکیدار یہ بھول گیا تھا کہ صاحب دفتر میں افطار کے بعد بھی کام کرتے ہیں ۔ وہ دفتر کے پھاٹک میں تالا لگا کر چلا گیا ۔ ممتاز حسن صاحب کے سیکرٹری کسی کام سے باہر جانا چاہتے تھے ۔ انھوں نے پھاٹک پر تالا دیکھا تو بہت پریشان ہوئے ۔ ممتاز صاحب بھی کام ختم کر چکے تھے ۔ سیکرٹری نے ساری بات بتائی اور کہا ۔ کل چوکیدار کے خلاف سخت اقدام کیے جائیں گے اور میں نے ٹیلی فون پر فلاں افسر صاحب کو مطلع کیا ہے کہ وہ چوکیدار کو اپنے ساتھ لاکر تالا کھلوائیں ۔ ممتاز حسن نے قہقہہ لگایا اور کہا ۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔ ویسے ہم نے بھی اُس کے ساتھ زیادتی کی ہے ۔ افطار کے وقت اُسے روکنا زیادتی ہے ۔ وہ بھی انسان ہے ۔ بھول گیا ہوگا ۔ اب میں اس کھڑکی سے کود کر پیچھے پر اُتروں گا اور وہاں سے زمین پر کودوں گا اور کینٹین کی میز پر کرسی رکھ دوں گا تو اس طرح آپ بڑی آسانی سے نیچے اُتر سکیں گے ۔

ممتاز حسن صاحب کی بیگم مرحومہ مجھ سے بے پناہ شفقت فرماتی تھیں ۔ ہم گھنٹوں باتیں کرتے ۔ موضوعِ گفتگو ممتاز صاحب ہوتے ۔ مرحومہ کو ممتاز صاحب کی صحت کا بہت خیال رہتا ۔ کہتی تھیں کہ یہ کام بے ڈھب کرتے ہیں ۔ پھر یہ گھر بار کے کام کے لیے وقت نہیں نکالتے ۔ گھر سے زیادہ ان کا تعلق دفتر سے رہتا ہے ۔ پھر کتابیں ہیں ۔ ادیب ہیں ۔ شاعر ہیں ۔ فرمایا ۔ ایک مرتبہ ممتاز صاحب نے ہم سے کہا ۔ آؤ چلو تمھیں سیر کرا لاؤں ۔ ہم حیران ہوئے کہ آج انھیں کیا ہو گیا ہے ۔ ہم خوشی خوشی ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھے ۔ صدر آئے ۔ ممتاز صاحب نے کہا ۔ ابھی آتا ہوں ۔ اور پھر ہمیں دھوپ میں چھوڑ کر وہ گئے تو شام ہو گئی ۔ واپس آئے تو بہت سی پرانی کتابیں اپنے ساتھ لے کر آئے ۔ اور مسکرا کر کہا ۔ بہت مزا آیا ۔ اس میں ایسی ایسی کتابیں ہیں جو پاکستان میں نہیں ملتیں ۔

ڈائرکٹر تعلیمات کراچی نے چھٹی جماعت کی اردو کی ایک درسی کتاب کی تالیف و تصنیف کا کام میرے اور ممتاز صاحب کے سپرد کیا ۔ مجھے جو کچھ لکھنا تھا میں لکھ چکا ۔ اب اس میں ممتاز صاحب کے دو ایک مضمون شامل ہونے تھے اور اُس کتاب پر مجموعی طور پر انھیں نظرِ ثانی بھی کرنا تھی ۔ وہ روزانہ مجھے کبھی اپنے دفتر اور کبھی اپنے گھر بلاتے ۔ لیکن اُن کی اور مصروفیات نکل آتیں اور کتاب رہ جاتی ۔ میں جب بھی اُن کے گھر جاتا ۔ بیگم صاحبہ مسکراتیں اور فرماتیں ۔ بھائی یہ ممتاز حسن صاحب ہیں ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکل آسان کرے ۔ مشکل یہ ہے کہ وہ آپ کا شمار اپنے دوستوں میں نہیں کرتے ، خاندان کے افراد میں کرتے ہیں ۔ خیر ایک دن میں نے ممتاز حسن صاحب کو پکڑ کر اس کام کی تکمیل کروائی ۔

ایک دن میں ممتاز حسن صاحب کے دفتر میں اُن کے ساتھ بیٹھا تھا۔ انھوں نے کھانا منگوایا ہم دونوں نے کھایا۔ پھر انھوں نے کہا۔ پانچ منٹ کی اجازت دو میں ذرا قیلولہ کر لوں۔ پھر گھر چلیں گے یہ کہہ کر انھوں نے اپنے مُنھ پر رومال ڈال لیا۔ اور رومال ڈالتے ہی وہ خرّاٹے لینے لگے۔ ٹھیک پانچ منٹ کے بعد انھوں نے رومال اتارا۔ اور وہ ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ ہم گھر پہنچے۔ ممتاز صاحب نے کہا۔ ارے بھائی غضب ہو گیا۔ میں نے کہا خیریت تو ہے۔ کہنے لگے میں نے پانچ بجے جرمنی کے سفیر کو چائے کی دعوت دی ہے۔ اور بیس افراد اور بھی آئیں گے۔ وہ جرمنی واپس جا رہا ہے۔ اور اب تین بجے ہیں۔ بیگم صاحبہ نے کہا۔ آج باورچی بھی چھٹی پر ہے اور ڈرائیور اب کل صبح آئے گا۔ میں نے کہا۔ دیکھیے کچھ کرتے ہیں۔ میں نے آٹو رکشا کرائے پر لی۔ نظام الدین اینڈ سنز کو کرسیوں، میزوں اور قالین اور دریوں کا آرڈر دیا۔ پھر بازار آیا۔ دہی بڑے، دال موٹ، کیک، بسکٹ، اور مٹھائی خریدی۔ اور واپس آیا۔ تھوڑی دیر میں بیگم صاحبہ اور بچیاں مہمانوں کے نشست کے انتظامات سے فارغ ہوئیں۔ میں نے کیتلی میں چائے کا پانی چولھے پر چڑھا دیا اور اب باورچی بنا ہوا باورچی خانے میں کھڑا ہوا ہوں اور بچیاں میرا ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ یہاں تک کہ جب دعوت ختم ہوئی تو ممتاز صاحب نے مجھے باورچی خانے سے نکالا۔ میرا بُرا حال تھا۔ پھر سب نے مل کر دوسری نشست میں مجھے مہمانِ خصوصی بنایا۔ ماہر امراضِ قلب عزیزی ڈاکٹر شفقت کی بات ممتاز صاحب کی منجھلی صاحب زادی سے پکی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ابھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میرے میزبانوں میں وہ بھی شریک تھے۔ جب بیگم ممتاز حسن نے مجھ سے کہا کہ کیوں بھائی۔ ممتاز حسن صاحب کی دوستی میں کیسا مزا آیا تو میں نے عرض کیا کہ آدمی احتیاط کرے تو ایسی بُری نہیں ہے۔

ممتاز صاحب باغ و بہار آدمی تھے۔ کہیں بیٹھ جاتے اور باتیں چھیڑ دیتے تو یوں لگتا کہ جیسے بے شمار کتابیں بولنے لگی ہیں۔ داستانوں سے داستانیں نکل رہی ہیں۔ کیا شاعری، کیا ادب اور کیا معاشیات کیا فلسفہ، اور کیا سیاست۔ بارہا ممتاز صاحب کو وزیر بنانے کی کوشش کی گئی لیکن انھوں نے ہمیشہ یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ میری ساری زندگی مزدوری کرتے گزری ہے، سیاست سے میرا جی گھبراتا ہے۔ وزیر بننے کی مجھ میں صلاحیت نہیں ہے۔

ہم نے ناظم آباد میں کرائے کے ایک مکان میں ایک چھوٹا سا اسکول کھولا۔ جس کا نام ہیپی ڈیل اسکول رکھا۔ ہم نے اس اسکول کی ایک مجلسِ انتظامیہ بنائی اور ممتاز صاحب کو اس کا فاؤنڈر ممبر اور صدر بنایا۔ رُوحِ رواں اس مدرسے کی آمنہ بیگم ممتاز ہیں۔ جو لیڈز یونیورسٹی کی ایم ایڈ ہیں۔ انھوں نے شانتی نکیتن میں ڈاکٹر ٹیگور کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کا خیال ایک مثالی مدرسہ قائم کرنے کا تھا۔ میں بھی اس مدرسے کا فاؤنڈر تھا۔ ممتاز صاحب نے ہماری سرپرستی کی اور دنوں میں یہ مدرسہ

شہر کا نامی گرامی مدرسہ بن گیا۔ عباس خلیلی صاحب نے اسے چھ ایکڑ زمین دلوائی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی نہایت ہی وسیع اور کشادہ عمارت تعمیر ہو گئی اور پھر اس کی انتظامیہ نے کھیل کا ایک وسیع میدان بھی حاصل کر لیا۔ اس مدرسے کا انٹرینس کا نتیجہ مدتوں سو فی صد رہا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اگرچہ اس مدرسے میں انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم تھی لیکن بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب اس کے بانی ممبروں میں شامل تھے۔ اس مدرسے کی فیس انگلش میڈیم کے تمام مدرسوں سے کم تھی۔ ممتاز صاحب سے لوگوں نے کہا کہ وہ فیس میں اضافہ کریں۔ لیکن وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ اچھی تعلیم اور تھوڑی فیس ہمارا اصول ہونا چاہیے۔ اور پھر یہ ہوا کہ تھوڑی فیس کی وجہ سے یہ اسکول قومی تحویل میں چلا گیا۔ اور ممتاز صاحب نے اس پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور یہ فرمایا میاں! کون سا یہ مدرسہ ہم نے کھانے کمانے کے لیے کھولا تھا۔ سُنّت کی ذمہ داری تھی، بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہماری حکومت نے ہماری ذمہ داری قبول کر لی۔

ممتاز حسن صاحب سفارش کرنے سے بہت گھبراتے تھے۔ سفارش ایسی کرتے کہ سفارش بھی ہوتی اور نہیں بھی ہوتی۔ مثلاً جس سے وہ سفارش کرتے اُس سے کہتے کہ بھائی ذرا اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر یہ کام کر سکتے ہو تو کر دو اور اس میں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اور کوئی دوسرا اُمیدوار مستحق نہ ہو تو بھیا، یہ کام کر دینا۔ بے چارا دعائیں دے گا۔ ممتاز حسن صاحب نے نہ اپنے لیے کچھ کیا اور نہ اپنی اولاد کے لیے ورنہ وہ کیا نہیں کر سکتے تھے۔ ہاں انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کی حتی الوسع امداد کی۔ انھیں قرض دلوائے، نوکریاں دلوائیں، کام پر لگایا۔ بے شمار ثقافتی اداروں کے وہ صدر تھے۔ وہ بے پناہ مصروف رہا کرتے تھے۔ مٹھاس کے بہت شوقین تھے۔ بہت کم کھانے تھے۔ باقاعدہ ورزش کرتے تھے اور اپنے دوستوں کو بھی ورزش کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ اُن کی ورزش کا طریقہ یوگا سے ملتا جلتا تھا۔ وہ سچے مسلمان تھے۔ اور عاشقِ رسولؐ تھے۔ وہ علامہ اقبالؔ کے بڑے عقیدت مند تھے۔ اقبالؔ پر جتنا کام ہوا ہے وہ ممتازؔ صاحب کی نگرانی میں ہوا ہے۔

ایک مرتبہ ممتازؔ صاحب کو یہ جھک لگی کہ محمد بن قاسمؒ کی فوج کہاں اُتری تھی۔ محبِ گرامی پیر حسام الدین راشدی، مرحوم قاضی احمد میاں اخترؔ، حفیظؔ ہوشیار پوری اور سید ہاشمی فرید آبادی، مسلمان جغرافیہ دانوں کی کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ اور پھر انھوں نے گرد و نواح کا جائزہ لیا اور وہ جگہ ڈھونڈ نکالی جہاں محمد بن قاسمؒ کی فوج اُتری تھی۔ یہ بھنبھور کا علاقہ تھا۔ سسّی پنوں والی سسّی کا شہر!

تیرا لُٹ گیا شہر بھنبھور سسّیے بے خبرے

قاضی صاحب کے درِ دولت پر ان کو لمیسوں کا مجمع لگا رہتا۔ میں بھی اس مجمع میں بیٹھ کر اُن کی باتیں سُنا کرتا تھا۔ ان کے دوستوں میں نبی بخش بلوچ بھی تھے۔ ان کے کرم فرماؤں میں پروفیسر عبدالعزیز میمن تھے۔ ہری چند اخترؔ سے ان کی گہری دوستی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد ہری چند اخترؔ کراچی آئے اور ممتاز حسن

صاحب کے مکان پر قیام کیا۔

ممتاز حسن صاحب کی زندگی کے کس کس پہلو پر لکھوں۔ وہ اچھے دوست مشفق باپ نہایت مہربان افسر اور اعلیٰ پائے کے محقق ادیب اور شاعر تھے۔ انھوں نے اتنا لکھا ہے کہ اگر اسے سمیٹا جائے تو کئی کتابیں تیار ہوسکتی ہیں۔ لکھنے کا سلسلہ اب بھی جاری تھا اور سچ تو یہ ہے کہ لکھنے کا موقع انھیں ابھی تو ملا تھا۔

مرنے سے دو دن پہلے ممتاز صاحب نے مجھ سے ٹیلی فون پر کہا۔ ہم ایک تعلیمی ادارہ کھول رہے ہیں۔ جلد از جلد مارننگ نیوز کے دفتر میں سینٹ ڈیل اسکول کی مجلسِ انتظامیہ کا میمورنڈم پہنچادو۔ اور جس صبح میں یہ میمورنڈم بڑی مشکل سے ڈھونڈھ کر ممتاز صاحب کو پہنچانے والا تھا، اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ ممتاز صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

ممتاز حسن صاحب کے ایک داماد تو خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے صاحب زادے ہیں۔ اور دُوسرے مشہور ماہر امراضِ قلب ڈاکٹر شفقت ہیں۔ ڈاکٹر شفقت کو قدرت نے یہ موقع بھی نہیں دیا کہ وہ اپنے چاہنے والے اس بزرگ کو دل کی بیماری سے بچا لیتے۔

ممتاز حسن صاحب جتنے بڑے آدمی تھے اس کا انھوں نے کبھی اظہار نہیں کیا۔ وہ نواب زادہ لیاقت علی خان کے رفیقِ کار تھے۔ جب ملک تقسیم ہُوا تو واجبات اور اثاثوں کی کمیٹی کی تقسیم کے چیئرمین ممتاز حسن صاحب مقرر ہوئے۔ ان کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ ہر ملک کے دانش وروں سے اُن کے تعلقات تھے۔

وہ اکیسویں صدی کے سُورج کی کرن دیکھنا چاہتے تھے لیکن قدرت نے انھیں یہ موقع نہیں دیا۔ وہ ہر صوبے سے محبت رکھتے تھے اور ہر صوبے کی زبان سیکھنے کی کوشش کرتے۔ جب تاجی میاں کی اہلیہ آتیں جو پٹھان ہیں تو ممتاز صاحب ان سے دو چار باتیں پشتو میں کر لیا کرتے تھے۔ پوتی انھیں بہت پیاری تھیں اور ابھی انھیں ممتاز صاحب کے سہارے کی ضرورت بھی تھی۔ ماں گئی تو باپ بھی رخصت ہوئے۔ ممتاز صاحب وہ پہلے بڑے آدمی تھے کہ جن کے مرنے پر میں نے چپراسیوں اور بے شمار غریب مردوں اور عورتوں کو بھی روتے دیکھا ہے۔

حفیظ ہوشیار پوری

حفیظ کو میں نے سب سے پہلے اس وقت دیکھا جب وہ طالب علم تھے اور ایف سی کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج کے مشاعروں میں شرکت کرتے اور اپنا کلام سُناتے۔ اور اس وقت کے تمام اساتذہ سے داد پاتے اور میں نے اس زمانے کے اساتذہ کو ان کے بارے میں یہ کہتے سنا تھا کہ بڑے بڑے شاعروں کی اس عمر میں جس میں حفیظ ہیں یہ اُٹھان نہیں تھی۔ آگے دیکھیے۔ یہ نوجوان کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ پھر حفیظ سے مرزا بیضا خاں سروی ایرانی اور اختر شیرانی کے توسّل سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ حفیظ سب میں مل کر بھی سب سے الگ تھلگ رہتا۔ وہ فطرتاً تنہائی پسند تھا۔ پھر میری اور حفیظ کی ملاقاتوں میں کوئی پندرہ برس کا وقفہ حائل ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے حفیظ کو اس وقت دیکھا جب میں ریڈیو پاکستان کراچی میں ملازم ہوا اور حفیظ کا لاہور سے کراچی تبادلہ ہو گیا اور وہ اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر ہو کر کراچی آیا۔ اور اب جب میں نے حفیظ کو اتنی مدّت گزرنے کے بعد دیکھا تو یوں معلوم ہوا کہ جیسے وہ ڈیپ فریزر سے نکل کر آیا ہے۔ ویسے کا ویسا تھا جیسے میں نے اسے پندرہ برس پہلے دیکھا تھا۔ بلکہ یہ کہنے میں مبالغہ نہ ہو گا کہ جب وہ مرا تو اُس وقت بھی وہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ بوٹا سا قد، دُبلا پتلا، قاق کا قاق گندمی رنگ، روشن آنکھیں، داڑھی مونچھ صفاچٹ۔ بش شرٹ اور پتلون پہنتا تھا جن پر کوئی کریز نہیں ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اُس نے مٹکے میں سے نکال کر انھیں پہنا ہے۔ ہاتھ میں بریف کیس، جسے وہ بہت سنبھال کر رکھتا۔ اس میں کچھ بکھرے ہوئے کاغذ اور کچھ مسودے ہوتے اور ایک آدھ تذکرہ بھی ہوتا۔ جب اور جہاں موقع ملتا کوئی کتاب نکال کر پڑھنے لگتا۔ لکھتا تو یوں لگتا کہ جیسے وہ اپنے قلم کو کاغذ میں گاڑھ کر اس پر اُلٹا کھڑا ہو جائے گا۔ حروف موٹے موٹے، کھلے کھلے اور الگ الگ ہوتے۔ لنچ کے وقت کینٹین سے ایک ٹوسٹ منگاتا اور انڈے کے آملیٹ سے اس طرح کھاتا کہ جیسے کھا نہیں رہا بلکہ کھانے کے نام سے خانہ پُری کر رہا ہے۔

حفیظ اپنے ماتحتوں کے عیب پکڑتا۔ تعریف کرنا تو وہ جانتا ہی نہ تھا۔ خوشامد اور خوشامدیوں سے دُور رہتا۔ اچھی غزل یا اچھے شعر پر داد دیتا اور بُرے شعر پر ناک سکیڑ لیتا جیسے اُسے شعر میں سے بُو آ رہی ہے۔

جب بھی وقت ملتا تو کتابیں بیچنے والے کباڑیوں کی دکانوں پر پہنچ جاتا۔ اُسے دیکھتے ہی کباڑی سنبھل کر بیٹھ جاتے۔ پُرانی کتابوں کے معاملے میں یہ کباڑیوں کو نیچا دے جاتا۔ اِدھر اُدھر کی کتابوں کا سودا کرتا اور جو کتاب خریدنا مقصود ہوتی اُسے دو تین بار دیکھ کر چھوڑ دیتا اور آخر میں اسی کتاب کے دام پوچھتا۔ دکان دار کم قیمت بتاتا اور وہ یہ کتاب خرید لیتا۔ اور کباڑی اُس کا مُنہ دیکھتا رہ جاتا۔ پُرانی کتابوں کے کباڑیوں کے یہاں اس کے ساتھ اکثر پیر حسام الدین راشدی، قاضی احمد میاں اختر، اور ممتاز حسن بھی آیا جایا کرتے تھے اور وہ اپنے مطلب کی کتابیں ڈھونڈھ نکالتے، اور پھر ان کا سودا حفیظ سے کرواتے۔ حفیظ کی نظر میں شہر کے سارے کباڑی تھے۔ کچھ کباڑی ایسے بھی تھے جہاں وہ کسی کو اپنے ساتھ نہیں لے جایا کرتا تھا۔ مجھے بھی حفیظ کے ساتھ ان دکانوں پر جانے کا اتفاق ہُوا۔ وہ دو دو چار چار گھنٹے تک ان پُرانی کتابوں میں ایسا کھو جاتا کہ خود بھی اُنھیں میں سے معلوم ہوتا۔ گھر آتا تو گَرد میں اَٹا ہُوا۔ نہ جانے کتنے کتابوں کے جراثیم وہ اپنے ساتھ لے آتا۔ اور جس مرض میں حفیظ کا انتقال ہُوا، مَیں تو یہی کہوں گا کہ وہ انھیں کتابی کیڑوں سے پیدا ہُوا ہوگا۔

حفیظ بڑا دُکھی انسان تھا۔ دُکھ اُس کے اپنے نہیں تھے، پوری انسانیت اور پوری کائنات کے تھے۔ اتنی مُدت جو وہ جی لیا تو سمجھو بہت ہی جی لیا۔ وہ ہنستا بھی تھا اور ہنساتا بھی تھا لیکن اوپر کے دِل سے۔ غزل کہتا تو اپنے قدوقامت ایسی چھوٹی بحریں۔ آسان لفظ لیکن اُونچا خیال۔ کئی رنگ، اور باتیں دِل میں اُتر جانے والی۔ وہ تاریخ نکالنے میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ آپ کے مُنہ سے مصرع نکلا اور اس نے حروف جوڑ کر بتایا کہ اس مصرع سے فلاں سال نکلتا ہے۔ قاضی احمد میاں اختر نے اپنے بیٹے کے بارے میں کہا کہ یہ پیدائشی مجنون ہے۔ حفیظ نے قلم اٹھایا اور کاغذ پر یہ لکھ دیا" قاضی صاحب کے پسرِ مجنون"۔ اور تاریخ نکل آئی۔

قاضی صاحب کے مکان پر ہم سب جمعہ کے دن جمع ہُوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے کہا کہ اگلے جمعے میرے یہاں کھانا کھایئے۔ میری بیوی برابر تقاضے کر رہی ہے۔ حفیظ نے قلم اُٹھایا اور ایک کاغذ پر یہ لکھ دیا۔" بیوی کے تقاضے"۔ اور سال وہ تاریخ نکل آیا۔

طالب علمی کے زمانے ہی میں حفیظ شعر کہنے لگا تھا۔ وہ اپنے ہم عمر شاعروں سے اچھے شعر کہتا۔ بلکہ اس زمانے کے اساتذہ اور چوٹی کے شعرا کی بھی ہمسری کرتا۔

آج سے تقریباً چالیس برس اُدھر کی بات ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔ صدر اس مشاعرے کے سیّد احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم تھے۔ شعرا میں نشتر جالندھری، احسان دانش، مرزا بیضا خان مروی ایرانی، صوفی تبسم، ڈاکٹر تاثیر اور نوعمروں میں سراج الدین ظفر تھے اور احمد ندیم قاسمی ایک طالب علم اسی کالج کا نوعمر، سر کے بال سفید، دُبلا پتلا، گندمی رنگ، بڑی بڑی روشن آنکھیں،

بوٹا سا قد، اپنے قد ہی کی برابر کی بحر میں ایک غزل سُنا کر اور مشاعرہ لُوٹ کر چلا گیا۔ یہ عمر اور ایسے بانکے، سُتھرے اور البیلے اشعار۔ یہ عمر اور یہ مذاق۔ ایسی سنجیدگی، ایسی پختگی اور خیالات میں ایسی گہرائی۔ آپ بھی اس نوجوان شاعر کی یہ غزل سُنیے :

کوئی ستم آشنا نہیں ہے — جینے کا کوئی مزا نہیں ہے

بے لطف ہے اپنی زندگانی — اب ہم سے کوئی خفا نہیں ہے

ہر قلب غم آشنا ہے لیکن — ہر غم غم آشنا نہیں ہے

اُمیدِ وفا پہ جینے والو! — اُمیدِ وفا، وفا نہیں ہے

ملتے نہیں کیوں حفیظ سے آپ — ایسا تو وہ بُرا نہیں ہے

جب حفیظ ہوشیارپوری اپنی غزل سُنا چکے تو صدرِ مشاعرہ پطرس بخاری نے یوں داد دی :

انگل بھر کی زباں اور یہ گُل کاریاں

اس پر ایک سردار جی نے آواز لگائی :

گنڈیریاں ہی گنڈیریاں

جب حفیظ کی اس غزل کا چرچا ہوا تو ایک صاحب حفیظ کی تلاش میں حفیظ کے ہوسٹل کے کمرے پر پہنچے اور انھوں نے دروازے پر دستک دی۔ یہ ایک لمبے قد کے منحنی سے آدمی تھے۔ میلے کچیلے کپڑے۔ بس اسی میلے پن سے وہ لاکھوں میں پہچانے جاتے تھے۔ یہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بھائی مرزا فہیم بیگ چغتائی تھے۔ بچّوں کے لیے انھوں نے بہت سا نثری و شعری سرمایہ چھوڑا ہے۔ غزل کے شاعر تھے۔ بہت کم شعر کہتے۔ لیکن جو کہتے، خوب کہتے۔ مجھے اس وقت ان کا ایک مصرع یاد آگیا۔ ذرا تیور ملاحظہ فرمائیے۔

تو کیا ارادہ ہے مَر کر دکھا دیا جائے؟

غرض فہیم بیگ چغتائی نے حفیظ کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ لڑکے چل میرے ساتھ۔ حفیظ بھی چل کھڑے ہوئے۔ مرزا صاحب چنگڑ محلے میں رہتے تھے۔ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ اُن کی رہائش ایک کوٹھری میں تھی، اور کوٹھری بھی ایسی جیسے خود مرزا صاحب۔ مکڑیوں کے جالے ہر طرف تنے ہوئے۔ زمین پر ایک بوریا بچھا ہوا۔ کونے میں ایک کھاٹ۔ ایک طرف مٹکا، مٹکے کے اُوپر مٹی کا ایک پیالہ جس پر کائی جمی ہوئی تھی۔ مرزا صاحب حفیظ صاحب کو اس کمرے میں بند کر کے اور باہر سے تالا ڈال کر چل دیے۔ حفیظ حیران کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ شام کو مرزا صاحب تشریف لائے، دروازہ کھولا۔ نہ مزاج پوچھا نہ معافی مانگی۔ تھانے دار کی طرح حفیظ کا ہاتھ پکڑ کر کہا :

"صاحب زادے! سچ سچ بتاؤ کہ وہ غزل جو تم نے گورنمنٹ کالج کے مشاعرے میں پڑھی تھی

کس سے لکھوائی تھی ؟" حفیظ نے کہا "یہ غزل میں نے کہی تھی۔" مرزا صاحب نے کہا "لیکن لکھی کس نے تھی ؟" حفیظ نے کہا "میں غزل کہتا ہوں۔ لکھتا نہیں ہوں۔" حفیظ کا پیاس کے مارے برا حال تھا اس نے مٹکے سے پیالے میں پانی نکالا۔ کچھ پیا، کچھ بہہ گیا۔ حفیظ نے فی البدیہہ یہ شعر کہا :

پیاس میں مہماں وہ تم نے دعا کی تو نے اے ساقی
کہ موج بوریا بھی موج دریا ہوتی جاتی ہے

مرزا صاحب کا منھ کھلا کا کھلا اور ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انھوں نے حفیظ کا ہاتھ پکڑ کر کہا "کیوں میاں لڑکے! تم یہ جانتے ہو کہ موج بوریا کسے کہتے ہیں ؟"

حفیظ نے کہا۔ "اس لکیر کو جو بوریے پر پڑی ہوتی ہے۔" مرزا صاحب نے حفیظ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا۔ "یہ غزل واقعی تم نے کہی ہوگی۔" پوچھا۔ "تمھارے ساتھ اور کون سے شاعر طالب علم پڑھتے ہیں ؟" حفیظ نے ڈاکٹر یاور عباس یاور دھلوی اور سراج الدین ظفر کے نام بتائے۔

مرزا صاحب نے کہا۔ "تم ظفر کو اچھی طرح جانتے ہو ؟" کہا۔ "خوب جانتا ہوں۔"

فرمایا۔ "اب جو تمھاری اس سے ملاقات ہو تو اسے میرا یہ شعر سنا دینا :

کبھی جن راہوں میں اے بے وفا تو ساتھ ہوتا تھا
ترا دیوانہ اب ان راہوں سے تنہا گزرتا ہے

حفیظ اچھے شاعر تو تھے ہی، نثر بھی خوب لکھتے تھے۔ ان کے کتب خانے میں بے شمار کتابیں تھیں قلمی نسخے بھی اور ایسی کتابیں بھی تھیں جو اب نایاب ہیں۔ وہ محقق تھے۔ تاریخ نکالنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ کوئی فی البدیہہ شعر کہتا ہے اور یہ فی البدیہہ تاریخ نکالتے تھے۔ میرا اور حفیظ کا ساتھ بیس پچیس برس رہا ہے۔ وہ بڑے منکسر المزاج انسان تھے تصنع ان میں نام کو نہ تھا۔ ریڈیو پاکستان سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ ایک ایسے مرض میں مبتلا ہوئے جو بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس مرض کی تشخیص کے سلسلے میں انھوں نے ہسپتال میں رہ کر بے شمار کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جب بھی ان سے ہسپتال میں ملنے جاتا تو وہ مجھے اپنا مرض کاغذ پر خاکہ کھینچ کر سمجھاتے اور کہتے۔ "دیکھو کیسا عجیب مرض ہے۔ پھر یہ بھی بتاتے کہ کون کون سے لوگ کس کس ملک میں اس مرض میں مرے ہیں۔ وہ ایک مرتبہ چودھری اقبال کو اس مرض کی تاریخ سنا رہے تھے اور چونکہ چودھری صاحب ان کے بہت بے تکلف دوست تھے حفیظ سے کہنے لگے۔ "کم بخت۔ اب تو اس مرض کا تاریخ جغرافیہ چھوڑ اور قاعدے میں اپنا علاج کرا اور یہ سارا معاملہ ڈاکٹروں پر چھوڑ دے۔ مر رہا ہے لیکن اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔" جب مرض نے حفیظ پر قابو پایا اور حفیظ اپنی موت کے دن گننے لگا تو ان کا یہ عالم دیکھا نہیں جاتا تھا۔ موت سے کچھ دن پہلے حفیظ نے کہا تھا۔

اس وقت کہاں سے آ گئے تم

اس وقت میں اپنے رُو بُرو ہوں

اور جب مرنے والے کی اِس دُنیا میں چند سانسیں باقی رہ گئی ہوں تو اس حالت کی یہ کیسی اچھی تصویر ہے۔ شعر دیکھیے۔ یہ حفیظ کا آخری شعر تھا۔

ہر سُو اک غبار چھایا ہے

رہ گزر سے نشانِ منزل تک

ذوالفقار علی بخاری

(۱)

ذوالفقار علی بخاری مرحوم ہیں آن بان پرانے زمانے کے جاگیرداروں اور نوابوں کی سی تھی ریڈیو پاکستان میں ہر وقت ان کا دربار لگا رہتا۔ رات ہو یا دن، ان کے گھر پر یا کسی ہوٹل یا چائے خانے میں ان کا دربار خاص منعقد ہوتا۔ جہاں وہ اپنے نورتنوں میں بیٹھتے اور خوب خوش گپیاں ہوتیں۔ کبھی مشاعرہ ہو رہا ہے تو کبھی ریڈیو پاکستان کے اسٹوڈیوز میں کسی ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی ہے جو صبح سے شروع ہوئی اور رات گئے تک جاری رہی۔ کسی ڈرامے میں وہ ہدایت کار ہوتے تو کسی میں اداکار۔

کبھی گائیکوں اور نائکوں کو لے کر بیٹھ جاتے اور نئی نئی دھنیں بناتے۔ کبھی وہ خود گاتے اور کبھی کسی کو سُرتال بتاتے۔ گھر سے ان کا تعلق بس اتنا تھا کہ جب تھک جاتے تو گھر چلے آتے۔ وہ سارے کام ٹوٹ کر تھکنے کے لیے کرتے ممکن ہے کہ اس کی کوئی نفسیاتی وجہ ہو۔

رفیق غزنوی اور سجاد سرور نیازی کسی زمانے میں بخاری صاحب کے بڑے گہرے دوست تھے۔ رفیق ریڈیو پاکستان میں میوزک کمپوزر ہو گیا تھا۔ ایک دن بخاری صاحب جب اسٹوڈیوز سے باہر آ رہے تھے اور سیڑھیاں اُتر رہے تھے تو رفیق ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ بخاری صاحب نے اسے اس حال میں دیکھ کر پوچھا۔ "یہ تم اتنے مودب کیوں ہو گئے ہو؟" رفیق نے کہا۔ "ادب کا مقام ہے۔ حضرت امیر خسرو تشریف لا رہے ہیں۔"

سچی بات تو یہ ہے کہ جب بخاری صاحب زندہ تھے تو ریڈیو پاکستان شاعروں، ادیبوں، موسیقاروں اور آرٹسٹوں کی آماجگاہ تھا۔ بخاری کا دربار فنونِ لطیفہ کے کسی قدردان شہنشاہ کے دربار سے کم نہ تھا اور جب بخاری صاحب نہ رہے تو ریڈیو پاکستان کا ہی نہیں، اس نوعیت کے تمام تخلیقی اداروں کا سہاگ اُجڑ گیا۔

بخاری شاعر بھی تھے اور اچھے شاعر تھے۔ وہ شاعری کے تمام رموز و نکات سے واقف

تھے۔ اُنھوں نے اورینٹل کالج لاہور میں تعلیم پائی اور اولاد حسین شاداں جیسے اساتذہ کے وہ شاگرد رشید تھے۔ بخاری صاحب نے مجھے بتایا کہ جب انھوں نے شاعری شروع کی تو دیوانِ داغ کی تمام غزلوں پر غزلیں کہیں اور وہ اس طرح کہ مصرع اوّلی پر میں چیپی لگاتا اور ہر مصرع ثانی پہ مصرع کہتا۔

ریڈیو میں آنے سے پہلے بخاری نوٹنکیوں اور تھیٹروں میں بھی کام کر چکے تھے۔ بخاری بذلہ سنج اور چٹکلے باز بھی تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے برصغیر کے مایۂ ناز خوش نویس بھائی یوسف مرحوم سے جو نہایت میلے کچیلے رہتے تھے، کہا:

"بھائی یوسف! آج اللہ کا نام لے کر نہا ڈالو اور سارا میل کچیل اتار پھینکو۔ اللہ پھیر دے دے گا۔"

بخاری صاحب میں جلال بھی تھا اور جمال بھی۔ وہ کسی کو دکھ درد میں دیکھتے تو ان کا دل بھر آتا اور وہ اس طرح اس کی مدد کرتے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی اور اگر کسی سے بگڑتے تو ایسا بگڑتے کہ اللہ کی پناہ۔ لیکن جہاں تک ممکن ہوتا اسے نقصان نہ پہنچاتے۔ وہ یوپی والوں کے لب و لہجے کا مذاق اڑاتے۔ لیکن جتنے شاعر اور ادیب یوپی سے آتے، اُن میں سے بہتوں کو بخاری نے کام دھندے سے لگا دیا۔ اور وہ ان کی قدر بھی کرتے اور احترام بھی کرتے۔

ایک مرتبہ وہ کسی بات پر ارّم لکھنوی سے خفا ہو گئے۔ ایک دن جب بخاری صاحب ریڈیو پاکستان آئے تو ارّم لکھنوی نے انھیں سلام کیا لیکن بخاری منھ پھیر کر چلے گئے۔ رات کو ریڈیو پاکستان میں مشاعرہ تھا۔ جب ارّم نے اپنی غزل میں یہ شعر پڑھا ؎

یوں وہ گزرے نظر چرائے ہوئے
ہم لیے رہ گئے سلام اپنا

تو مشاعرہ ختم ہونے کے بعد بخاری نے ارّم کو گلے لگایا اور ان سے معافی مانگی۔

اور جب بخاری ملازمت سے سبک دوش ہوئے تو یوں لگا کہ جیسے انھیں زندگی سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ شاعری اور موسیقی اور ڈرامے اور ریڈیو پاکستان کے اس ماحول سے انھیں نکالنا ایسا ہی تھا جیسے مچھلی کو پانی سے نکالنا۔ پھر تو یہ ہوا کہ نہ ریڈیو پاکستان میں کچھ رہا اور نہ بخاری صاحب میں کچھ رہا۔ وہ مارے مارے پھرتے اور جو دوست اور عقیدت مند ان کے بہت قریب تھے، وہی ان سے ملتے جلتے۔ ریڈیو پاکستان بھی ان سے ایک پروگرام لکھواتا۔ وہ دل کے مریض تو تھے ہی، انھیں فالج بھی ہو گیا تھا۔ ایک دن وہ ایسے گرے کہ پھر نہ اٹھ سکے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔

---

(۲)

روزنامہ "حریت" کے اجرا سے مہینوں پہلے فخر ماتری مرحوم اور ان کے رفقائے قلم "حریت" کے لیے طرح طرح کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ یہ منصوبہ بازیاں صبح نو بجے سے شروع ہوتیں۔ اور آدھی رات تک جاری رہتیں ہیں۔ جعفر منصور مرحوم اور ظریف ایک دن ماتری صاحب کے کمرے میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے کہ بخاری صاحب کا ذکر آگیا۔ ماتری صاحب نے کہا: "میرے دل میں بخاری صاحب کا بڑا احترام ہے۔ میری طالب علمی کے زمانے میں بمبئی میں بخاری کا بڑا شہرہ تھا۔ میں نے بخاری کو مشاعرے لوٹتے دیکھا ہے۔ بمبئی کی ادبی محفلوں میں وہ چھایا رہتا تھا۔ ضلع جگت اور حاضر جوابی میں اُس کا جواب نہ تھا۔ اور اب جب وہ ریٹائر ہو گیا ہے تو ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اُسے تنہائی نہ محسوس کرنے دیں اور اسے اُس کے کاموں کے ساتھ آگے بڑھائیں۔ اُس نے دُنیا دیکھی ہے۔ بڑے بڑے علمی و ادبی معرکے سَر کیے ہیں۔ دُنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں سے اُس کی ملاقات رہی ہے۔ اس میں اچھائیاں ہیں تو ایسی کہ جن کا جواب نہیں، اور اس میں جو انسانی کمزوریاں ہیں، وہ بھی بے مثال ہیں۔ اگر بخاری قلم کے ذریعے پورے خلوص کے ساتھ اپنی زندگی کا تجزیہ پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا، تو یہ "حریت" کی بڑی کامیابی ہوگی۔"

ماتری صاحب نے مجھ سے کہا کہ "چوں کہ ہم لوگوں سے زیادہ تم بخاری کے قریب رہے ہو، اس لیے تم ان سے یہ درخواست کرو کہ وہ روزنامہ "حریت" کے لیے قسط وار اپنی سرگزشت لکھنا شروع کر دیں۔" ماتری صاحب نے اپنا ایک دستخط شدہ سادہ چیک دیا اور کہا۔ "یہ بخاری کو دے دینا۔ اس پر وہ جتنی رقم جس حساب سے چاہیں، مہینے بھر یا سال بھر کی بطور معاوضہ لکھ کر وصول کر لیں۔" چناں چہ میں ماتری صاحب کا یہ سادہ دستخط شدہ چیک لے کر بخاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ روزنامہ "حریت" کے اجرا کا ذکر آیا۔ اور پھر میں نے ماتری صاحب کی خواہش اور فرمائش کا اظہار کیا اور ماتری صاحب کا سادہ دستخط شدہ چیک ان کی خدمت میں پیش کیا۔ بخاری صاحب نے کہا۔ "رقم کی ذمہ داری ماتری نے مجھ پر کیوں ڈالی ہے؟" میں نے عرض کیا کہ ماتری صاحب آپ کا بہت احترام کرتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ آپ سے کسی قسم کی سودے بازی کریں۔ لہٰذا آپ جو رقم مناسب سمجھتے ہیں اس سادے چیک پر لکھ لیں، وہ ماتری صاحب کو قبول ہوگی۔" بخاری صاحب نے چیک لینے اور چیک پر رقم لکھنے سے انکار کیا۔ میں نے عرض کیا کہ "خیر رقم اور معاوضے کی بات تو آپ ماتری صاحب سے طے کر لیں۔ البتہ سرگزشت لکھنا شروع کر دیں اور یہ بتا دیں کہ اس سرگزشت کی پہلی قسط آپ کب بھجوائیں گے؟"

بخاری صاحب سے ماثری مرحوم کا سادہ دستخط شدہ چیک لے کر واپس آیا اور سارا قصہ ماثری صاحب کو سنایا تو وہ مسکرا دیے اور انھوں نے چیک رکھ لیا اور پھر کئی ہفتے گزر گئے۔

"حریت" کے اجرا سے کچھ دن پہلے بخاری مرحوم سے ماثری صاحب کی ٹیلی فون پر بات چیت ہوئی اور ماثری صاحب نے بتایا کہ بخاری صاحب شیزان ہوٹل میں میرے ساتھ چائے پینا چاہتے ہیں۔ میں ماثری صاحب کے ساتھ شیزان ہوٹل تک گیا۔ ہوٹل میں ماثری اور بخاری صاحبان میں کیا بات چیت ہوئی اس کا مجھے علم نہیں۔ البتہ ملاقات کے دوسرے دن ماثری صاحب سے معلوم ہوا کہ بخاری صاحب اپنی سرگزشت لکھنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور انھوں نے مجھے اپنے گھر بلایا ہے۔ دوسرے دن میں بخاری صاحب کے گھر پہنچا مگر میں سرگزشت کے بارے میں ان سے بات کیا کرتا اور انھیں کیا مشورہ دیتا میں ان کا نیاز مند تھا اور ہم ریڈیو والوں کے لیے باپ کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ کبھی ہماری باتیں سن لیتے اور کبھی ڈانٹ دیتے۔ میں نے دبے دبے الفاظ میں انھیں یہ مشورہ دیا کہ افسانہ طرازی سے احتراز کریں اور اپنی خداداد جادو بیانی سے حقیقت پر پردے نہ ڈالیں۔ جیسے اور جس طرح ان کی زندگی گزری ہے، بس وعن اسی طرح لکھتے چلے جائیں۔ خلوص اور سچائی کا اثر لفاظی سے زیادہ ہوتا ہے۔

چنانچہ "حریت" کے پہلے شمارے میں بخاری مرحوم کی سرگزشت کی پہلی قسط شائع ہوئی — سرگزشتِ بخاری کی پہلی قسط کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"یوں تو مثل مشہور ہے کہ سانچ کو آنچ نہیں لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ سچ بولو تو سننے والے کے آگ لگ جاتی ہے یہی باعث ہے کہ میں نے آج تک اپنا روزنامچہ لکھنے سے گریز کیا۔ چپ سادھے رکھی اور اگر کبھی بہ امر مجبوری بولنا بھی پڑا تو ایسے الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جن کو سن کر سننے والا تھوڑا بہت دھواں دے جائے تو دے جائے مگر اس کے تن بدن میں آگ نہ لگنے پائے۔"

"آپ میرے رویے کو جو چاہیں نام دے لیں لیکن میں کیا کروں، بندگی بے چارگی۔ میرا معاملہ مرتا کیا نہ کرتا والا تھا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب تو الحمد للہ جی حضوری کر کے روٹی کمانے کی عمر تمام ہوئی۔ جوانی کا طوفان گزر گیا۔ حصولِ دولت کی خاطر دل پکڑے گلی گلی اور کوچے کوچے پھرنے کا زمانہ بیت گیا۔ اب میں آزاد ہوں۔ دنیا و مافیہا سے آزاد۔ اب مجھے سچ بولنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ چاہے وہ سچ اپنے متعلق ہو یا دوسروں کے متعلق۔"

اب ہم بخاری صاحب سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ سچ بولنے کا اعلان کریں گے لیکن آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"اس راہ میں بھی دو چار مقام بہت سخت آتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ اپنے متعلق سچ بولوں تو ان لوگوں پر کیا بیتے گی جو اپنی محبت، اپنے خلوص اور اپنی شفقت کے سبب خدا جانے

مجھے کیا سمجھتے رہے ہیں، اور اگر دوسروں کے متعلق سچ لکھوں تو کیا گناہوں کے اس پشتارے میں اضافہ نہیں ہو جائے گا جو اپنے کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہوں۔ جان عجب ضیق میں ہے۔ ڈھونگ رچائے رکھوں تو ضمیر کی ملامت سنوں۔ سچ بولوں تو دل آزاری کا مجرم گردانا جاؤں۔ بہتر یہی ہے کہ زندگی کے چند واقعات بیان کردوں اور وہ بھی اس انداز سے کہ اپنا بھرم کھلتا ہے تو کھلے لیکن کسی کی دل آزاری نہ ہو۔"

خیر بخاری صاحب کی یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ وہ کسی کی دل آزاری (کم سے کم تحریر میں) نہیں کر سکتے جس زمانے سے وہ تعلق رکھتے تھے، اس طرح کا رویہ اُس زمانے کے آداب و روایات کے منافی بھی تھا۔ لیکن وہ اپنا بھرم بھی نہ کھول پائے اور اس کتاب میں جسے انھوں نے اپنی سرگزشت کے نام سے لکھا اور چھاپا ہے، یہی سب سے بڑی کمی ہے۔ ورنہ زبان و بیان کی خوبی کے اعتبار سے اس سرگزشت کا شمار آج نہیں تو کل ادبِ عالیہ میں ہو گا۔

سرگزشت بخاری کی تقریظ میں عزیزم انقلاب ماتری نے میرا بھی ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے:

" خان صاحب کی زبان میں خدا جانے کیا جادو تھا۔ یا والد مرحوم کے نام میں کیا طلسم تھا کہ بخاری صاحب "حریت" میں مضمون لکھنے پر آمادہ ہو گئے مگر ساتھ ہی یہ پخ لگا دی کہ موضوع کا انتخاب ماتری صاحب کریں۔"

بخاری صاحب جب رواں ہوئے تو کیسا موضوع اور کس کا مشورہ اور کہاں کی پابندی۔ لکھتے چلے گئے۔ غرض کہ وہ ڈھائی برس تک لکھتے رہے۔ شروع شروع میں ضیا الحسن موسوی میگزین سیکشن میں بخاری صاحب کے مضمون چھاپتے رہے اور ان سے عربی زبان کے الفاظ پر بخاری صاحب مشورہ بھی کرتے رہے۔ پھر لے، آئے ممتاز کے ذمے اس مضمون کو بنانے اور سجانے کا کام ڈالا گیا۔ بخاری صاحب کے مضمون کے ساتھ ساتھ اس سے متعلق نایاب و نادر تصویریں بھی شائع ہوتی رہیں۔ افسوس ہے کہ سرگزشتِ بخاری جب کتاب کی صورت میں شائع ہوئی تو اس میں یہ تصویریں شامل نہیں کی گئیں۔ ہر تصویر بجائے خود ایک مضمون کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان سے کتاب کی مقبولیت میں یقیناً اضافہ ہو جاتا۔

بکھرے ہوئے اور کبھی بپھرے ہوئے رواں دواں بخاری پر پل باندھنا یا اسے سمیٹنا بڑا مشکل کام تھا۔ بخاری کی شخصیت ایسی نہیں تھی جو ایک کتاب میں اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ سمٹ آتی۔ سچ تو یہ ہے کہ "سرگزشتِ بخاری" بخاری کی زندگی کا خلاصہ ہے جس میں عمل کی رفتار دھیمی ہے اور گفتار کی رفتار تیز ہے۔ پھر اس میں پھول ہی پھول ہیں، کانٹے نہیں ہیں۔

بخاری آواز کے صحرا کا دیوانہ تھا۔ اس کی آواز میں حسن تھا، رعنائی تھی۔ یہ آواز اس شخص کی

زندگی کی روشنی بھی تھی جو چالیس برس تک برصغیر کے ریگ زاروں اور لالہ زاروں میں کبھی نغمے کے روپ میں کبھی تمثیل کے رنگ میں کبھی مرثیے کے گداز میں، کبھی کھیتوں اور کھلیانوں میں اور کبھی دیوان خانوں میں اور کبھی سوموج کی روشنی کی طرح بستیوں، ویرانوں، جھگیوں اور ایوانوں میں ایک ساتھ پہنچ کر زندگی سے ترسی ہوئی خدا کی مخلوق کے دلوں کو گرماتی اور برماتی رہی۔ بخاری جو پہلے آل انڈیا ریڈیو تھا، تقسیم کے بعد ریڈیو پاکستان ہوگیا۔ اس کا قد و قامت دونوں ملکوں کے ٹرانس میٹروں سے اونچا تھا۔ یہ ٹرانسمیٹر تو اس کے ہاتھ چھڑی اور اس کا ٹیکا تھے۔ بخاری ایک ہمیشہ زندہ رہنے والی آواز تھا جو برقی لہروں میں سدا گونجتی رہے گی۔ البتہ وہ بخاری جو مر گیا ہے، وہ بخاری کی آواز کا ٹرانسمیٹر تھا۔ وہ ٹرانسمیٹر مر گیا۔ اب بخاری کی آواز کسی ٹرانسمیٹر کی پابند نہیں ہے۔ اس کی موت نے اسے زندہ تر بنا دیا ہے۔ بخاری آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان کی روایات کا سرچشمہ تھا۔ یہ روایات ہمیشہ زندہ رہیں گی اور ان روایات میں بخاری بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔ بخاری نے بے شمار شخصیتیں بنائی ہیں۔ بخاری کے نشریاتی مکتب سے جو لوگ فارغ ہوئے ہیں وہ اس کے نام کو اور اس کے کاموں کو زندہ و پائندہ رکھیں گے۔

بخاری اپنے ساتھ اپنی قبر میں اپنی زندگی کے بہت سے راز لے گیا ہے۔ میں نے بخاری کی زندگی میں ایک مضمون میں یہ لکھا تھا کہ بخاری کے سر پر جو بال سوالیہ فقروں کی طرح کھڑے ہوتے ہیں، وہ ہم سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ یار دیکھ تو کہو کہ آخر یہ بخاری کیا ہے؟ بخاری ان سوالوں کا جواب خود نہ دے سکا۔ اس کی شخصیت بھی ان سوالوں پر کشمکش ہوتی رہی۔ وہ اپنے آپ سے جنگ کرتا رہا۔ ایک طرف اس کا بڑا بھائی تھا جو اپنے چھوٹے بھائی کے لیے ایک چیلنج بنا ہوا تھا۔ چھوٹے بخاری نے بہت محنت کی۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ کبھی شاعری میں منہ مارا۔ کبھی موسیقی کے سمندر میں غوطے لگائے۔ کبھی اسٹیج اور ریڈیو ڈراموں میں ہنگامے بپا کیے۔ کبھی مرثیہ پڑھنے کے فن میں کمال پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ کبھی جمعہ خان جمعہ کے نام سے اس نے مزاحیہ مضمون لکھے اور پڑھے۔

غرض وہ زندگی بھر ہر میدان میں مسلسل جدوجہد کرتا رہا۔ کیا وہ اپنے بھائی سے زیادہ ذہین تھا؟ کیا ضلع جگت اور حاضر جوابی میں زیادہ مشاق تھا؟ بڑے بھائی نے اعلیٰ تعلیم پائی۔ ڈگریاں حاصل کیں۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا، اس کے باوجود کیا چھوٹے بھائی کا قد و قامت بڑے بھائی سے بڑا، برابر یا چھوٹا نکلا؟ یہ جواب مستقبل ہی دے سکے گا۔ بخاری کا ماضی بھی ہمارے سامنے ہے اور اس کا حال بھی۔ بخاری کی کہی ہوئی باتیں اس کی سرگزشت میں موجود ہیں البتہ جب تک بخاری کی ان کہی یا بخاری کے بارے میں "ان کہی" باتوں کا کھوج نہیں ملے گا، بخاری کی داستان نامکمل رہے گی۔

سیّد محمد جعفری

سیّد محمد علی جعفری مرحوم لاہور کی مشہور و معروف شخصیت تھے۔ وہ اپنے بیٹے سید محمد جعفری کی طرح شگفتہ مزاج تھے پچھلے زمانے کی باتیں اس طرح سناتے کہ ماضی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ یہ ۱۹۱۰ء سے 1915ء تک اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے اور کچھ برس پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ خضاں منزل میں نواب صاحب کے چوک میں ڈپٹی محمد حسین صاحب کے یہاں ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اور پھر میں سید محمد جعفری کے ساتھ ان کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوا۔

سیّد صاحب خوش مزاج بھی تھے اور خوش خوراک بھی۔ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہمیشہ پیدل چلتے۔ بڑھاپے میں بھی میلوں نکل جاتے اور تکان محسوس نہ کرتے سیکڑوں لوگ ان کے پاس سفارش لے کر آتے۔ وہ سفارش اس طرح کرتے کہ جیسے یہ کام انھی کا ہے۔ خدا بخشے سالک صاحب کا بھی یہی طریقہ تھا۔ وہ بھی بڑے دردمند انسان تھے۔ اگر کسی کو دُکھ میں دیکھتے تو اُن کے آنسو نکل آتے۔ اگر کوئی سفارش کرانے آتا تو پہلے تو اسے سفارشی خط دیتے، اگر اس سے کام نہ چلتا تو اپنے سارے کام چھوڑ کر اس کے ساتھ چلے جاتے۔ تانگے کا کرایہ بھی خود دیتے۔ ایک مرتبہ میں سالک صاحب کی تلاش میں ان کے دفتر پہنچا۔ میں نے مہر صاحب سے پوچھا کہ وہ کہاں ہیں تو مہر صاحب نے کہا کہ اگر وہ دفتر میں نہ ہوں تو سمجھ لو کہ وہ کسی کی سفارش کرنے کی مہم پر نکلے ہیں۔

ہاں تو بات بابا محمد علی کے صاحب زادے سید محمد جعفری کی ہو رہی تھی۔ اگر میں یہ لکھوں تو بے جا نہ ہوگا کہ سید محمد جعفری مرحوم اپنی وضع قطع اور ڈھب کے ایک ہی آدمی تھے افسوس کہ وہ سارے سانچے ٹوٹ گئے جن میں ایسے انسان ڈھل کر نکلا کرتے تھے۔ سید محمد جعفری میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بڑے زندہ دل انسان تھے۔ اپنی شاعری اور تحریروں اور باتوں سے لوگوں کو ہنساتے تھے۔ اور اس طرح ہنساتے تھے کہ دل کے اندر ہنسی کا فوارہ چھوٹنے لگتا اور جس سے

اندر کے سارے جالے ٹوٹ کر بکھر جاتے اور روح کے اندر دکھوں کی جو تاریکیاں ہوتیں، وہ ساری چھٹ جاتیں اور روح منور ہو جاتی آدمی کا گرد و پیش بھی منور ہو جاتا۔ اور یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ہنسی ہنسی میں اپنی زندگی کی ساری تلخیاں پی جاتے ہیں۔ اور اس طرح کے مزاح لکھنے والوں میں جو بھی آتا ہے تو میں یہ کہتا ہوں کو دیکھو یہ پھلجھڑی کب تک چھوٹتی ہے۔

سید محمد میں جس طرح بے پناہ خلوص اور پیار تھا اسی طرح یہ اُن کی شاعری میں بھی تھا۔ سید محمد سے میری پہلی ملاقات مولانا محمود شیرانی کے یہاں ہوئی۔ یہ اختر شیرانی کے ہم جماعت اور دوست تھے اور مولانا کے شاگردِ رشید تھے۔ اور یہ اس زمانے میں مولانا کی تصانیف کی ترتیب و تدوین میں ان کی مدد کر رہے تھے۔ ایک دن مولانا نے سید محمد کو، جو اختر کے کمرے میں داخل ہو رہے تھے، آواز دی اور کہا:

"سید محمد! تمھارے دوست (اختر شیرانی) نے ہمیں بہت بدنام کیا ہے۔ پچھلے دنوں مَیں دکن گیا تھا تو وہاں ایک صاحب نے مجھ سے کہا۔ مولانا آپ کا یہ گیت مجھے بہت پسند آیا۔ مَیں نے کہا۔ کون سا گیت؟ تو فرمایا کہ "بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں" مَیں نے کہا، وہ گیت میرا نہیں، میرے نالائق لڑکے کا ہے۔

لڑکیوں میں بدنام وہ ہو رہا ہے اور رُسوا ہم ہو رہے ہیں۔"

سید محمد نے یہ بات سن کر بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی۔

اختر کے کمرے میں ہنگامہ رہتا۔ میراجی کا زیادہ وقت یہیں گزرتا تھا۔ ایک دن یہ دیکھا کہ میراجی اور اختر دونوں شراب میں دُھت ہیں اور گلے مل مل کر رو رہے ہیں۔ پوچھا: "آپ دونوں آخر کس لیے رو رہے ہیں؟" تو اختر نے کہا کہ "اسے تو اپنی ماں یاد آ رہی ہے اور مجھے ابا نے شراب پینے پر ڈانٹا تھا تو اسے روتا دیکھ کر مجھے بھی اپنی والدہ یاد آ گئیں"

سید محمد جعفری دوسروں ہی سے مذاق نہیں کرتے تھے وہ اپنے ساتھ بھی اچھا خاصا مذاق کرتے رہے ہیں۔ پہلے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ پھر اورینٹل کالج میں منشی فاضل کی جماعت میں داخلہ لیا۔ یہاں ذوالفقار علی بخاری بھی ان کے ہم جماعت تھے۔ پھر انگریزی، فارسی اور تاریخ میں ایم اے کیا۔ اور اس کے بعد بی ٹی کر کے رنگ محل اسکول میں ماسٹر ہو گئے۔ یہاں یہ اسکاؤٹ ماسٹر بھی رہے۔ اور پھر ماسٹری چھوڑ چھاڑ کر مرکزی محکمہ اطلاعات میں انفارمیشن آفیسر ہو گئے۔ یہاں سرکار کی ملازمت بھی کرتے اور اپنی مخصوص مزاحیہ شاعری میں سرکار کا بھلا بھی اڑاتے رہے۔

سید محمد جعفری کی شاعری اُن کی شخصیت سے مخصوص اور اُن کی ذات تک محدود رہی ہے۔ اُن

کی طنزیہ شاعری میں جھلاہٹ نہیں ہے۔ ان کا لہجہ بہت سُبک اور نرم ہے۔ سیّد محمد جعفری کے چند اشعار پڑھیے:

کتنا اچھا فیصلہ کرتا رہا کشمیر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

"آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
کبھی رکھتے ہی نہیں اور کبھی رکھتے ہیں

جو مولوی ہیں وہ کھاتے ہیں رات دن حلوہ
بہار ہو کہ خزاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

جب وفد بنا کر چودھریوں کا لے جاتا ہے لبیارا
کچھ اس میں افسر جاتے ہیں کچھ بیوپاری کچھ ناکارا
اک سیمپل انھیں دے دیتا ہے یہ ملک ہمارا بےچارا
ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

سیّد محمد اپنے بچّوں سے بھی مذاق کرنے سے باز نہیں آتے۔ جب کسی خوب صورت لڑکی کو دیکھتے تو اپنے نوعمر صاحب زادے سے کہتے۔ "دیکھو یار کتنی اچھی لڑکی ہے۔ کیا ارادہ ہے؟" اور بچہ بگڑ جاتا اور کہتا۔ "ابّا! آپ ہم سے مذاق نہ کیا کیجیے۔"

ایک مرتبہ پریس کانفرنس میں ایک اخبار کے رپورٹر صاحب، جو بہت چڑچڑے تھے، سیّد محمد جعفری کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جب چائے، ٹی اور پلیٹ میں گلاب جامن رکھے جانے لگے تو جعفری نے ان رپورٹر کی آنکھ بچا کر اُن کی گلاب جامنیں اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیں۔ رپورٹر صاحب کو بہت غصّہ آیا۔ کہنے لگے۔ "تم سُوٴر ہو" جعفری صاحب نے انھیں تھپکتے اور چمکارتے ہوئے کہا۔ "نہیں میں سُوٴر نہیں ہُوں بھنگی ہُوں۔ سُوٴر پالتا ہُوں۔"

سعادت حسن منٹو

(۱)

دُبلا پتلا[1]، گورا چٹا، لمبا تڑنگا۔ بڑی بڑی غضب کی شریر آنکھیں۔ اور پھر ان شریر آنکھوں میں بلا کی ذہانت و فطانت۔ ڈھیلا ڈھالا بنگالی وضع قطع کی قمیص، بڑی موری کا پاجامہ۔ پُورا لباس کھدّر کا، جو منٹو کے گورے چِٹے رنگ جیسا صاف شفّاف اُجلا ورق۔ طالب علمی کے زمانے میں مَیں نے منٹو کو جب بھی دیکھا تو کچھ اس طرح سے دیکھا کہ اس کی بغل میں ناول کا مجلد ہے۔ ایک ہاتھ میں کسی پیٹنٹ دوا کی بوتل ہے تو دوسرے میں ایک ٹوکری میں چند مالٹے ہیں اور چند سیب۔ اور پھر کچھ مدت گزرنے کے بعد دیکھنے والوں نے اس کی بغل میں اور دونوں ہاتھوں میں شراب کی بوتلیں دیکھیں اور یہ بوتلیں مرتے دَم تک اس کے ہاتھوں ہی میں رہیں لیکن یہ شراب بدلتی رہی۔ شیمپین سے پورٹ بنی اور پھر پورٹ سے ٹھرّا۔ اور پھر بدلتی ہوئی شراب نے منٹو کو بھی بدلنا شروع کر دیا۔ اور جب زیادہ بدلنے کی اس میں سکت نہ رہی تو قدرت کا لمبا ہاتھ بڑھا اور اس نے ان سب شراب کی بوتلوں کو توڑ دیا۔ اس کش مکش میں منٹو کی زندگی کا ساغر بھی ٹوٹ گیا۔ اور اس طرح برِصغیر کے اس عظیم پایہ افسانہ نویس کی زندگی کا افسانہ ختم ہو گیا۔ اس افسانے کا انجام کیا ہُوا؟ المیہ یا طربیہ! اس کا جواب مُلک کے افسانہ نویس دیں گے۔ اور یا وہ لوگ دیں گے جو سعادت کو جانتے تھے۔ اور جو منٹو سے واقف تھے۔ میرے لیے تو وہ منٹو مر گیا جو میرے سکول کا ساتھی تھا۔ جو خود میرے لیے ایک زمانے میں چلتا پھرتا افسانہ تھا۔ مَیں نے ہمیشہ اسے کتابوں اور دواؤں سے لدا پھندا دیکھا۔ سیکڑوں نسخے اس کی نوکِ زبان تھے۔ جب دیکھو خرخروں، خرخروں بلغم تھوکتا۔ ظاہری آنکھ سے دیکھیے یا خُردبین سے، یہ بلغم خالص بلغم تھا لیکن منٹو کی آنکھوں کو اس بلغم میں سیکڑوں افسانوی حقیقتیں نظر آتیں کبھی تو وہ اس میں پھیپھڑوں کے خُون کی آمیزش پاتا اور کبھی دِق کا کوئی شاہکار کہ جیسے وہ بچپن ہی سے

---

[1] اس مضمون کے دو حصّے ہیں۔ پہلا حِصّہ منٹو کی وفات کے فوراً بعد لکھا گیا اور دُوسرا حصّہ اس کے تقریباً پندرہ برس بعد۔ دُوسرے حصّے میں بعض باتوں کی تکرار کے لیے معذرت خواہ ہُوں۔

اپنے لیے موت ڈھونڈھ رہا تھا۔ کچھ تو سچ مچ وہ بیمار رہتا تھا اور کچھ وہ بیمار بننے کا شوقین بھی تھا۔ بچپن میں وہ بڑا دھان پان تھا۔ بے پناہ لاغر و ضعیف، لیکن شریر ایسا کہ جیسے بجلیاں کوٹ کوٹ کر اُس کے جسم میں بھر دی گئی ہوں۔

منٹو کے بارے میں اس کے ہم جماعتوں کی رائے میں بڑے اختلافات تھے۔ لکھنے پڑھنے والے اور سیدھے سادے لڑکے اُسے بدمعاش سمجھتے تھے اور بدمعاش مظلوم۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو سب میں رہ کر سب سے علیحدہ نظر آتا تھا۔ اس کے مذاق میں اور اس کی شرارتوں میں اور اس کے لکھنے پڑھنے کے طریقوں میں ایک نیا پن محسوس ہوتا تھا۔

اسکول کے رجسٹر میں روزانہ اس کی غیر حاضری لگتی لیکن وہ نہایت پابندی سے اسکول آتا۔ یا تو کسی نئے لڑکے سے دوستی گانٹھنے اور یا کسی کو "آلو چھولے" کھلا کر الیگزینڈر ڈوماز کے کسی ناول کا پلاٹ سُنا کر فخر محسوس کرنے۔ وہ جب کسی ناول کا پلاٹ سُناتا تو اس طرح سُناتا کہ جیسے وہ خود ناول کا مصنف ہے۔ ہفتے عشرے میں ایک بار منٹو جماعت میں بھی نظر آجاتا۔ بڑا سا بستہ سامنے میز پر رکھا ہے اور منٹو مطالعہ میں مستغرق ہے۔ بستہ میں اُوپر کی کتاب سوہن لال کا جغرافیہ ہے اور بیچ میں چارلس گاروس کے دو چار ناول ہیں۔ مولوی صاحب دینیات پڑھا رہے ہیں اور منٹو صاحب "ریٹرن آف شی" پڑھ رہے ہیں۔ اور لطف تو یہ کہ دونوں اپنی اپنی جگہ خوش ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں یہ ناول اور یہ افسانوں کی کتابیں منٹو کا اوڑھنا بچھونا بن گئیں۔ ناول اور افسانوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ناول کے سیکڑوں پلاٹ اس کے ذہن میں اُلجھ کر رہ گئے۔ اس کی زندگی بے شمار پلاٹوں کا جال بن گئی اور اس کا کردار ناولوں کے سیکڑوں کرداروں کا ایک مرقع بن گیا۔ یاد رہے کہ منٹو نے ابھی قلم نہیں اٹھایا تھا۔ کیوں کہ اس کی عملی زندگی میں بے شمار افسانے پھوٹ رہے تھے اور اس کی زندگی ایک افسانوی زندگی بن گئی تھی، اس کی ہر حرکت ایک پلاٹ، اُس کی ہنسی سسپنس اور اس کے آنسو کلائمکس، جو بات کرتا چونکا دینے والی۔ انگریزی بولتا تو بے تکان بولتا۔ لیکن خالص ناولانہ انگریزی اور وہ بھی کسی چونّی والے ناول کی، ایسے ناول کی جو اُسے جیب خرچ کے پیسوں سے آسانی سے مل جاتا۔ اور چوں کہ بے خود و بے اختیار ہو کر خاص خاص جوش و خروش کے موقع پر وہ بے سوچے سمجھے بولتا تو اس کی انگریزی خالص "ٹامیانہ" انگریزی بن جاتی۔ اسی باعث اس کے ہم مکتب ایک تو اس کے ٹامیانہ رنگ و رُوپ کی وجہ سے اور دوسرے اُس کی ٹامیانہ انگریزی کی وجہ سے اسے ٹامی کہتے۔ چناں چہ اس کے اسکول کے ساتھی اُسے آج بھی ٹامی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ٹامی عمر میں مجھ سے پانچ چھ سال بڑا تھا۔ میں ساتویں درجے میں پڑھتا تھا اور وہ نویں میں۔ اگرچہ اچھے بچے اس کے پاس سے گزرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے لیکن میرا جی یہ چاہتا کہ میں دن رات اس کے پاس بیٹھا رہوں اور اس کی عجیب و غریب باتیں اس کے خاص خاص انداز اور خاص لہجے میں سُنتا رہوں اور اس کی حرکتیں دیکھتا رہوں۔

امتحان کا زمانہ آتا اور گزر جاتا۔ لڑکے دن رات پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتے منٹو بھی دن رات کتاب کے مطالعے میں غرق رہتا۔ لیکن کتاب نصاب سے باہر کوئی سنسنی خیز ناول ہوتا "سنسنی خیزی" منٹو کو بھی خاصا سنسنی خیز بنا گئی۔

میرے والد محمد عمر خاں مسلم ہائی اسکول امرت سر کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ منٹو کے استاد بھی تھے اور دوست بھی۔ منٹو ایسی منفرد شخصیتوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا اور ان سے کام لینے کا سلیقہ کچھ انہی کو آتا تھا۔ اور یہ انہی کا دم تھا کہ منٹو نے سیکڑوں مشغلوں اور مصروفیتوں کے باوجود میٹرک پاس کر لیا۔ وہ ریاضی میں بھی پاس ہو گیا۔ امتحان سے دو مہینے پہلے اس نے بڑی سنجیدگی سے محنت کی۔ ورنہ شروع سال میں تو اُسے اس کے سنسنی خیز منصوبوں کی تکمیل اور ناولوں کے مطالعہ ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے پیسے چُراتا اور ناول خریدتا۔ رشتہ داروں اور دوستوں سے قرض لیتا اور ناول خریدتا۔ والد سے فیس اور جرمانوں اور ریک ٹک اور مختلف تقریبوں کے نام سے پیسے لیتا اور ناول خریدتا۔ دوستوں کے والدین سے دوستی گانٹھتا۔ رشتے نکالتا، کسی کو ماموں جان کہتا اور کسی کو چچا میاں۔ اور ذرا ان کی نظر چوکی اور منٹو انھیں چچا بنا کر چھوڑتا۔ کوئی کتاب اُڑائی اور چمپت۔ دیگر کی دکان پر تو ایک مرتبہ وہ پکڑا بھی گیا جب پولیس کے سپاہی اُسے تھانے لے جانے لگے تو اُس نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ لوگ سمجھے سیاسی ملزم ہے۔ وہ کتابوں کا عاشق تھا۔ لیکن اس کے ذوق و شوق کے مطابق اسے کتابیں نہیں ملتی تھیں۔ ایک طالب علم کا جیب خرچ ہی کیا۔ زیادہ سے زیادہ دو چار کتابیں خرید لیتا جو ایک دن اور ایک رات میں ختم کر لیتا۔ وہ بے شمار کتابیں پڑھنا چاہتا تھا اور بقول اس کے وہ بے تحاشا کتابیں پڑھتا تھا۔ میرے والد نادانستہ طور پر منٹو کی اس چوری میں برابر کے شریک تھے۔ وہ کتاب چُرا کر لاتا۔ پہلے خود پڑھتا پھر ابا کو دیتا۔ جب ابا پڑھ لیتے تو وہ اور ابا ناول کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے۔ پھر ابا اس سے کہتے کہ وہ اس ناول کے پلاٹ کو اپنی انگریزی میں لکھ کر دکھائے۔ وہ اپنی انگریزی میں ناول کے پلاٹ کو بالاختصار قلم بند کرتا اور ابا اصلاح کرتے۔ اس طرح ایک غیر محسوس طریقے پر منٹو کی انگریزی کی اصلاح ہوتی رہی۔ تھوڑے دنوں بعد میں نے ابا کو یہ کہتے سُنا کہ منٹو کی انگریزی پر کسی انگریزی مصنف کی تحریر کا گمان ہوتا ہے۔ منٹو کی انگریزی تحریر میں بلا کی روانی تھی۔ بزرگوں کا اندازہ تھا کہ یہ لڑکا اگر صحیح راستے پر پڑ گیا تو انگریزی زبان کا بے مثل مصنف ہوگا۔ اور اگر خدانخواستہ بھٹک گیا تو کم از کم اخبار نویس تو بن ہی جائے گا۔ انگریزی زبان کے اعتبار سے اب منٹو "ثامیت" کی حدود سے گزر چکا تھا۔ اور اب وہ اردو زبان میں "ثامیت" اختیار کر رہا تھا۔ انٹرینس کے امتحان میں اردو ایک لازمی مضمون ہے۔ پھر اسکول میں منٹو کو کچھ ایسے بزرگ بھی مل گئے تھے جو اردو کے شیدائی تھے۔ شاعر اور ادیب تھے۔ اردو کے استاد رانا مبارک مند خاں سالک صہبائی نے منٹو کو

اُردو کا چسکا لگایا۔ اس کا خط بڑا پاکیزہ تھا۔ دسویں جماعت میں سالک صاحب اُسے روزانہ املا لکھواتے۔ لیکن ہوتا یہ کہ سالک صاحب کو خود ساری املا لکھنا پڑتی۔ ایک لفظ بھی صحیح نہ ہوتا۔ منٹو اور سالک صاحب میں دوستی بڑھنے لگی۔ سالک صاحب بھی اپنی وضع کے ایک ہی بزرگ تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ بلا کے ذہین انسان۔ صاحب طرز ادیب۔ خوب لکھتے تھے۔ بڑا وسیع مطالعہ تھا۔ مسجد کے صحن اور مکتب کی چٹائی پر بیٹھ کر پڑھا تھا۔ بڑے وضع دار انسان تھے۔ گوشہ نشین اور درویش۔ پنجابی اور دیہاتی۔ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ کچھ تو قدرتی طور پر کھوئے ہوئے سے رہتے تھے اور کچھ کھوئے رہنے کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ آنکھوں میں لال لال ڈورے۔ اگر ذرا بن سنور کر رہتے تو یہ ڈورے غضب ڈھانے لگتے۔ سالک صاحب اردو ادب کی دُنیا میں ایک کھویا ہُوا امریکا تھے جو ادب کے کولمبسوں کی نظروں سے اوجھل رہا۔ سالک صاحب نے منٹو کے مطالعہ کا رُخ بدل دیا۔ اب وہ اعلیٰ معیار کے ناول پڑھنے لگا۔ اچھے اچھے مصنفوں سے رُوشناس ہُوا۔ منٹو نے دو تین مہینے میں اُردو میں میٹرک پاس کرنے کی قابلیت پیدا کر لی تھی۔

میٹرک کا امتحان قریب آ رہا تھا لیکن منٹو بہت دُور جا رہا تھا۔ اس کے والد غلام حسین صاحب مرحوم جو منصف غلام حسین کے نام سے مشہور تھے، اپنے بوڑھے دل میں بس ایک آرزو رکھتے تھے اور وہ یہ کہ منٹو کسی طرح سے میٹرک پاس کر لے اور پھر بی اے، ایم اے کر لے۔ آئی سی ایس بن جائے یا بیرسٹری کا امتحان پاس کر لے۔ ان کی نظر میں منٹو کی ترقی کی بس یہی معراج تھی۔ منصف صاحب ایسا کیوں نہ سوچتے۔ ان کے خاندان کا ہر فرد بیرسٹر یا وکیل تھا۔ وہ جس گلی میں رہتے تھے وہ گلی بھی وکیلوں والی گلی کہلاتی تھی۔ منٹو کا باپ (پرانے زمانے کا جج) ایک بہنوئی میاں حفیظ اللہ مرحوم وکیل اور رئیس شہر، دوسرے بہنوئی ڈاکٹر کچلو۔ پھر منصف صاحب یہ کیوں نہ چاہتے کہ منٹو بھی وکیل یا بیرسٹر بنے۔ ہاں تو امتحان قریب تھا۔ منٹو کے والد صبح ہی صبح ہمارے گھر آتے۔ خدا بخشے بڑی کڑاکے کی آواز تھی۔ چلّا کر آواز دیتے۔ ابّا باہر آتے، برخوردار کی روزانہ کی تعلیمی حالت پہ تبصرہ ہوتا۔ دونوں مل کر کوئی پلاٹ بناتے۔ لیکن منٹو ایک زقند بھرتا اور یہ گھروندے اپنی جگہ رہ جاتے اور برخوردار یہ جا وہ جا۔ وہ دُور کھڑا ہو کر بزرگوں کے منصوبوں پر مسکراتا۔ ایک دن منصف صاحب حسبِ معمول صبح ہی صبح ہمارے گھر آئے۔ ابّا سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے۔ "فرمایئے۔ کیا حال ہے سعادت کا؟ اب تو خوب پڑھتا ہوگا۔ دن رات آپ کے پاس رہتا ہے؟" ابّا بہت چکرائے۔ کہنے لگے۔ "ارے صاحب پندرہ دن سے مَیں نے اس بدبخت کی شکل تک نہیں دیکھی۔" بس پھر کیا تھا۔ دونوں بزرگ فی البدیہہ منٹو کی مذمت میں بے شمار قصیدے کہہ گئے۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہُوا کہ منٹو بمبئی میں تشریف فرما ہیں۔ بہرحال بلوائے گئے۔ منٹو نے ابّا کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ چند گمنام اشخاص کے نام سے ایک اشتہار چھاپا اور اسے شہر کے کوچہ و بازار میں لگایا۔ اشتہار

کا مضمون کچھ اس طرح تھا — محمد عمر خان ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی اسکول کو فوراً ملازمت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ وہ دن رات بچوں کو پڑھاتا ہے۔ اس طرح مسلمان بچوں کی تندرستی خراب ہو رہی ہے اور ان کی ذہنی حالت رُو بہ زوال ہو رہی ہے۔ اور اگر محمد عمر خاں کو علیحدہ نہیں کیا گیا تو سارے طالب علم اور ان کے ماں باپ بغاوت کر دیں گے — اس اشتہار کو جس نے پڑھا، ہنس دیا۔ ابّا نے بھی بہت لطف اٹھایا۔ جب سعادت پر کچھ اور پابندیاں عاید کی گئیں تو اُس نے ابّا کے خلاف چند ہم جماعتوں کے ساتھ حسن بن صباح کمیٹی کی داغ بیل ڈالی۔ ابّا کے نام دھمکیوں کے خط آنے لگے۔ ان خطوں میں یہ لکھا جاتا تھا کہ اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو تمھیں قتل کر دیا جائے گا۔ ذرا قاتل کی ہمت اور جرأت تو دیکھیے، صبح ہی صبح ہمارے گھر آتا اور خط ڈال کر چلا جاتا۔ ابّا اپنے قاتل سے خود ملنا چاہتے تھے چناں چہ ایک دن قاتل ان کی گرفت میں آ ہی گیا اور بُری طرح مجروح ہُوا۔ حسن بن صباح کمیٹی درہم برہم ہو گئی۔ اس کمیٹی کا دفتر نہ جانے کہاں تھا۔ مگر کہیں نہ کہیں تھا ضرور۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک دن جب ابّا منٹو کی کلاس کو پڑھا رہے تھے کہ ایک سردار صاحب آئے اور کلاس رُوم کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ سردار صاحب کرایہ پر فرنیچر اور خیمے دیا کرتے تھے۔ ابّا نے سردار جی سے ان کے آنے کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگے۔ "وہ دری واپس نہیں ملی۔ اور نہ اُس کا کرایہ ہی ملا ہے۔" ابّا نے پوچھا۔ "کون سی دری اور کیسا کرایہ؟" کہنے لگے۔ "وہ جو آپ نے اپنے بڑے لڑکے کی شادی پہ منگائی تھی۔ اور جو آپ کا چھوٹا لڑکا میری دکان سے لایا تھا۔" ابّا اس معمے پہ غور ہی کر رہے تھے کہ سردار جی کی نظر منٹو پر جا پڑی جو سردار جی کو دیکھ کر دبک رہا تھا۔ سردار جی نے چلّا کر کہا۔ "دیکھیے وہ لائے تھے۔" ابّا مُسکرا دیے۔ سردار جی کو تو انھوں نے کسی طرح سے رخصت کر دیا، دری کا کیا ہُوا، مجھے معلوم نہیں۔ جب امتحان بالکل قریب آ گیا تو سعادت نے بڑی سنجیدگی سے محنت کرنا شروع کر دی ممکن ہے اُس نے ضد سے ایسا کیا ہو۔ اور شاید وہ ہار گیا ہو۔ بہرحال چند دنوں کی محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ دُوسرے درجے میں کامیاب ہو گیا جس نے سُنا یہی کہا کہ یہ کسی بزرگ کی کرامت ہے۔

میٹرک کے امتحان سے فارغ ہو کر منٹو علی گڑھ چلا گیا۔ چند مہینوں بعد جیسے گیا تھا ویسے ہی واپس آ گیا۔ البتہ اس کے ذاتی کتب خانے میں بے شمار ناولوں اور افسانوں کی کتابوں کا اضافہ ہو گیا۔ اپنے ساتھ ایک گھونگریالے بالوں والے ایک صاحب زادے کو بھی لیتا آیا جس کا نام شاہد لطیف تھا۔

غازی عبدالرحمٰن نے امرت سر سے "مساوات" کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ "مساوات" کے ادارۂ تحریر میں باری (علیگ) اور حاجی لق لق بھی تھے۔ منٹو بھی مساوات کے مترجموں میں شامل ہو گیا۔ باری اور منٹو کے تعلقات بڑھنے لگے۔ وہ ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو گئے (وہ ہم نوالہ سے زیادہ ہم پیالہ ہوئے)۔ اُردو کا ذوق بڑھا۔ انگریزی افسانوں کے اردو میں ترجمے ہونے لگے۔ اب منٹو نے انگریزی کو مطالعہ تک محدود کیا اور اردو کو اظہار

کا ذریعہ بنایا۔ باری کی نگرانی میں منٹو نے دُنیا کے مشہور مصنفوں کی شہرہ آفاق تصانیف کا مطالعہ کیا۔ اور باری نے منٹو کے قلم کو اُردو کے میدان میں پاؤں پاؤں چلنا سکھایا اور وہ بھی ترجمے کے محدود میدان میں۔ انھی دنوں منٹو نے وکٹر ہیوگو کے مشہور ناول لامزیبے یا کا ترجمہ "سرگزشتِ اسیر" کے نام سے کیا۔ منٹو اس چیز کو لے کر تصنیف و تالیف کے بڑا زخانے میں آیا۔ سالک صہبائی سے تصنیف و تالیف کا ادارہ کھلوایا جس کا نام "حسنِ خیال بُک ڈپو" رکھا گیا۔ اس ادارے کی پہلی اور آخری تصنیف منٹو کے دو ڈرامے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد جب سالک صاحب کو یہ احساس ہوا کہ جس ادارے کو وہ "حسنِ خیال" سمجھ رہے تھے وہ "حسنِ خیالِ یار" نکلا تو انھوں نے اُسے بند کر دیا۔

امرت سر کا ایم اے او کالج اچھا خاصا ادبی مرکز بن رہا تھا۔ اس کے پرنسپل ڈاکٹر تاثیر مرحوم تھے اب یہاں علم و ادب کا ذوق و شوق رکھنے والے بہت سے جواں سال پروفیسروں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ صاحب زادہ محمودالظفر خاں اس کالج کے وائس پرنسپل تھے۔ ان کی بیگم ڈاکٹر رشید جہاں بھی ادبی محفلوں میں شریک ہونے لگیں۔ کالج کے پروفیسروں میں فیض احمد فیض بھی شامل تھے۔ فیض کی عمر اس وقت بیس بائیس سال ہوگی۔ اب تو کافی بھاری بھرکم ہو گئے ہیں۔ اس زمانے میں بالکل دھان پان تھے۔ آنکھوں میں نشیلی انکھڑیاں تھیں۔ وہ خود اپنی غزل تھے۔

منٹو ادبی دُنیا میں ایک تہلکہ مچانا چاہتا تھا۔ وہ ایک بہت ہی لمبی چھلانگ لگانا چاہتا تھا۔ اس کے سینے میں بغاوت کا آتش فشاں کروٹیں بدل رہا تھا۔ وہ دُنیا کا رنگ روپ بدل دینا چاہتا تھا۔ وہ سچے اور پُرخلوص انسانوں کی بستیاں بسانا چاہتا تھا۔ وہ دھوکے کی ٹٹیوں میں آگ لگانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ہر افسانے کو ایک آئینہ بنانا چاہتا تھا، اور ان آئینوں سے ایک آئینہ خانہ بنانا چاہتا تھا۔ اور پھر وہ یہ چاہتا تھا کہ سوسائٹی کو اس آئینہ خانہ میں لائے تاکہ چاروں طرف سے وہ اپنی اصلی حالت، شکل صورت، اور وضع قطع دیکھ سکے، اور دیکھ کر شرما سکے۔ ہاں تو اب منٹو نے اُردو میں طبع زاد افسانے لکھنے شروع کیے یہ ابتدائی افسانے مجذوب کی بڑ معلوم ہوتے تھے منٹو کا ذہن غیر زبانوں کے بے شمار افسانوں اور ناولوں کو جذب کرتے کرتے افسانوں کی مشین بن گیا۔ شروع شروع میں منٹو کا اسلوب اور اس کا اندازِ فکر غیر زبانوں کے مصنفوں کے اندازِ فکر و طرزِ تحریر سے ایسا اثر پذیر ہوا کہ کنجلک بن گیا۔ اگر منٹو ان مصنفین سے راست اثر قبول کرتا تو کوئی بات بھی تھی۔ اس کی تحریر غیر زبانوں کے مصنفوں کی آئینہ دار ہو جاتی۔ لیکن منٹو کی گرہ میں بھی تو اپنا بہت کچھ تھا۔ اس لیے ان اثرات کا (جو اُس نے قبول کیے) جب اس کے ذاتی خیالات سے تصادم ہوا تو ایک دُھندسی پیدا ہوگئی۔ پھر اس پہ ایک اور مشکل آپڑی، منٹو اس مواد کو سمیٹ نہ سکا۔ اس کے افسانے ایک مدت تک اُردو کے خزانے میں غیر ملکی سکوں یا پرائے مال کی طرح ایک کونے میں پڑے رہے۔ اُردو ادب کے دامن میں یہ نیا پیوند کچھ بے تُکا سا لگتا تھا۔ کسے خبر تھی کہ ایک دن پُورا دامن اسی پیوند سے چمک اُٹھے گا اور

اُردو ادب اپنے جیب و دامن پر ایسے جیبیوں پیوند لگا کر سربلند ہوگا۔ منٹو کے کپڑوں سے زیادہ اُجلے اوراق کی ایک کاپی اور ایک کاپینگ پنسل ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتی تھی۔ جہاں بیٹھتا دو چار افسانے لکھ کر اُٹھتا۔ وہ افسانوں کی چلتی پھرتی مشین بن گیا۔ وہ شام کو میرے ہاں آتا اور دو چار افسانے سُنا جاتا۔ شروع شروع کے افسانوں میں کچھ یوں محسوس ہوتا کہ جیسے وہ کوئی نئی بات، کوئی چونکا دینے والی بات کہنا چاہتا ہے۔ لیکن کہہ نہیں سکتا۔ کیوں کہ زبان پر اسے اب تک قدرت حاصل نہیں تھی۔ لیکن کچھ دنوں بعد اس نے اسی زبان میں سے ایک ایسی زبان نکالی جو اُس کے مفاہیم و مطالب کے قامت پر راست آئی۔

منٹو ادب کے میدان میں بڑے دُھوم دھڑکے اور باجے گاجے سے آیا۔ اِدھر حامد علی خاں سے ملا اور "ہمایوں" کا رُوسی ادب نمبر نکال دیا۔ اُدھر شاہد صاحب سے مُلاقات کی اور "ساقی" کا فرانسیسی نمبر چھاپ مارا۔ کبھی ظفر علی خاں سے جا ٹکرایا اور کبھی آغا حشر سے پنجہ کشی کی۔ آج ریڈیو میں ہے تو کل فلم میں۔ کچھ دنوں بعد میں نے سُنا کہ سعادت صاحب بمبئی جا پہنچے ہیں اور ایک ہفتہ وار اخبار "مصوّر" کے ایڈیٹر ہو گئے ہیں۔ مصوّر کو سعادت نے اپنی شہرت کا ڈھنڈورا بنایا اور ایک طوفان مچا دیا۔ ایک سنسنی پھیلا دی۔ فاتحہ خانم کے خلیل خاں سر بگریباں، نگار خانوں کے لکھن ہاروں کو روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ "نگار خانوں" نے سعادت کے لیے اپنے دروازے چوپٹ کھول دیے۔ سعادت نے امرت سر سے آغا خلش کاشمیری کے نام ایک تار بھیجا اور اسے مصوّر کی ایڈیٹری پیش کی۔ خلش سمجھ گیا کہ سعادت کو اُس کی ضرورت ہے۔ تار کے جواب میں وہ خود جا پہنچا۔ خلش کی ساری عمر میدانِ جنگ میں گزری ہے۔ بلا کا پھکیت تھا۔ بگڑے دِلوں میں سرِفہرست اُس کا نام آتا ہے۔ خلش بدیہہ گوئی میں اپنے وقت کا انشا اور ظفر علی خاں تھا۔ اس کا اشہبِ خیال سنگلاخ زمینوں میں دوڑنے کا خوگر تھا کہ جب قافیوں میں تو دو سرود بھر دیتا۔ اس کی ساری عمر کا مشغلہ رہا ہے اکڑی ہوئی گردنوں میں استخار پیدا کرنا، اور ادب کے فرعونوں کی تصانیف و تالیف کو تنقید کے سیلِ عرم میں ڈبونا۔ سعادت کے لیے خلش ایک آہنی دیوار بن گیا۔ سعادت کے دشمنوں کے وجُود کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے ایک تند و تیز طوفان ـــــ اب کیا تھا سعادت کو پناہ مل گئی تھی۔ دشمنوں سے نپٹنے کے لیے خلش اور اپنا رستہ بنانے کے لیے سعادت۔ خلش نے بمبئی میں سعادت کی قابلیت اور صلاحیت کا ڈنکا پھونکا۔ سعادت کو تخلیق کا موقع مل گیا۔ جھاڑ جھنکار دُور ہوئے اور راستہ صاف ہُوا۔ اور اب منٹو کے لیے تخلیق کا زمانہ آ گیا۔

سعادت کی سدا کی بے چین رُوح، اُس کی منتشر اور دُکھی ہُوئی زندگی جب اس کے افسانوں میں بکھر بکھر کر سمٹنے لگی۔ اور سمٹ سمٹ کر بڑھنے لگی تو پھر اتنی بڑھی اتنی بڑھی کہ اس کے ہم عصروں کے لیے اس کے سائے کو پار کرنا مشکل ہو گیا۔ افسانے کی دُنیا میں اس کے افسانے دیوارِ چین بن گئے۔ سعادت نے بڑے بڑے بُتوں کو توڑا۔ پُرانی روشوں کو پامال کیا اور خیالات کی گھُٹن کو اُس نے وسعتیں بخشیں۔ ادب کو ڈرائنگ روم

سے نکال کر وہ فٹ پاتھ تک لایا۔ لکھنؤ کی پُر تکلف محفلوں سے جو اس نے پردہ اٹھایا تو ان محفلوں کی وسعت میں بمبئی کا بھنڈی بازار اور لاہور کا موچی دروازہ بھی سمٹ آیا۔ لکھنؤ کے البیلے چھبیلے نواب جمن بمبئی کے احمد بھائی اور موچی دروازے کے نانبائی اللہ دتا کے سنگی ساتھی بن گئے۔

سعادت ساری زندگی پیاسا رہا۔ پنجاب کے پانچ دریاؤں کا پانی اور پھر پورا بحیرۂ عرب اُس کی پیاس نہ بجھا سکا۔ سارے سمندروں کا پانی پی جانے کے بعد بھی وہ پانی کے ایک ایک قطرے کو ترستا رہا۔ یہ کیسی پیاس تھی؟ وہ ساری دُنیا پر چھا جانا چاہتا تھا۔ وہ ایک ضدی بچے کی طرح یہ چاہتا تھا کہ ساری کائنات ایک کھلونا بن جائے اور وہ اپنی خواہش کے مطابق اُس سے کھیلے، اسے توڑے پھوڑے، اسے بنائے اور بگاڑے۔ اگرچہ یہ ستم ظریف دُنیا ایسے ضدی لوگوں کو خود اپنا کھلونا بنا لیتی ہے لیکن سعادت کے معاملے میں وہ ناکام ہوئی۔ کھلونا بننے کی بجائے سعادت اسی دُنیا کے دھڑکتے ہوئے دل پر ایک بھاری بھرکم پتھر بن کر رہا۔ ہاں تو دُنیا اور سعادت کے اس باہمی تنازعے اور عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعادت کے قلم سے شعلے نکلنے لگے۔ اور اس کے پیالے میں بلا کا رس بھر گیا۔ ماں باپ نے اسے نافرمان کہا، دوستوں نے طوطا چشم، اُستادوں نے اسے آوارہ اور بدقماش اور ادیبوں نے اُس پر طفل خود معاملہ کی پھبتی کہی۔ حکومت نے اُس پر فحش نگاری کے الزام میں مقدّمے چلائے۔ لیکن یہ سب الزامات ہیں اور یکسر غلط ہیں۔ سعادت تو بڑا معصوم تھا۔ ناکردہ کار۔ وہ ماں باپ کا لاڈلا تھا۔ سدا کا روگی۔ ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار۔ تیمارداروں نے اس کے لاڈ اٹھائے۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھر کا لڑکا تھا۔ روپیہ پیسہ سے اس کے چاؤ پورے ہوئے۔ اب سعادت اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں معاشرہ اُس کی ماں کی آغوش، اس کے باپ کا لاڈ اور اس کے گھر بار کی پونجی بن گیا تھا۔ اب سعادت اس معاشرہ کا لاڈلا بن گیا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ گستاخ بھی تھا اور مُنہ پھٹ بھی۔ وہ جب جھنجھلا جاتا تھا تو گالی بکنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ جو کچھ دیکھتا بلا کم وکاست زبان پر لاتا۔ اب چاہے اسے عریانی سمجھو چاہے فحش نگاری۔ کیا وہ اس فحش نگاری سے لذّت حاصل کرتا تھا؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ وہ دُنیا کی تمام لذّتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا جہاں تک مَیں سعادت کو جانتا ہوں وہ ایک پاک باز شرابی تھا۔ اس کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ وہ گستاخ تھا، مُنہ پھٹ تھا، لیکن انتہائی بے ضرر انسان۔ افسوس اس دُنیا سے ایک انسان رخصت ہو گیا۔

(۲)

جب مَیں نے منٹو کو دیکھا تو وہ چودہ پندرہ برس کا لڑکا تھا۔ آنکھوں پر چوڑے شیشوں کا چشمہ، سیاہ فریم، بال بکھرے ہوئے۔ رنگ گورا۔ قد درمیانہ۔ دُبلا پتلا۔ آواز میں کشش۔ نئی بات کہتا، نئی بات سوچتا۔ انگریزی فراٹے سے بولتا۔ فراٹے سے لکھتا۔ میرے والد نے اُس کا نام ٹامی رکھا تھا۔ کیوں رکھا تھا، اس کا سبب بتا چکا ہوں۔ وہ تمام ہم جماعتوں میں ٹامی ہی کے نام سے ہی مشہور ہو گیا تھا۔ اسے انگریزی ناول پڑھنے کا

بہت شوق تھا اور نصاب کی کتابوں سے انتہائی نفرت۔ وہ ایم لے او اسکول سے نکال دیا گیا تھا میرے والد خواجہ محمد عمر مسلم ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور فنِ درس و تدریس میں اپنے وقت کے بڑے آرٹسٹ تھے۔ درس و تدریس ان کا پیشہ نہیں تھا۔ مشغلہ تھا۔ شہر کے ان تمام نوجوانوں کو جن میں بے پناہ بگاڑ ہوتا اور جن سے دوسرے اسکولوں کے ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر پریشان ہو جاتے، وہ انھیں اپنے اسکول میں داخل کر لیتے۔ اور پھر انھیں اپنا دوست بنا کر ان پر محنت کرتے۔ اور جس طرف ان کا میلان ہوتا، ان کی راہ نمائی کرتے۔ ایسے لڑکوں کو وہ اپنے گھر لے آتے۔ ان کو پڑھاتے اور ان کی نگرانی کرتے۔ مشہور افسانہ نگار ابوسعید قریشی نے، جو منٹو کے شریک کار تھے، ان کا ذکر اپنے ایک افسانے میں کیا ہے۔ اور ان کے بارے میں لکھا ہے کہ بگڑے ہوئے نوجوانوں کو بنانے میں ان کا رول سرکس کے رنگ ماسٹر کا ہے جو اپنے طالب علموں سے پیار بھی کرتا اور انھیں مارتا بھی ہے۔ منٹو بھی ان کا ایک ایسا ہی شاگرد تھا۔

منٹو کا خط بہت پاکیزہ تھا۔ وہ انگریزی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرتا تھا۔ لیکن اردو اور ریاضی میں ہمیشہ فیل ہوتا۔

منٹو کو افسانہ لکھنے کا تو شروع ہی سے شوق تھا۔ اس نے سب سے پہلے انگریزی میں افسانے لکھے جو ہمارے اسکول کے میگزین اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوئے۔ میرے والد یہ چاہتے تھے کہ منٹو انگریزی زبان کا صحافی یا ادیب بنے۔ لیکن ہمارے اردو کے استاد خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، رانا مبارک مند خاں سالک صہبائی نے اس میں اردو ادب کا ذوق پیدا کیا۔ سالک صاحب درویش صفت انسان تھے۔ ان کے گھر کے دروازے ان کے شاگردوں اور دوست احباب کے لیے کھلے رہتے۔ ان کی صحبت میں ان کی باتیں سن کر یوں لگتا جیسے سیکڑوں کتابیں پڑھ کر اٹھے ہیں۔ جب منٹو کو یہ احساس ہوا کہ اردو تہی دامن ہے اور یہ ملک کے عوام کی زبان ہے اور مختصر افسانہ نام کی یہاں اگر کوئی چیز ہے تو وہ بے جان سی ہے اور اس میں بھرپور زندگی نہیں ہے تو منٹو نے سالک صاحب کے مشورے سے مختصر افسانے سے ابتدا کی۔ پھر اس نے بے شمار ڈرامے بھی لکھے۔

اپنے اسکول کے زمانے میں جب وہ درجہ نہم کا طالب علم تھا تو وہ انگریزی زبان کے ناول اس طرح پڑھا کرتا تھا کہ آج صبح جو ناول شروع کیا تو کل صبح اسے ختم کر ڈالا۔ پھر اس ناول کا پلاٹ اپنے دوستوں کو سناتا۔ میرے والد اس کی حوصلہ افزائی کرتے اور اس سے یہ کہتے کہ جو ناول تم نے ختم کیا ہے اس کا پلاٹ انگریزی میں لکھ کر دو تاکہ میں بھی پڑھ لوں۔ منٹو دو چار صفحات میں پلاٹ لکھ ڈالتا اور پھر والد اصلاح کرتے۔ اور اس طرح منٹو کی انگریزی زبان کی تعلیم جاری رہتی۔ منٹو نے نویں اور دسویں درجے میں چارلس گارڈس، ڈوماز اور ہارڈی کے سارے ناول پڑھ ڈالے تھے۔ اور وہ ان سب کے خلاصے بھی تیار کر چکا تھا۔

منٹو قلم اور کتاب چور تھا۔ اگر اس کی جیب میں کتاب خریدنے کے لیے پیسے نہ ہوتے تو وہ پڑھنے

کے لیے ناول مانگتا اور اگر پھر بھی اسے ناول نہ ملتا تو وہ چوری کرتا ۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ اچھا قلم اور اچھی کتاب جہاں بھی دیکھتا اُڑا لیتا ۔

ریلوے اسٹیشنوں پر ڈبلیو ایچ وہیلر کے اسٹال ہُوا کرتے تھے ۔ منٹو اکثر ریلوے اسٹیشن پر جاتا ، اور ایک دو کتابیں دس بارہ آنے میں خرید لاتا ۔ اور دکان دار کی نظر بچا کر وہ اپنی پسند کی ایک آدھ کتاب پار بھی کر لیتا ۔ ایک مرتبہ موصوف پکڑے گئے ۔ کھدر کے کپڑے تو پہنتے ہی تھے ۔ جب پولیس نے پکڑا تو "کرتی دل" زندہ باد اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانے لگے ۔ تھانے پہنچا تو دوست احباب بھی پہنچ گئے اور چھڑا لائے ۔

میرے والد شام کے وقت اسکول کی عمارت میں ایکسٹرا کلاس لیا کرتے تھے اور اس میں پابندی لازمی تھی ۔ منٹو نے ایک پارٹی بنائی اور اس کا نام "حسن بن صباح پارٹی" رکھا ۔ اس پارٹی کا کام گپ ہانکنا ، ناول پڑھنا اور نت نئی افواہیں پھیلانا تھا ۔ منٹو کی پارٹی والد صاحب کو پہلے تو گمنام خطوں کے ذریعے ڈراتی رہی کہ اگر انھوں نے بچّوں پر ظلم کرنا نہ چھوڑا تو ان کا مکان جلا دیا جائے گا ۔ اور پھر اس پارٹی کی جانب سے شہر کی دیواروں پر پوسٹر لگائے گئے ۔ جس کا مضمون یہ تھا ۔

ہیڈ ماسٹر محمد عمر خاں

ملّت اسلامیہ کے ہونہار فرزندوں کا قاتل ہے ۔ وہ ہر وقت طالب علموں کو پڑھا کر انھیں برباد کرنا چاہتا ہے ۔ اگر اسے جلد از جلد ہیڈ ماسٹری سے علیحدہ نہ کیا گیا تو انجمن اسلامیہ کے خلاف تحریک چلائی جائے گی ۔

کارکنان انجمن حسن بن صباح

جس نے بھی یہ اشتہار پڑھا وہ ہنس دیا ۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسکولوں کی انتظامیہ کے صدر خود منٹو کے بہنوئی میاں حفیظ اللہ تھے ۔ اور وہ منٹو صاحب سے خوب واقف تھے ۔ والد صاحب سے اُن کے بہت پُرانے تعلقات تھے ۔ منٹو کے والد اور میرے والد میں گہرے مراسم تھے ۔ اُن کا نام غلام حسن تھا اور یہ عدالت خفیفہ میں منصف تھے ، اور منصف غلام حسن کے نام سے مشہور تھے ۔ اُن کو منٹو کی تعلیم کی بہت فکر تھی ۔ وہ روزانہ صبح ہمارے گھر آتے اور اگر ابھی میرے والد چائے پی رہے ہوتے تو ان کی گرجدار آواز آتی جو آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے :

"خواجہ صاحب ۔"

میرے والد باہر آتے اور دونوں میں اس طرح باتیں ہوتیں :

"خواجہ صاحب آپ نے بہت اچھا کیا کہ سعادت کا بستر اپنے گھر منگوا لیا ۔ اور اسے اپنی نگرانی میں رکھا ہے ۔ میں نے اسے پچھلے دس دن سے نہیں دیکھا تو سوچا اس بدبخت کو دیکھ آؤں ۔ کیا کروں دل سے مجبور ہوں ۔"

ابّا نے کہا: "میں نے تو اس کی شکل پچھلے مہینے سے نہیں دیکھی۔"
منصف صاحب نے پوچھا "تو پھر وہ کہاں گیا؟"
غرض کہ جب پوچھ گچھ ہوئی تو پتا چلا کہ موصوف اپنی والدہ کا زیور بیچ کر سیر سپاٹے کے لیے بمبئی نکل گئے ہیں۔ ایک مرتبہ والد صاحب منٹو کی جماعت میں انگریزی پڑھا رہے تھے کہ ایک سردارجی دروازے کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ ابّا کی ان پر نظر پڑی تو پوچھا۔ "کہیے سردارجی۔ کیسے آنا ہوا؟"
سردارجی نے کہا۔ "کیا دری کی اب بھی ضرورت ہے؟"
ابّا نے پوچھا۔ "کون سی دری؟"
کہا۔ "آپ کے صاحب زادے میری دکان پر تشریف لائے تھے۔ کہنے لگے کہ پرسوں بڑے بھائی صاحب کی شادی ہے، ابّا نے دری منگوائی ہے۔ سو اس بات کو ایک مہینہ ہو گیا ہے۔"
منٹو صاحب سردارجی کو دیکھ کر اور ابّا سے آنکھیں چرا کر جماعت سے نکلنے ہی والے تھے کہ ابّا نے منٹو کی طرف اشارہ کر کے سردارجی سے پوچھا۔ "کیا وہ لڑکا یہ تو نہیں؟" منٹو کو دیکھ کر سردارجی کی باچھیں کھل گئیں اور کہا۔ "جی ہاں یہی تھے۔" معلوم ہوا کہ منٹو صاحب حسن بن صباح کمیٹی کے دفتر کے لیے یہ دری لائے تھے۔
منٹو کا ذکر آیا تو سالک صہبائی صاحب سے ملتے چلیے۔ ہوشیارپور کے رہنے والے تھے انھوں نے اتنا لکھا نہیں جتنا پڑھا تھا۔ اور لکھا تو بہت ہی تھوڑا لیکن جو لکھا خوب لکھا۔ اور جو اب ضائع ہو چکا ہے۔ یہ اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ اپنی ساری تنخواہ کتابیں اور رسالے خریدنے میں صرف کر دیتے۔ ساری عمر اپنی لائبریری بنانے میں گزار دی۔ رسالے خرید کر لاتے۔ ان میں سے اشتہار نکال دیتے۔ باقی جو بچتا اس کی جلد بنوا لیتے۔ ہر رسالے کے بارہ پرچوں کی ایک جلد ان کے یہاں نیار ملتی۔ حقّہ پیتے اور کتاب پڑھتے اور یا پھر بھنگ گھوٹتے اور پیتے پلاتے۔ دوسرا کوئی شغل نہ تھا۔ یکے بعد دیگرے کئی شادیاں کیں۔ بچّے بھی پیدا ہوئے لیکن کوئی بیوی اور کوئی بچہ ڈیڑھ دو سال سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ اگر بھنگ پی کر غم غلط نہ کرتے تو بے چارے اور کیا کرتے۔ ان کی صحبت میں ہم نے بہت کچھ سیکھا۔ جو کتاب پڑھتے اس پر تبصرہ کرتے۔ اور کتابیں پڑھنے کا شوق دلاتے۔ منٹو، حسن عباس، آغا خلش کاشمیری اور راقم السطور ان کے ہاں جاتے۔ گھنٹوں بیٹھتے اور اس فقیر کی دہلیز سے بہت کچھ لے کر اٹھتے۔
منٹو اور حسن عباس روزنامہ "مساوات" سے منسلک ہو گئے تھے اور نئے افسانہ نگاروں کی ایک ٹیم بن گئی تھی۔ منٹو نے سوچا کہ کیوں نہ اردو کے ادیبوں کو مختصر عالمی افسانوں سے شناسا کرایا

جاتے۔ جہاں چہ ساقی، ہمایوں اور عالم گیر کے رُوسی اور فرانسیسی افسانہ نمبروں کی تیاری کا کام منٹو کے مکان میں جو وکیلوں کی گلی میں تھا، شروع ہُوا۔ مَیں بھی ان محفلوں میں شریک ہُوا ہُوں ۔۔۔ بے شمار رُوسی اور فرانسیسی افسانوں کے مجموعوں سے افسانوں کے اوراق نکال کر تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ دو چار دن کے بعد ترجموں کے لیے تقاضے شروع ہو جاتے۔ عصمت چغتائی کے شوہر مرحوم شاہد لطیف بھی اس سلسلے میں علی گڑھ سے آئے تھے اور منٹو کے مہمان تھے۔ مترجمین کی اس ٹیم میں منٹو کے شرکائے کار حسن عباس اور ابو سعید قریشی تھے۔ ویسے ترجمے سالک صہبائی نے بھی کیے، رشید جہاں نے بھی، فیض نے بھی۔ فیض صاحب نے تو گورکی کی تصانیف پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا تھا۔

آغا خلش کاشمیری نے مختصر اور طویل افسانوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا جو منٹو کے نام سے شائع ہُوا تھا۔

پطرس بخاری نے غلام عباس صاحب کو امریکہ سے خط لکھا کہ بہت سے امریکی منٹو کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ شاعر تھا۔ یہ بات غلام عباس صاحب نے مجھ سے کہی تو میں نے انھیں حقیقتِ حال بتائی۔

ان ترجموں سے منٹو نے اردو افسانہ نگاروں اور نئے لکھنے والوں کو ایک نئے راستے پر ڈال دیا اردو میں مختصر افسانوں میں نئی وسعتیں پیدا ہو گئیں۔ خود منٹو جدید اردو افسانے کا خالق ہے۔ اور اس کے ہم عصروں نے منٹو کی جرأت سے حوصلہ پایا اور ایک کھیپ کی کھیپ نئے افسانہ نگاروں کی ملک میں اُبھر آئی۔

منٹو نے اپنے اُستاد رانا مبارک منہ خاں سالک صہبائی کو ایک پبلشنگ ہاؤس کھولنے پر آمادہ کیا۔ اس کا نام حسن خیال بُک ڈپو رکھا گیا۔ اس ادارے نے منٹو کے دو ڈرامے کتابی صورت میں شائع کیے۔ اس کتاب کا نام "دو ڈرامے" تھا۔ کتاب تو چھپ گئی لیکن حسنِ خیال بُک ڈپو کا کیا بنا ہو گیا۔ میں نے سالک صاحب سے پُوچھا کہ حسنِ خیال بُک ڈپو کا کیا حال ہے تو فرمایا حسنِ خیال تو منٹو صاحب لے گئے اور یہ ناچیز تو خالی بُک ڈپو اٹھائے پھر رہا ہے۔

جب منٹو نے افسانے لکھنے شروع کیے تو وہ اپنی زبانی اپنے دوستوں کو اپنے افسانے سُنایا کرتا تھا۔ اس سے پہلے دو چار افسانے اس نے میرے گھر آ کر مجھے سُنائے۔ وہ افسانہ اس انداز سے سناتا تھا کہ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اس افسانے سے گزر رہا ہے۔ افسانے کے ہر کردار کا رُوپ دھار کر وہ کردار کی اداکاری اس کی زبان اور اس کے لہجے میں کرتا اور اس طرح وہ افسانے کو ڈراما بنا دیتا۔ اور یُوں بھی اس کے افسانوں میں ڈرامائیت کا عنصر خاصا ہے۔

منٹو ایک ہی نشست میں یا زیادہ سے زیادہ دو تین نشستوں میں ڈراما یا افسانہ لکھ ڈالتا اور وہ لکھ کر کاٹا نہیں کرتا تھا۔ وہ عمدہ کاغذ پر پنسل سے لکھتا تھا۔ اس کا خط صاف ستھرا اور پاکیزہ تھا۔
آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران اس نے اردو کا ٹائپ رائیٹر خرید لیا تھا۔ وہ افسانہ ہو یا ڈراما اس نے ٹائپ رائیٹر پر کاغذ چڑھایا اور ایک آدھ گھنٹے میں لکھ ڈالا۔ اس کے خیالات اور اس کے اظہارِ خیال میں کوئی الجھن نہیں تھی۔ اس کو بیماریاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ ضرورت سے زیادہ سگریٹ پینے کے باعث اس کا گلا اکثر خراب ہو جاتا۔ اگر کبھی تھوک میں خون آجاتا تو کہتا کہ مجھے تھائی سس (تپ دق) ہے۔ ایک آدھ دوا کی شیشی اس کے ہاتھ میں ضرور ہوتی۔ وہ اکثر ٹانک بھی استعمال کرتا تھا۔ وہ مچھلی بہت شوق سے کھاتا تھا۔ وہ اپنا علاج خود کر لیتا تھا۔ اسے پنسلین کا انجکشن لگانے کا بہت شوق تھا۔ اگر ذرا سی تکلیف ہوتی تو خود اپنے ہاتھ سے پنسلین کا انجکشن لگا لیتا۔
ایک مرتبہ منٹو کو یہ پتا چلا کہ آغا حشر کاشمیری امرت سر سے لاہور جا رہے ہیں۔ منٹو نے کوشش کر کے اسی کمپارٹمنٹ کا ٹکٹ حاصل کر لیا اور ایک نہایت گھٹیا ڈرامے کی کتاب لے کر آغا صاحب کے بالمقابل بیٹھ گیا۔ آغا صاحب نے دور سے ڈرامے کا نام پڑھ لیا۔ جب منٹو نے کتاب سے نظر اٹھا کر آغا صاحب کو دیکھا تو آغا صاحب نے پوچھا۔ کیا تم ڈرامے شوق سے پڑھتے ہو؟ منٹو نے اثبات میں سر ہلایا۔ آغا صاحب نے کہا۔ "تمھارے خیال میں اس ملک میں سب سے بڑا ڈراما نویس کون ہوا ہے"؟ منٹو نے کہا۔ "امانت۔ احسن۔ بے تاب۔ ماسٹر رحمت۔ غلام علی دیوانہ۔" آغا صاحب نے کہا "کیا تم نے آغا حشر کاشمیری کا نام نہیں سنا؟" منٹو نے کہا۔ "وہ کیا کرتے ہیں؟"
بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ آغا صاحب برس پڑے۔ اور منٹو بھی کم نہیں تھا۔ جب لاہور کا اسٹیشن قریب آیا تو منٹو نے آغا صاحب سے کہا کہ قبلہ! آپ سے متعارف ہونے اور باتیں کرنے کے لیے میں نے یہ ڈراما کھیلا تھا۔
باری علیگ کو اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، منٹو اور ان کے ہم سال ساتھیوں کی ذہنی، علمی اور ادبی تربیت میں اُن کا بڑا حصہ ہے۔ وہ ان کے استاد بھی تھے اور دوست بھی۔ ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور ساتھ چلتے پھرتے۔ افسانے باری صاحب نے بھی لکھے ہیں لیکن قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ افسانہ نویس بننے کی بجائے وہ افسانہ نگاروں کی تربیت کریں۔
منٹو بے پر کی اڑانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس کی اڑائی ہوئی بات سارے ہندوستان میں گھوم کر اس کے پاس پہنچ جاتی۔ تاج محل کو امریکہ اُٹھا لے جانے کی افواہ تو آپ سن ہی چکے ہوں گے۔ یہ منٹو نے اڑائی تھی۔
منٹو شروع ہی سے بیمار رہتا تھا اور موت کا خوف اس پر ہمیشہ طاری رہا۔ جلیانوالہ باغ کی چنگاریاں

اس نے اپنے سینے میں دبا رکھی تھیں۔ کبھی یہ چنگاریاں بجھ جاتیں اور کبھی سُلگ اُٹھتیں۔ اس کے افسانے کے کینوس پر پورا معاشرہ پھیلا ہوا تھا۔ اس کے کردار جیتے جاگتے انسان تھے جو روزانہ ہمارے قریب سے گزرتے ہیں۔ ہم میں رہتے سہتے ہیں۔ لیکن منٹو کی حیثیت تماشائی کی ہوتی۔ منٹو نے معاشرے کی تصویر کشی کچھ اس طرح کی ہے کہ جتنے چوروں نے شہنشاہوں کے لبادے پہنے تھے اُس نے انھیں تار تار کر ڈالا۔ منٹو نے معاشرے کے رِستے ہوئے ناسوروں کو نہیں چھپایا بلکہ بڑی جُرأت سے ان کی نمائش کی۔ اس نے جرم کرنے والوں کے جرم کے پس منظر کو اپنے افسانے کی اساس بنایا۔ منٹو گناہ گاروں کا وکیل تھا۔ اچھائی اور نیکی کا بہروپ بھرنے والوں کا دشمن تھا۔ اُس کا دِل انسانی دُکھوں سے پھوڑا بن چکا تھا۔ اس کے افسانوں میں اُس کی چیخیں بھی ہیں اور اس کا زہرخند بھی۔ وہ بڑا جذباتی بھی تھا اور حسّاس بھی۔ اس کی روشن اور بڑی بڑی آنکھیں معاشرے میں بکھرے ہوئے اس کی پسند کے افسانوی کرداروں کو ڈھونڈنے میں کھوئی کھوئی رہتیں۔ اسے زندہ کرداروں کے یہ افسانے بھی گلی کوچوں اور تنگ و تاریک گھٹے ہوئے مکانوں میں ملتے۔

مَیں نے منٹو کو ایسے لوگوں میں اُٹھتے بیٹھتے دیکھا کہ جن سے کوئی بھی ملنا گوارا نہ کرتا۔ شہر کے اُچکوں، گرہ کٹوں اور غنڈوں سے اُس کی دوستی تھی۔

اُس نے امرت سر میں جو افسانے لکھے وہ اتنے جان دار نہیں ہیں جتنی جان اس کے بمبئی کے افسانوں میں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بمبئی میں اُس پر اتنی اخلاقی پابندیاں نہیں تھیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ اپنے کرداروں کی تلاش میں بمبئی اُٹھ آیا تھا۔ پھر بمبئی میں معاشرے کا ہر طبقہ تھا۔ ہر نمونے کا شخص اُسے مِل جاتا۔

جب پاکستان بنا تو منٹو پاکستان چلا آیا۔ شاید یہاں اُس کی موت اور اُس کے فن کی موت اُسے لے آئی تھی۔ اور یہ عظیم فن کار یہاں آکر پہلے تو پاگل ہو گیا اور پھر جب ہوش و حواس میں آیا تو موت نے اُس کی مشکل آسان کر دی۔

نصراللہ خاں عزیز

نصراللہ خاں عزیز کا شمار ملک کے صفِ اوّل کے صحافیوں میں ہوتا ہے۔ ان کے اداریے فکر انگیز ہوتے۔ انھیں زبان پر پوری قدرت تھی۔ وہ الفاظ استعمال کرنے میں کفایت سے کام لیتے ان کی عبارت میں کوئی لفظ اُس کی جگہ سے ہٹایا یا بدلا نہیں جاسکتا تھا۔ ان کے جملوں میں نشتر کی سی کاٹ ہوتی۔ ان کی تحریر کا انداز اُس زمانے کے اداریہ نگاروں یا مضمون نویسوں کی طرح خطیبانہ نہیں تھا۔ وہ الفاظ کے ہیر پھیر سے یا لفظوں کا جادو جگا کر اپنی بات نہیں منواتے تھے بلکہ وہ جو بات کہتے تو اس کے جواز میں دلائل بھی پیش کرتے اور حوالے بھی لاتے۔ ان کی زبان عام فہم اور آسان تھی۔ ان کے اداریے گھر گھر پڑھے جاتے اور جس دن یہ اخبار میں چھپتے تو اُس دن ہر مجلس و محفل میں موضوعِ گفتگو بنتے۔

حضرت مولٰنا ظفر علی خاں اور نصراللہ خاں عزیز میں نظریاتی اختلافات بڑے شدید تھے۔ مولٰنا ظفر علی خاں کانگریس کے خلاف تھے لیکن نصراللہ عزیز کانگریس میں تو نہیں تھے لیکن اُس زمانے میں وہ نیشنلسٹ اور ساتھ ساتھ سچے مسلمان بھی تھے۔ چنانچہ مولٰنا ظفر علی خاں اور نصراللہ عزیز کے نظریاتی اختلاف کے باوجود میں نے حضرت مولانا ظفر علی خاں کو مولانا نصراللہ خاں کے بارے میں یہ کہتے سُنا ہے کہ کاش ہم میں دو چار اور صحافی نصراللہ عزیز جیسے ہوتے۔

وہ اداریے کی تیاری اس طرح کرتے کہ صبح کے اخبارات پڑھ کر اداریے کا موضوع متعین کر لیتے اور پھر دفتر جانے سے پہلے وہ اس پر کتابوں یا اخباروں یا رسائل میں یا حوالے کی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوتا اس پر ایک نظر ڈال لیتے اور اس کے بعد کبھی سائیکل پر اور کبھی پیدل دفتر جاتے ہوئے راستے میں یہ سوچتے کہ انھیں اس موضوع پر کیا لکھنا ہے اور کس طرح لکھنا ہے؟ دفتر پہنچ کر وہ اُس پر اپنے اخبار کی دو چار پُرانی فائلیں بھی دیکھ لیتے۔ اور پھر قلم اٹھا کر لکھنا شروع کر دیتے اور چالیس پنتالیس منٹ میں وہ اداریہ لکھ کر اسے کاتب کے حوالے کر دیتے۔ اور پھر چائے آتی اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں اور جب اداریہ لکھا جا چکتا تو وہ خود اُس کا پروف پڑھتے اور پھر پیدل یا سائیکل اُٹھا کر نکل جاتے بس اُس زمانے کی بات کر رہا ہوں جب مولانا نصراللہ خاں عزیز، حضرت مولٰنا ظفر علی خاں کی فرمائش پر مدینہ (بجنور)

کی ملازمت چھوڑ کر، روزنامہ 'زمیندار' سے بحیثیت ایڈیٹر وابستہ ہو گئے تھے۔

مولانا نصراللہ خاں عزیز اداریہ نگار ہی نہیں تھے، وہ اعلیٰ پایہ کے مزاح نگار اور کالم نویس بھی تھے۔ اور کالم نویسی میں بھی وہ اپنے عہد کے کسی کالم نویس سے کم نہیں تھے۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس زمانے میں 'زمیندار' کے علاوہ لاہور سے روزنامہ احسان، روزنامہ انقلاب اور روزنامہ سیاست بھی نکلتے تھے۔ "انقلاب" میں سالک و مہر، "احسان" میں مرتضیٰ احمد خاں میکش، مولینا چراغ حسن حسرت اور حاجی لق لق تھے۔ سیاست میں سید حبیب اور مقبول انور داؤدی تھے۔ سالک صاحب کا کالم "افکار و حوادث" بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا۔ حسرت صاحب کا کالم مطائبات جو وہ سندباد جہازی کے فرضی نام سے لکھتے تھے، بہت مقبول تھا۔

مولانا نصراللہ خاں عزیز زمیندار میں فکاہات لکھتے تھے۔ حسرت صاحب اور مولینا کی خوب چونچیں ہوتیں۔ دونوں کا اپنا اپنا لکھنے کا انداز تھا۔ مولینا نصراللہ خاں عزیز لاہور کے باشندے تھے اور ککے زئی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ کچھ دنوں اورنیٹل کالج میں بھی پڑھا۔ اختر شیرانی مرحوم سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ ساتھ ساتھ جوان ہوئے۔ رندوں میں رہ کر حضرت مولینا میں بھی رندانہ ادائیں آ گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں خشکی نہیں ہے، بانکپن، جاذبیت اور رنگارنگی ہے۔

اختر شیرانی لاہور سے ماہنامہ رُومان نکالتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مولینا کو پکڑ کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ اور یہ کہا کہ اب چھٹکارا تمھارا اسی صورت میں ہوگا جب تم رُومان کے لیے کوئی رومانی افسانہ لکھ کر ہمارے حوالے کروگے۔ ورنہ تمھیں پکڑ دھکڑ کر پلا دی جائے گی۔ چناں چہ مولانا نے دو گھنٹے میں افسانہ لکھ ڈالا۔ اختر نے مولانا کو چائے پلا کر رخصت کیا۔ جب مولینا چلے گئے تو اختر نے افسانہ پڑھا۔ خاصا رُومانی اور دل چسپ افسانہ تھا۔ لیکن اس افسانے کے آخر میں مولانا نے یہ لکھا تھا کہ "اس کے بعد میری آنکھ کھُل گئی"۔ اختر نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا کہ مولوی غچا دے گیا اور اپنا ایمان بچا کر لے گیا۔

میں نے جب یہ واقعہ حضرت مولینا کی زندگی میں اپنے ایک مضمون میں بیان کیا جو روزنامہ حریت میں شائع ہوا تھا تو حضرت مولینا نے اس کی تردید کی اور میں بہت نادم ہوا لیکن پندرہ دن کے بعد ان کے ایک صاحب زادے نے اپنے رسالے میں مولینا کی یہ تحریر چھاپی کہ وہ افسانہ مولانا کو اپنے پرانے کاغذات میں مل گیا ہے اور مولینا نے اس سلسلے میں مجھ سے معذرت بھی کی۔

زمیندار میں مولانا مشکل سے سات آٹھ مہینے رہے۔ کیوں کہ مولینا ملازمت یا ایڈیٹری کی خاطر اپنے نظریات کی قربانی نہیں دے سکتے تھے۔

مولانا نصراللہ خاں عزیز اور مولانا ظفر علی خاں میں دو چار بار اداریوں کے بعض پہلوؤں پر خاصی نوک جھونک اور گرما گرمی ہوئی۔ اور ایک مرتبہ جب حضرت مولانا ظفر علی خاں علی گڑھ سے واپس آئے تو اُن کی ایک نظم کے اس شعر پر:

تہذیبِ نو کے منہ پہ وہ تھپڑ رسید کر
جو اس حرام زادی کا حُلیہ بگاڑ دے

مولانا نصراللہ خاں عزیز نے اعتراض کیا اور یہ کہا کہ "حرام زادی" کی جگہ کوئی دُوسرا مناسب سا لفظ رکھ دیا جائے تو بہتر ہوگا کیوں کہ آپ کے قلم سے ایسا سوقیانہ لفظ اچھا نہیں لگتا۔ تو مولانا ظفر علی خاں نے کہا کہ تہذیبِ نو کے لیے اس سے بہتر اور مناسب اور موزوں کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے، اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے تو پنجابی سمجھ کر پھر بھی لوگ معاف کر دیں گے لیکن آپ دِلّی کے آخری بادشاہ کے اُستاد ذوقؔ دہلوی کو کیا کہیں گے جو یہ محاورہ باندھ گئے ہیں کہ ؏

پیچ ہے حرام زادے کی رسّی دراز ہے

غرض ان حالات میں حضرت مولانا نصراللہ خاں عزیز زمیندار کی ادارت سے مستعفی ہو گئے۔

ہم دونوں کی ہم نامی میں اکثر یہ ہوتا کہ جن لڑکے بالوں کی مجلس میں مجھے بلایا جاتا تو وہاں مولانا پہنچ جاتے اور جن متشرع بزرگوں کی محفل میں مولانا کو بلایا جاتا تو میں وہاں پہنچ جاتا۔ اور دونوں شرمندہ ہو کر واپس آتے۔ چناں چہ حضرت مولانا ظفر علی خاں نے اس کا فیصلہ یہ کیا کہ میرے نام سے پہلے عزیز لکھا جانے لگا۔ اور ایک مرتبہ مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں امرت سر میں میں حضرت مولانا ظفر علی خاں کا پولنگ ایجنٹ تھا۔ اس سلسلے میں جب اخباروں میں میرا نام عزیز نصراللہ خاں چھپا تو حسرت صاحب نے ایک کالم میں لکھا کہ اخباروں میں نصراللہ خاں عزیز کا نام عزیز نصراللہ خاں پڑھ کر ہم حیران رہ گئے۔ اور سوچنے لگے کہ آخر مولانا نصراللہ خاں کے نام کی دُم ان کی چوٹی کیسے بن گئی۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ وہ صاحب زادے ہیں جو درسِ صحافت لینے کے لیے امرت سر سے اپنی انّا کی گود میں سوار ہو کر دفتر زمیندار میں تشریف لایا کرتے ہیں۔ مولانا نصراللہ نے ترکی بہ ترکی اس کا جواب اپنے کالم میں دیا اور یہ لکھا کہ کرنسی میں ایک مجسٹریٹ صاحب تھے جن کا نام چراغ حسن تھا۔ کرسی کے ایک باشندے نے اُن سے کہا کہ آپ اتنے قابل ہیں، نہ جانے آپ کا نام کس نے چراغ حسن رکھ دیا ہے ورنہ آپ کا نام تو پیٹرومیکس حسن ہونا چاہیے تھا۔

اور پھر کچھ مدت کے بعد یہ معلوم ہوا کہ مولانا نصراللہ خاں عزیز جو حضرت مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے رُفقا میں تھے، جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے۔ حضرت مولانا نے جماعت اسلامی کے دُو اخباروں کی آخری دم تک ادارت کی۔ یہاں انھیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ پھر یہاں

جماعت نے سیاست کا جو راستہ اختیار کیا تھا تو اس کو متعین کرنے میں مولانا بھی برابر کے شریک تھے لیکن اگر جماعت کی پالیسی مرتب کرنے والوں میں کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو مولانا انھیں بھی معاف نہ کرتے۔ وہ بڑے نڈر اور بے باک صحافی تھے۔

جب مولانا بجنور سے لاہور آئے تو اُس وقت اُن کی عمر چالیس برس سے کچھ کم ہی ہوگی۔ جوانی کا عالم تھا۔ کشیدہ قامت، داڑھی چھوٹی۔ سر اور داڑھی کے بال کالے تھے۔ رنگ گندمی تھا۔ بعد میں کالا ہو گیا۔ داڑھی بھی خاصی بڑھ گئی تھی۔ علی گڑھی پاجامہ اور شیروانی پہنتے تھے۔ سر پر کالی ٹوپی لیکن سارا لباس کھدر کا ہوتا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ صاحبِ دیوان تھے۔ تقریر بھی اچھی خاصی کر لیتے۔ پڑھتے زیادہ تھے، لکھتے کم تھے۔ خط ایسا کہ جیسے موتی پرو دیے۔ جو لکھتے تھے وہ کاٹتے نہیں تھے۔ عربی زبان پر خاصا عبور تھا۔ شروع شروع میں لہجے میں پنجابیت نام کو نہیں تھی لیکن بعد میں ان کا لہجہ بدل گیا تھا۔

نصراللہ خاں کا اپنا اسٹائل تھا اور میرے خیال میں اسٹائل اس اندازِ تحریر یا طرزِ تحریر کو کہتے ہیں جسے کوئی دوسرا اپنا نہ سکے۔ یہ انداز لکھنے والے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ لکھنے والے تو ایک سے بڑھ کر ایک پیدا ہوتے ہیں لیکن اسٹائلسٹ ہزاروں میں اِکّا دُکّا ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ایسی تحریر اپنے لکھنے والے کا نام بتا دیتی ہے۔ اور اس منفرد اندازِ تحریر کے لیے خود لکھنے والے کا منفرد ہونا ضروری ہے اور نصراللہ خاں کی تحریر بھی ان کی شخصیت کی طرح منفرد تھی۔

نصراللہ خاں کسی کی ذات پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی تحریر و تقریر میں سنجیدگی و متانت تھی۔ کوئی سوقیانہ جملہ نہ ان کی زبان پر آتا اور نہ ان کے قلم سے نکلتا۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے وہ اپنے ماتحتوں سے انتہائی شفقت سے پیش آتے۔ اور ان کی تربیت اس طرح کرتے کہ اُستاد یا شاگرد ہونے کا احساس تک نہ ہوتا۔

نصراللہ خاں عزیز کا شمار اُن گنے چنے صاحبِ طرز صحافیوں اور ادیبوں میں کیا جاسکتا ہے جن کے لیڈر یا اداریوں اور مزاحیہ کالموں میں بے شمار اداریے اور کالم ایسے ہیں جو ہر عہد میں زندہ رہیں گے اور صحافیوں کی نئی نسل کی اداریہ اور کالم نگاری میں راہ نمائی کرتے رہیں گے۔ وہ بڑے سچے اور کھرے آدمی تھے۔ اللہ تعالٰے ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ (آمین)

حمید نظامی

حمید نظامی صحافیوں کی اس زنجیر کی آخری کڑی تھے جس میں صحافی، سیاست دان اور اپنی قوم کے راہ نما بھی ہُوا کرتے تھے۔ حمید نظامی بڑے کھرّے، سچّے اور سلجھے ہوئے سیاست دان تھے۔ ان کی سیاست ان کے ذاتی مفادات کی آمیزش سے پاک تھی۔ وہ صحافی تھے تو اب وہ سانچے ہی ٹوٹ گئے ہیں جن میں حمید نظامی ایسے نڈر، بے باک اور با اصول صحافی ڈھل کر نکلا کرتے تھے۔

اگرچہ وہ ایک اخبار کے مالک تھے لیکن اخبار کے مالکوں ایسی ان میں کوئی بات نہ تھی۔ یوں لگتا کہ ان کا اخبار ان کا اخبار نہیں، قوم کی امانت ہے اور وہ اس امانت کے امین ہیں۔ پہلے زمانے میں اخباروں کی مقبولیت اور کامیابی کا راز اخبار کا مشنری کام ہوتا تھا۔ قوم اور مُلک کی خدمت کا جذبہ ہوتا تھا۔ اور ایک مقصد ان صحافیوں اور ان کے اخبار کے سامنے ہمیشہ رہتا اور اخبار کا مالک اور ایڈیٹر اور کارکُن صحافیوں کی پوری ٹیم اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی جان لڑا دیتی۔ نہ دن کو دن سمجھتی نہ رات کو رات۔ اور یہ اُس وقت ہوتا جب اخبار کے مالک یا ایڈیٹر کی اس میں حمید نظامی کی طرح لیڈرشپ بھی ہوتی۔ اس میں اور کارکُن صحافیوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں میں ایک جیسی لگن ہوتی اور دونوں کے سامنے مُلک و مِلّت کی خدمت اور راہ نمائی کا جذبہ کارفرما ہوتا۔

اگر حمید نظامی کو صحافت کی دُنیا کی ایک عہد ساز شخصیت قرار دیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ مَیں نے حمید نظامی مرحوم میں سب سے بڑی بات یہ دیکھی تھی کہ وہ جو کہتے تھے، وہ کرتے بھی تھے۔

حمید نظامی عام آدمیوں جیسے تھے۔ نہ ان کا لباس لیڈروں ایسا ہوتا اور نہ ان کی باتوں میں مرعوب کرنے والے جھٹکے ہوتے۔ وہ جس طرح ایک عام آدمی سے ملتے تھے، اسی طرح وہ وزیروں اور سربراہانِ حکومت سے بھی ملا کرتے تھے۔

حمید نظامی سے پہلے برصغیر میں جتنے عظیم صحافی گزرے ہیں ان کے اخبار اگرچہ تاریخ ساز تھے لیکن ان اخباروں کی حیثیت شخصی تھی۔ یعنی ان اخباروں کا محور اور مدار اُن کا مالک ہوتا جو ملک کا نامور ادیب بھی ہوتا اور خطیب اور لیڈر بھی۔ جب تک وہ زندہ رہتا اس کی خطابت اور لیڈری کی وجہ سے اخبار ملک میں مقبول رہتا۔ لیکن اس کے بعد یہ اخبار جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔ "زمیندار" اور "الہلال" اور "کامریڈ" وغیرہ کا انجام آپ کے سامنے ہے۔ لیکن حمید نظامی مرحوم کبھی سے کبھی علیحدہ ہو کر خود کُل نہیں بنے۔ اُنھوں نے لیڈری بھی کی تو اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے یا بڑا لیڈر بننے کے لیے نہیں کی۔ وہ اپنی شخصیت پر اپنی پارٹی، اور اپنی پارٹی پر اپنی قوم اور ملک کو ترجیح دیتے تھے۔

ان کی ادارت میں "نوائے وقت" جہاں وقت کی نوا بنا، وہاں یہ ملتِ اسلامیہ کی آواز اور امنگوں اور خواہشوں کا ترجمان بھی تھا۔ جب صحافت صنعت بن جاتی ہے تو اخبار کے مالک کی حیثیت سیٹھ ساہوکار کی سی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی قوم کے سطحی جذبات کو انگیخت کرتا ہے۔ سستی شہرت اور عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے اس کے پیچھے چلتا ہے۔ لیکن جو اخبار قوم کا بہی خواہ ہوتا ہے اور قوم کو سلامتی کے راستے پر لانا چاہتا ہے تو وہ قوم کو، دل میں یہ خیال لائے بغیر کہ اس کی مقبولیت میں کمی آتی ہے یا اضافہ ہوتا ہے، اس کی غلط روش پر للکارتا بھی ہے۔ اور مجھے یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے اور آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ حمید نظامی اور ان کے اخبار نے قوم کو للکارا بھی ہے۔

حمید نظامی شاید ہمارے ملک کا وہ آخری صحافی تھا جس نے سیاست میں بھرپور حصّہ لیا اور ملک بنانے والے جواں سال و جواں خیال معماروں میں اس کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ اور یہ بات بھی آپ کے علم میں ہے کہ جب ہم یہ ملک بنا رہے تھے تو حمید نظامی نے پبلک پلیٹ فارم اور پریس ہی میں نمایاں کردار ادا نہیں کیا بلکہ جب مسلم لیگ انتخابات میں حصّہ لے رہی تھی تو ایک قومی کارکن کی حیثیت سے وہ ان تمام محاذوں پر بھی برابر لڑتا رہا جہاں گولیاں برس رہی تھیں اور جہاں جان کا خطرہ تھا۔

"نوائے وقت" کے اجرا سے پہلے لاہور سے جو اخبارات نکل رہے تھے ان میں مولانا ظفر علی خان کا اخبار "زمیندار" بھی تھا۔ ملک نورالٰہی کا اخبار "احسان" بھی تھا۔ سید حبیب اور سید عنایت کا اخبار "سیاست" بھی تھا، اور احراروں کا اخبار "مجاہد" بھی تھا۔ مولانا ظفر علی خان کا اخبار دَم توڑ رہا تھا کیوں کہ مولانا میں کہولت کے سارے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ اس لیے اس اخبار میں بھی پہلے جیسی جان نہیں رہی تھی۔

احرار مسلم لیگ اور جناح صاحب کے خلاف تھے۔ "احسان" یُوں بھی تھا اور یُوں بھی۔

پنجاب میں مسلم لیگ کا اپنا کوئی اخبار نہیں تھا۔ اگرچہ شہید گنج کے انہدام کے بعد جب قائداعظمؒ لاہور آئے اور ان کی علامہ اقبالؔ اور مولانا ظفر علی خان سے ملاقات ہوئی اور مولانا مسلم لیگ میں شامل بھی ہو گئے لیکن ان کی شمولیت کے باوجود لیگ پر جو ٹوڈیت کا الزام پہلے سے لگ چکا تھا، وہ دُور نہیں ہُوا تھا۔ اور پھر یونینسٹوں اور احراریوں کا محاذ بھی تھا۔ اور پھر جب علی گڑھ کے طالب علم اُٹھے اور مُلک میں پھیل گئے تو ادھر پنجاب میں حمیدؔ نظامی اور ان کے رفقاء نے گھر گھر جا کے قائد اور مسلم لیگ کا پیغام پہنچایا۔ اور مُلک کے گوشے گوشے میں فضا مسلم لیگ کے حق میں ہموار کی۔ ظفر علی خان کی شاعری نے بھی بڑا کام کیا۔ جب "نوائے وقت" کا اجرا ہُوا تو مسلم لیگ کو اپنا اخبار مل گیا جو مسلم لیگ کے موقف کے لیے کلیتہً وقف تھا۔ لیکن اس کے باوجود اگر مسلم لیگ کے اقتدارِ اعلیٰ سے کوئی غلطی ہو جاتی تو حمید نظامی کا بے باک قلم کھل کر اس کی نشان دہی کرتا۔ اور جب پاکستان بن گیا تو "نوائے وقت" کا ایڈیٹر خوب سے خوب تر کی تلاش میں پاکستانی حکومت کو بھی اس کی غلط روش پر ٹوکتا اور للکارتا رہا۔

حمید نظامی مرحوم ایک صحافی کی حیثیت سے ہمارے سامنے ایک روشن اور مثالی کردار ہے۔ وہ اپنے اخبار کے ایڈیٹر اور مالک ہوتے ہوئے بھی اخبار کے عام کارکنوں سے علیحدہ نہیں رہتا تھا۔ وہ خود جس دیانت اور محنت سے کام کرتا تھا اسی دیانت اور محنت کی اپنے ساتھیوں سے توقع رکھتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی اختلافِ رائے کا بھی احترام کرتا تھا۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے نوائے وقت میں ایک خاندان، ایک گھرانہ اور ایک ٹیم کام کر رہی ہے اور اس کے سامنے قومی تعمیر اور قوم کو اَرفع و اعلیٰ مقام پر پہنچانے کا مقصد اور مشن ہے اور غلط راستوں پر چلنے والوں کو روکتا ٹوکتا اور ان کی غلطیوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایسے ہی اخبار ریاست کا چوتھا ستون اور ایسے ہی صحافی قوم کے معمار ہوتے ہیں۔ چناں چہ یہ عظیم معمار ہم سے بچھڑ گیا لیکن "نوائے وقت" میں وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

نفیس خلیلی

نام یاد نہیں اور پھر اُسے اُس کے نام سے اُس کے اہلِ خاندان کے علاوہ کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اسے زبان پہ نہ صرف قدرت حاصل تھی بلکہ اُس کی زبان بڑی موہنی اور رسیلی تھی۔ جب تقریر کرتا تو جی چاہتا کہ یہ بولتا ہی رہے سلسلۂ کلام ٹوٹنے نہ پائے۔ نفیس اُس کا تخلص تھا۔ اُس کی شاعری کا بھی عجیب انداز تھا۔ یہ شاعری تھی یا ساحری تھی یا کیا تھا یہ بات میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی۔ اُس نے کئی نظمیں لکھیں۔ ہر نظم ایک کتابچہ کی صورت میں شائع ہوئی۔ یہ نظم خود پڑھ کر اتنا مزا نہ آتا، جتنا اُسے اُس کی زبان سے بھرے مجمع میں اُس کے مخصوص ڈرامائی انداز اور اُس کی گمبھیر آواز میں سُن کر آتا۔ جب اُس کی کوئی نظم کتابچے کی صورت میں شائع ہو جاتی تو وہ اُس کے لیے اپنے دوستوں سے کہہ کر جلسے کا انتظام کرتا اور جب شہر میں لوگوں کو پتا چلتا کہ آج فلاں جلسہ گاہ میں نفیس خلیلی اپنی نظم سُنانے والا ہے تو ہزاروں لوگ جمع ہو جاتے۔ اُس کی یہ نظمیں ایسے تاریخی موضوعات پر ہوتیں جن میں وہ اپنے ڈرامائی کمالات دکھا سکتا تھا۔ پھر جب وہ نظم پڑھتا تو حاضرین پر سحر طاری ہو جاتا۔ اور جب وہ یہ نظم پڑھ چکتا تو جلسہ گاہ میں یہ اعلان کر دیا جاتا کہ آپ نفیس خلیلی کی یہ نظم کتابی صورت میں جلسہ گاہ سے باہر خرید سکتے ہیں۔ اور جب نفیس خلیلی جلسہ گاہ سے باہر نکلتا تو ساری کتابیں بِک چکی ہوتیں اور نفیس خلیلی کی دونوں جیبیں چونیوں سے بھری ہوتیں۔ پھر وہ ان کو نوٹوں اور کلدار سکوں میں بدلتا۔ پھر اس کی شام ڈیرہ دار اور گانے والی طوائفوں کے محلے کٹڑہ گھنیاں میں بسر ہوتی۔

نفیس کی ایک نظم "شمشاد کی چادر" بہت مشہور ہوئی۔ شمشاد کی چادر کیا ہے، پنجاب کے جاگیرداروں کی عیاشی کی داستان ہے۔

نفیس میرے پڑوس میں رہتا تھا۔ یوں تو اُس محلے میں فیض بھی رہتے تھے جن کی شاعری کی مَسیں ابھی بھیگ رہی تھیں لیکن اُس زمانے میں لوگ فیض کو ابھی اتنا نہیں جانتے تھے جتنا نفیس کو جانتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفیس ایک ڈراما تھا۔ اور اس کی شاعری بھی اس کی طرح ایک ڈراما تھی۔ اور اس طرح کے ڈرامے لوگوں کو بہت پسند آتے ہیں۔

نفیس نے رام اور سیتا کی داستان بھی نظم کی۔ اس نظم میں اس نے ہندی زبان کے دل نشین الفاظ جگہ جگہ جڑ دیے ہیں۔ اور پھر ہندوؤں کے ایک مجمع میں اس نے یہ نظم سنائی تو نہ صرف اس کی ساری کتابیں بک گئیں بلکہ اس پر ہزاروں نوٹ برسے۔ یہ نظم مدت تک نفیس کی آمدنی کا ذریعہ بنی رہی لیکن یہ آمدنی بھی دو چار راتوں کی رنگینیوں میں صرف ہو گئی۔

نفیس بڑے کلے ٹھلے کا آدمی تھا۔ نیلی آنکھیں، کشادہ پیشانی، چوڑا چکلا سینہ، لمبا قد، سر پر رومی ٹوپی جو اکثر اس کے ہاتھ میں رہتی۔ البتہ تقریر کرتے یا نظم سناتے وقت وہ ٹوپی کا پھندنا نچانے کے لیے اپنے سر پر رکھ لیتا۔

نفیس بولتا تو موتی رولتا۔ آواز میں کھرج۔ وہ الفاظ کا صحیح تلفظ کرتا۔ "کلانور" کے رہنے والا تھا۔ سنا ہے کہ اس کے والد لوہار تھے۔ پنجاب سے کہیں باہر نہیں نکلا تھا۔ شاید ایک آدھ بار دہلی ہو آئے تھے لیکن کہیں سے یہ پتا نہ چلتا کہ خالص پنجابی ہے۔

نفیس نے زبان سیکھنے میں ساری عمر گزار دی۔ وہ تقریر بھی اچھی کرتا۔ حضرت مولانا ظفر علی خان بھی زبان کے معاملے میں اسے مانتے تھے۔ چائے بہت پیتا تھا۔ ایک مرتبہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا نے چائے منگوائی اور یہ شعر کہا:

ہیں چائے کے رسیا نفیس خلیلی
پلا ہے انھیں ساغر سلسبیلی

نفیس نے جو کچھ سیکھا بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر سیکھا۔ وہ ریلوے کے اکاؤنٹس کے محکمے میں کلرک تھا۔ مشہور ادیب اور لاہور کے انگریزی اخبار "اسلام" کے ایڈیٹر خواجہ عبدالوحید بھی اسی قسم کے کسی محکمے میں ملازم تھے۔ نفیس خواجہ صاحب کے بڑے عقیدت مند تھا۔ تھوڑا بہت اس نے جو سیکھا خواجہ صاحب کی صحبت میں رہ کر سیکھا۔ کئی مرتبہ مجھے بھی نفیس خلیلی کے ساتھ خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ خواجہ صاحب میں بڑی گہرائی تھی۔ وہ آدمی کو دیکھ کر بات کرتے اور صرف اتنی بات کرتے جتنی اس کی سمجھ میں آتی۔ پنجاب میں علم و ادب کی جتنی تحریکیں ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ۱۵، ۲۰ برسوں میں چلی ہیں ان میں درپردہ خواجہ صاحب کا ہاتھ رہا۔ اسلامی تحریکوں میں بھی جہاں تک ان تحریکوں کا اسلامی نظریات سے تعلق رہا، خواجہ صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

جب پاکستان وجود میں آیا تو میں بھی یہاں ایک مہاجر کی حیثیت سے اٹھ آیا۔ اور جب میں نے لاہور میں نفیس کو تلاش کیا تو مجھے دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی۔ پتا چلا کہ وہ ریڈیو پاکستان میں اسٹاف آرٹسٹ ہے اور ڈراموں میں اداکاری کرتا ہے۔ نفیس بجھا بجھا سا

نظر آیا۔ اور پھر سُنا کہ ایک مرتبہ نفیس نے ایک مجمع میں اپنے اشعار سنائے جن میں ایک شعر یہ بھی تھا :

دیکھتا کیا ہے مرے مُنھ کی طرف
قائدِ اعظم کا پاکستان دیکھ !

اِس شعر پر اُس پر مقدمہ چلایا گیا اور یہ کہا گیا کہ شاعر نے اس شعر میں قائدِ اعظم اور پاکستان کی توہین کی ہے۔ لیکن جب یہ مقدمہ جسٹس کیانی کی عدالت میں پیش ہُوا تو جسٹس کیانی نے یہ کہہ کر اُسے بَری کر دیا کہ اِس شعر میں کسی کی توہین نہیں ہُوئی۔ اور پھر یہ خبر آئی کہ نفیس مَر گیا۔
نفیس میں بڑی صلاحیتیں تھیں لیکن اُس کی ساری صلاحیتیں اُسے موت کی طرف لے گیئں۔ مَیں اکثر سوچتا ہوں کہ نفیس اتنے دن بھی کیسے جی لیا !

آغا شورش کاشمیری

آغا شورش کاشمیری سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب شہید گنج کے انہدام کے سلسلے میں اُنھوں نے لاہور میں ایک بہت بڑے مجمع میں پہلی مرتبہ بے پناہ جوشیلی تقریر کی۔ اور اُس وقت لوگوں کو یہ اندازہ ہوا کہ امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کے بعد اُن کے رنگ میں تقریر کرنے والا ایک اور نوجوان پیدا ہوا ہے لیکن عبدالکریم سے میری ملاقات اُس وقت سے تھی جب یہ آغا شورش کاشمیری نہیں ہوا تھا۔ اور یہ تقریباً میرا ہی ہم عمر تھا اور میری طرح یہ بھی طالب علم تھا اور اسے بھی صحافت کا شوق تھا۔ فرق اس میں اور مجھ میں یہ تھا کہ میں صرف صحافی بننا چاہتا تھا اور عبدالکریم خطیب بھی بننا چاہتا تھا۔ احسان دانش اس کے استاد بھی تھے، اتالیق بھی تھے اور سرپرست بھی۔ میں عبدالکریم (آغا شورش کاشمیری) کو چھیڑنے کے لیے کہا کرتا تھا کہ تم بے اُستادے کے شاگرد ہو۔ وہ تمھیں کیا پڑھائیں گے اور تم کیا پڑھو گے لیکن مجھے اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ بے اُستادے کہ جن کی اُستاد خود اُن کی خداداد صلاحیت اور اُن کا ذوق و شوق ہوتا ہے، وہ اپنی ذاتی محنت سے آگے چل کے بڑے بڑے اُستادوں کے اُستاد بن جاتے ہیں۔ احسان دانش شورش مرحوم کو کیا پڑھاتے لکھاتے ہوں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ شورش میں جو شعری ذوق اور زبان دادب اور الفاظ کو برتنے کا جو سلیقہ اور اُن کے جملوں کی ساخت میں جو نشتر کی سی تیزی تھی، تو یہ سب احسان دانش کی صحبت کا نتیجہ اور اُن کا فیض تھا۔

عبدالکریم لڑکپن میں دُبلا پتلا تھا۔ گھر بار سے بے پروا رہتا۔ گردن ایک طرف مُڑی رہتی اور زبان بار بار منھ سے باہر نکال کر اُسے ایک طرف موڑ لیتا۔ پھر یہ سب عادتیں چھٹ گئیں۔ شورش کی تحریر و تقریر ہی میں چنگاریاں نہیں ہوتی تھیں وہ ویسے بھی بڑا جوشیلا تھا اور ذرا سی بات پہ بھڑک اُٹھتا۔ اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ بقول ماسٹر تارا سنگھ میری کرپان میں اتنی تیزی نہیں ہے جتنی شورش کی زبان میں ہے۔ لڑکپن کا زمانہ ویسے بھی ہوش سے زیادہ

جوش کا ہوتا ہے ۔ جیسے جیسے عمر گزرتی جاتی ہے، جوش میں کمی آجاتی ہے اور ہوش میں اضافہ ہوجاتا ہے لیکن شورش میں تو مرتے وقت تک ویسا ہی جوش تھا جیسا اُس کے لڑکپن میں تھا ۔ جب بھگت سنگھ کو گرفتار کرکے لاہور لایا گیا اور اس پر مقدمہ چلا تو جس دن اُسے پھانسی کی سزا دی جانے والی تھی تو میں اور شورش ایک ساتھ بھگت سنگھ کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے امرتسر سے روانہ ہوئے ۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ اس وقت ہم لوگ ایک حد تک سوشلسٹ بھی تھے ۔ اور کبھی کبھی جوش میں آ کر کمیونسٹ بھی ہو جاتے تھے ۔ ہم اور ہمارے جیسے بہت سے لوگ لاہور میں دُوسرے لوگوں سے یہ پوچھتے پھرتے تھے کہ بھگت سنگھ کی ارتھی کہاں سے اُٹھے گی ۔ لیکن شام کو ہمیں یہ بتایا گیا کہ راوی کے کنارے کہیں دُور فرنگی حکومت نے اس کی لاش جلا کر اس کی راکھ دریا میں بہا دی اور زمین کا وہ حصّہ کاٹ دیا گیا جہاں اسے جلایا گیا تھا۔ ہم روتے دھوتے اور انگریزوں کو کوستے کاٹتے اور گالیاں دیتے ہوئے اپنے گھر لوٹ آئے ۔

اور پھر جب سکھوں نے مسجد شہید گنج کا ایک منارہ گرا دیا اور پنجاب کے مسلمانوں کا غم و غصّہ بھڑک اُٹھا تو مولانا ظفر علی خاں نے مسلمانوں کی قیادت سنبھال لی ۔ اور چوں کہ احرارِ اسلام نے اس موقعے پر جب صوبائی انتخابات ہونے والے تھے، کوئی تحریک چلانی مصلحتً مناسب نہیں سمجھی تو مولانا ظفر علی خاں نے اس موقعے پر ایک نئی تحریک کی بنیاد رکھ دی جس کا نام "اتحادِ ملت یا نیلی پوشش" تحریک تھا ۔

چوں کہ بیشتر نامی گرامی لیڈر احرار میں تھے اس لیے مولانا نے سیّد جماعت علی شاہ اور مولانا محمد اسحاق مانسہروی اور ملک لال دین اور ملک برکت علی سے یہ درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کی نئی جماعت نیلی پوشش تحریک یا اتحادِ ملت میں شریک ہو جائیں ۔ چناں چہ یہ سارے بزرگ اس تحریک میں شامل ہو گئے اور مقصد اس تحریک کا مسجد کی واگزاری تھا ۔ اس تحریک میں جو نوجوان لیڈر شامل ہوئے اور جن کی سیاسی تربیت کا آغاز اسی تحریک سے ہُوا ، اُن میں آغا بیدار بخت خاں ، . . . . ، ابو سعید انور اور آغا شورش کاشمیری تھے ۔ شورش کو بڑا لیڈر بنانے میں احسان دانش کا ہاتھ تھا ۔ جب مولانا ظفر علی خاں ، مولانا اختر علی خاں اور اتحادِ ملت کے تمام لیڈر مختلف علاقوں میں نظر بند کر دیے گئے تو مَیں نے اور احسان دانش نے شورش کو غیرت دلائی اور کچھ لوگ جمع کر کے ان سے نعرے لگوائے اور انھی کی معیت میں شورش کو شہید گنج کی طرف روانہ کر دیا ۔ وہاں شورش نے بڑی پُر زور تقریر کی اور اُسے کرنال میں نظر بند کر دیا گیا اور یوں شورش کی لیڈری کا آغاز ہُوا اور میری ان کی آنکھوں نے یہ دیکھا کہ جس علاقے یا

بستی یا شہر میں شورش کی تقریر ہوتی تو لوگ دُور دُور سے ان کی تقریر سُننے آتے۔ شورش نے صحافت کا آغاز روزنامہ "سیاست" سے کیا۔ اُس وقت مقبول انور داؤدی اس اخبار کے ایڈیٹر تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہ ابھی بقیدِ حیات ہیں اور لاہور میں مقیم ہیں۔ اور پھر میں پنجاب سے چلا گیا اور جب واپس آیا تو مولانا ظفر علی خاں بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ شاہ جی پر بھی بڑھاپا طاری ہو گیا تھا لیکن آغا شورش کاشمیری کی تقریروں میں ان دونوں کی تقریروں کا رنگ تھا۔ شورش کی تقریر سُن کر مولانا ظفر علی خان اور شاہ جی کی یاد تازہ ہو جاتی۔

شورش جذبات کا ایک طوفان تھا۔ ایک ایسا دریا تھا جس پر بند باندھنا مشکل تھا۔ شورش ہر حکومت سے لڑتا بھڑتا۔ کبھی وہ جیل سے باہر ہوتا اور کبھی وہ جیل کے اندر ہوتا۔ ایوب خان کے عہدِ حکومت میں اُس نے عدالت کے کمرے میں اپنی بریّت پیش کرنے کی بجائے ایوب حکومت پر بڑی سخت تنقید کی۔ پھر اسے کراچی لایا گیا اور یہاں اس نے بھوک ہڑتال کی اور اُسے سول اسپتال میں داخل کیا گیا۔ یہاں بھی وہ گرجتا اور برستا رہا۔ اور آخر حکومت ہار گئی اور شورش کو رہا کر دیا گیا۔ پھر جب ایوب خان کی حکومت کا زوال شروع ہوا اور سابق ایئر مارشل اصغر خان نے ایوب حکومت کے خلاف تحریک چلائی اور بھٹو بھی میدان میں اُتر آیا تو شورش خاموشی سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔ اور جب بھٹو کی پارٹی نے مُلک کا اقتدار سنبھال لیا تو اس کے باوجود کہ اس آہوئے رَم خوردہ کو رام کرنے کے لیے بے پناہ جال پھیلائے گئے لیکن بقول میرؔ: اس آہوئے رَم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل ہے

یہ برابر بھٹو حکومت کے خلاف آواز اُٹھاتا رہا۔ چناں چہ اُسے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ وہاں جب یہ بیمار پڑا تو علاج معالجے کے لیے اُسے میو اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ مَیں نے اُسے بہت سمجھایا کہ اگر اپنے لیے نہیں تو اپنے بچوّں کے لیے تم اپنی زبان بند کر لو۔ اور ہم سب کوشش کر کے تمہیں قید سے نکلوا لیتے ہیں، تو شورش سخت برہم ہوا۔ بہر حال جب وہ بہت بیمار ہُوا تو اسے آزاد کر دیا گیا۔ لیکن اب بیماری نے اُسے گھیر لیا تھا اور ایک دِن یہ خبر آئی کہ شورش ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ شورش کے مرنے سے خطابت کا ایک پورا عہد ختم ہو گیا۔

غلام عبّاس

غلام عبّاس دو چار مُلاقاتوں میں ایسے کھُل جاتے ہیں کہ یُوں لگتا ہے جیسے اُن سے مُدّت کی شناسائی ہے اور جیسے ہم اور یہ ساتھ ساتھ چلے بڑھے ہیں۔ کبھی تو غلام عبّاس خود اپنے افسانوں کا ایک کردار معلوم ہوتے ہیں اور کبھی یہ خود اپنے کرداروں کے تماشائی نظر آتے ہیں۔ منٹو اور عبّاس میں یہ فرق ہے کہ منٹو اپنے کرداروں میں نظر آتا ہے اور عبّاس اپنے پورے افسانے کی صورت میں آپ کے سامنے آتے ہیں۔ میں عبّاس صاحب کو اُس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ بچّوں کے اخبار "پھُول" کے ایڈیٹر تھے۔ یہ پھول بھی عجیب ادارہ تھا۔ اگر روزنامہ زمیندار صحافت کی یونیورسٹی تھا تو پھُول نرسری تھا۔ اور شمس العلماء سیّد ممتاز علی اس ہفت روزہ اخبار کے کرتا دھرتا تھے۔ عربی فارسی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ شمس العلماء مولوی ممتاز علی اور پھُول کے بارے میں غلام عبّاس لکھتے ہیں:

"پھُول ایک اخبار ہی نہیں تھا بلکہ ایک ادارہ بھی تھا جو ایک طرف تو مُلک کے نونہالوں کے دلوں میں علم کی لگن لگاتا، ان کے اخلاق سنوارتا، اُن میں ادب کا ذوق پیدا کرتا اور دُوسری طرف مُلک کے ادیبوں کے ذہنوں کی تربیت کرتا اور انھیں آسان اور سلیس زبان لکھنا سکھاتا۔ جو ادیب اس کا ایڈیٹر مقرر ہوتا، اگر وہ خام ہوتا تو اسے آموختہ بھُلا کرنے سرے سے اُردو لکھنے کے قواعد و ضوابط سیکھنے پڑتے۔

مولوی ممتاز علی اس درس گاہ کے معلّم تھے۔ وہ بہت روشن خیال بزرگ تھے۔ وہ عربی فارسی کے بڑے عالم تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب پر اُن کی گہری نظر تھی۔ وہ کئی دینی اور علمی و ادبی کتابوں کے مصنّف تھے۔ وہ بہت سلیس زبان میں لکھتے مگر کمال یہ کہ سادگی کے باوجود ان کی تحریر کا عالمانہ وقار باقی رہتا۔"

پھُول کے ایڈیٹر حفیظؔ جالندھری، نشترؔ جالندھری، مولیٰنا عبدالمجید سالک، وجاہت حسین جھنجھانوی اور پنڈت ہری چند اخترؔ رہ چکے ہیں۔ اور اسی نرسری سے غلام عبّاس بھی منسلک تھے۔ غلام عبّاس صاحب کی آنکھیں بولتی ہیں اور کان سُنتے ہیں۔ وہ اپنی زبان سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ ہر گھر کے ماحول میں وہ گھُل مل کر گھر کا

ایک فرد بن جاتے ہیں۔ انھیں ہر ماحول میں بے شمار افسانوں کے جال پھیلے ہوئے اور ان میں بے شمار جیتے جاگتے کردار نظر آتے ہیں۔ وہ کردار تراشتے ہیں، کردار بناتے نہیں ہیں۔ آدمی شریف ہیں لہٰذا طوائف کے کوٹھے پر بھی وہ اپنی شرافت سے کام لیتے ہیں۔ ان کا افسانہ آٹومیٹک قسم کا افسانہ ہوتا ہے۔

غلام عباس نے بڑی دُنیا دیکھی ہے۔ مُلک مُلک گھومے پھرے ہیں۔ ہر معاشرے میں ڈوب کر نکلے ہیں۔ معاشرے کے ہر کردار کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اُن کی شہرت کا آغاز "جزیرہ سخن وراں" سے ہوا لیکن "آنندی" نے انھیں غیر فانی بنا دیا۔ غلام عباس اپنے افسانوں میں نفسیاتی حقائق پر خاص توجہ دیتے تھے۔ وہ اپنے نظریات اپنے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتے۔ پھر ان کا انداز ناصح کا ہے نہ مصلح کا اور نہ نقّاد کا۔ وہ اپنے افسانوں پر فیصلہ کرنے کا حق اپنے قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ان کے مزاج کی طرح بڑا دھیما پن ہے لیکن اس دھیمے پن سے قاری کی طبیعت اُکتاتی نہیں ہے بلکہ اس کی دِلچسپی کا سلسلہ برابر قائم رہتا ہے۔

غلام عبّاس سے یُوں تو کھُل کر میری مُلاقاتیں اُس وقت ہُوئیں جب مَیں محکمۂ نشریات میں ملازم ہُوا اور وہ بی بی سی سے آئے تھے۔ ن م راشد مرحوم اُن کے بڑے گہرے دوست تھے اور میری مُلاقات بھی اُن سے راشد صاحب کے مکان پر ہُوئی تھی۔ پھر برابر مُلاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ "آہنگ" اور پاکستان کالنگ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ عباس صاحب کو مَیں نے ہر دَور میں ایک جیسا پایا، وہی کم آمیزی، وہی سادگی، وہی بے تکلفی۔ یہ اُس زمانے میں انٹلی جینس اسکول کے ایک ڈھول نما مکان میں رہا کرتے تھے اور ایسے ہی مکان میں ن م راشد صاحب بھی رہتے تھے۔

غلام عباس پطرس بخاری کے بڑے گہرے دوستوں میں تھے۔ آل اِنڈیا ریڈیو میں وہ افسر اور یہ ماتحت ہو گئے تھے۔ عباس صاحب نے ادب کا فاصلہ برابر قائم رکھا البتہ بخاری صاحب اُن سے بہت بے تکلف تھے اور اِن سے دِل کھول کر دِل کی باتیں کرتے۔ بخاری صاحب ہی اُنھیں ریڈیو میں لائے اور وہ برابر کوششیں کرتے رہے کہ ان کے عہدے میں بھی ترقی ہو لیکن ڈگری کا نہ ہونا مانع ہُوا۔ اگرچہ پطرس بخاری نے اوپر والوں کو بہت سمجھایا کہ ان کی قابلیت خود بہت بڑی ڈگری ہے، لیکن ڈگریوں کی بیساکھیوں پر چلنے والے ایسی باتیں کب سُنتے اور مانتے ہیں۔ جب تک پطرس بخاری اقوامِ متحدہ میں رہے، ان کے خطوط عباس صاحب کے پاس برابر آیا کرتے تھے۔

عباس صاحب نے پطرس بخاری کا ایک خط مجھے دکھایا جس میں اُنھوں نے یہ لکھا تھا کہ مغربی مُلکوں میں لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ جہاں منٹو برِصغیر کا بڑا افسانہ نگار تھا وہاں وہ بڑا شاعر بھی تھا۔ مَیں نے اُنھیں بہت سمجھایا کہ ایسا نہیں ہے۔ شاعری سے اُس کا دُور کا واسطہ بھی نہیں تھا لیکن یہ لوگ برابر اصرار کیے جا رہے ہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس غلط فہمی کو دُور کیا جائے۔ مَیں نے عرض کیا کہ مغربی ادیب ٹھیک کہتے

ہیں۔ ایک زمانے میں کئی طویل و مختصر افسانوی نظمیں جو روسی اور فرانسیسی نظموں کا ترجمہ ہیں، اردو کے ادبی رسالوں میں منٹو کے نام سے شائع ہو چکی ہیں اور ان نظموں کا اردو نظموں میں ترجمہ میرے سامنے مرحوم آغا خلش کاشمیری نے کیا تھا۔

پطرس غلام عباس کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"ہمارے گرد و پیش کئی ایسی دل چسپیاں تھیں جو غلام عباس کے بغیر آج تک نظر نہیں آئی تھیں اور جن کی بدولت اب زندگی کے بے کیف گوشے بھی رنگین نظر آتے ہیں۔"

راشد صاحب کی رائے بھی سنیے:

"غلام عباس غالباً وہ واحد افسانہ نگار ہے جس کا فن انسانی زندگی کے رنگا رنگ مسائل کا احاطہ کرتا ہے جیسے زندگی سے گہری محبت ہے۔ اتنی گہری محبت کہ وہ نہ اس کے بخیے اُدھیڑتا ہے (منٹو کی طرح) نہ اُس کو ننگا کرتا ہے (عسکری کی طرح) نہ اپنی انا سے مرعوب کرتا ہے (عزیز احمد کی طرح) بلکہ زندگی کو اپنا محرمِ راز جانتا ہے۔ اس سے سرگوشیاں کرتا ہے اور کی سرگوشیاں سنتا ہے۔"

غلام عباس ۱۹۰۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال ہو گیا تو گھر بار کا بار ان پر پڑ گیا۔ معمولی حیثیت کی نوکریاں ملتی تھیں جو وہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ افسانہ نگاری کا کاروبار تو پہلے ہی شروع کر چکے تھے: "نیرنگِ خیال" میں اُن کا پہلا افسانہ چھپا تو انھیں بیس روپے معاوضے کے طور پر ملے۔ سوچا چلو معمولی نوکری سے تو قلم کی مزدوری میں آبرو رہ جائے گی۔ پھر حکیم احمد شجاع مرحوم کے رسالے میں مغربی افسانوں کے ترجمے اور کچھ طبع زاد افسانے چھپے جو بہت مقبول ہوئے۔ ان کی تحریروں میں جو نرالاپن اور جو انفرادیت تھی، اُس نے انھیں آگے بڑھایا۔ مرزا محمد سعید صاحب کا غلام عباس سے دلی تعلق تھا۔ خوب ملاقاتیں رہتیں۔ وہ ان سے شفقت سے پیش آتے۔ یہ اپنی نیاز مندی سے ان کی صحبت سے بہت کچھ حاصل کر لیتے۔ ایسے بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنا سیکڑوں کتب خانوں سے فیض یاب ہونے سے بہتر ہے کیوں کہ مطالعہ کے علاوہ ان کی نظر بڑا کام کر جاتی ہے۔ اور پھر مرزا صاحب مغربی اور مشرقی ادب کے سمندر کھنگال چکے تھے اور ان کا شمار جدید ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کی فہرست میں سرِفہرست آتا ہے۔ وہ پریم چند کے پیش رو تھے۔ مرزا صاحب کی میراث کا ایک حصّہ غلام عباس کو بھی ملا۔

غلام عباس موسیقی میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ انھوں نے باقاعدہ موسیقی سیکھی ہے اور بڑا ریاض کیا ہے۔ وہ وائلن بجانے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں اور ایک زمانہ تو ایسا تھا کہ انھیں وائلن بجانے کی اچھی تنخواہ پہ ملازمت مل رہی تھی۔ اگر غلام عباس افسانے نہ لکھتے تو وہ برصغیر کے چوٹی کے وائلن نواز ہوتے۔ جب وہ لندن میں تھے تو انھوں نے باقاعدہ مغربی موسیقی بھی سیکھی۔ وہ خان صاحب عبدالوحید خان کے بڑے چہیتے شاگرد تھے

غلام عباس کا پہلا مجموعہ آنندی ہے۔ دُوسرا جاڑے کی چاندنی اور تیسرا کن رس اور چوتھا مجموعہ زیرِ طبع ہے جس کا نام "خوان نعیما" ہے۔ غلام عباس کے یہاں افسانہ اسی طرح جنم لیتا ہے جس طرح بچّہ پیدا ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بچّے کے پیدا ہونے کی ایک مُدّت مقرر ہوتی ہے غلام عباس کے یہاں یہ مدت مقرر نہیں ہے۔ بچّہ جب پُورا ہو جاتا ہے تو خود ولادت پا لیتا ہے۔ دُوسرے افسانہ نگاروں کی طرح اُن کے یہاں سیزیرین بچّے پیدا نہیں ہوتے یعنی پیٹ کاٹ کے نکالے نہیں جاتے، قدرتی ولادت ہوتی ہے۔ گویا وہ فی البدیہہ قسم کے افسانہ نگار نہیں ہیں۔ وہ افسانے کا پلاٹ بنا کر افسانہ نہیں لکھتے۔ افسانہ خود اپنا پلاٹ اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ جب وہ افسانہ لکھنے لگتے ہیں تو انھیں صرف الفاظ اس کے تانے بانے میں بھرنے پڑتے ہیں۔ اور الفاظ کے استعمال میں وہ بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ از دل خیزد بر دل ریزد والی بات ہوتی ہے۔

ایک دن اصغر بٹ صاحب نے ایک صاحب سے میری مُلاقات کرائی (ویسے وہ میرے بھی دوست تھے) اور کہا کہ دیکھو یہ غلام عباس کی ایک کہانی ہے جس کا نام "منڈی" ہے۔ تمھیں اس کے مکالمے لکھنے ہیں۔ ان دُوسرے صاحب نے کہا۔ میری جیب میں اس وقت صرف پچاس روپے ہیں۔ یہ قبول کر لیجیے اور میں دو چار دن میں آپ کو ایک معقول رقم دے جاؤں گا۔ دوسرے دن میں نے انھیں بیس سین لکھ کر دیے۔ سیٹ لگ چکے تھے اور مکالمہ نویس (نہ جانے وہ کون بزرگ تھے) اس کام سے ہاتھ اٹھا چکے تھے۔ تیسرے دن میں نے بیس سین اور لکھ کر دیے۔ لیکن چوتھے دن میں نے معاوضے کا تقاضا کیا۔ لیکن وہ صاحب پلٹ کر نہیں آئے۔ یہ بھی اچھا ہُوا کہ عباس صاحب اپنا معاوضہ لے چکے تھے۔ نہ جانے منڈی کے مکالمے کس طرح مکمل ہُوئے۔ مشہور اداکارہ خورشید اس فلم کو ڈائرکٹ کر رہی تھیں۔ پھر یہ سُنا کہ یہ کھیل فلاپ ہو گیا جس نے دیکھا اُس نے سر پیٹا۔ کہانی بہت اچھی تھی لیکن خالی کہانی کیا کر لیتی [1]

---

[1] یہ خاکہ غلام عباس کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

سراج الدّین ظفؔر

مَیں نے ظفؔر کا لڑکپن بھی دیکھا، جوانی بھی اور بڑھاپا بھی۔ وہ بڑھاپے میں بھی جوان رہا۔ اُس نے اپنی ساری زندگی عیش و عشرت میں گزاری۔ اُس نے دُکھ کی کبھی شکل نہیں دیکھی، لیکن جب اُس نے بڑھاپے میں قدم رکھا تو اُس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ گیا۔ اُس کی جوان بیٹی اور داماد ایک ہوائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ اور یہ ظفؔر کی زندگی میں پہلا اور آخری دُکھ تھا، پھر ظفؔر ایسا گرا کہ اُٹھ نہ سکا۔

ظفؔر کے لڑکپن میں اُس کے والد انتقال کر گئے۔ پھر اس کے والدؒ نے اُسے باپ بن کر پالا۔ ظفؔر کی جوانی کیسی جوانی تھی، یہ ایک الگ داستان ہے۔ ظفؔر نہ جانے کتنے افسانوں اور کتنی داستانوں کا کردار ہے۔ ظفؔر کا قد لانبا تھا۔ رنگ میدہ و شہاب۔ ناک ستواں۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ سر کے بیچ میں مانگ نکالتا۔ کبھی سوٹ پہنتا اور کبھی کبھی شیروانی۔

ایف سی کالج میں پڑھتا تھا۔ حفیظ ہوشیارپوری اور ڈاکٹر یاورؔ عباس اُس کے ہم جماعت تھے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد اُس نے ہوائی جہاز چلانا سیکھا جس کے اخراجات اُس کی والدہ ـــ مشہور افسانہ نگار مسز عبدالقادر نے برداشت کیے۔ ظفؔر کے اور بھائی بھی تھے لیکن اس کی حیثیت ان میں ایک شہزادے کی تھی۔

ظفؔر سے میری مُلاقات روزنامہ سیاست کے دفتر میں ہُوئی۔ مقبول انؔور داؤدی اس اخبار کے ایڈیٹر اور مالک اس کے سیّد حبیب تھے۔ سیّد عنایتؔ، سیّد حبیبؔ کے بھائی تھے۔ سیّد عنایتؔ کے صاحب زادے سیّد عطا اللّٰہ نے اُس زمانے میں ایک قلمی پرچہ "اداکار" نکالنا شروع کیا تھا۔ ظفؔر شروع شروع میں رُباعی لکھتے تھے، کبھی کبھار غزل بھی کہہ لیتے۔ یہ تحت اللفظ پڑھتے اور خوب پڑھتے۔ یہ سنیچر کی شام میرے اور مقبول انؔور داؤدی کے ساتھ امرتسر چلے آتے اور میرے یہاں ٹھہرتے۔ ظفؔر اُس زمانے میں شوقیہ پی لیتے تھے۔ ابھی پینے کی عادت نہیں پڑی تھی۔ ظفؔر کی سیاسی نظمیں سیاست کے سرورق پر شائع ہوتیں جو بہت پسند کی جاتیں۔ ظفؔر انتہائی جذباتی آدمی اور ٹوٹ کر محبت کرنے والے تھے۔ لاہوری دروازے کے باہر کچھ کیبن تھے۔ انھی کے قریب ایک بڑے سے کیبن میں اردو بک اسٹال تھا جس کے

مالک نیرنگِ خیال کے ایڈیٹر حکیم یوسف حسن صاحب کے بھائی یعسوب الحسن تھے۔ اُن سے یہ اسٹال نہ چل سکا تو وہ اسے سراج الدین ظفر کے ہاتھ فروخت کر گئے۔

ظفر کے بارے میں میں نے یہ عرض کیا تھا کہ وہ ایک افسانوی کردار تھے۔ ظفر کے دوست اُن پر جان نچھاور کرتے۔ ایک مرتبہ ظفر امرتسر آئے اور مجھے اور اپنے دو اور دوستوں کو لے کر ایک ایسے مندر کے قریب پہنچے جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہم مندر کے باہر ٹہلنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد اندر سے ایک صاحب نکلے جو پجاری معلوم ہوتے تھے۔ دھوتی پیچھے سے اوپر اُڑسی ہوئی۔ سر پر بڑی سی چوٹی پاؤں میں کھڑاؤں۔ وہ ہماری طرف بڑھے اور کہا۔ آپ میں سے ظفر صاحب کون ہیں؟ ظفر نے کہا۔ میں ظفر ہوں اور یہ میرے ساتھی ہیں۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گیا۔ ہم مندر میں سے گزرتے ہوئے ایک زینہ طے کر کے ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے تو وہاں ایک صاحب ہمارے انتظار میں کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں سونے کے کڑے تھے۔ سر منڈا تھا۔ سر پر ایک بڑی سی چوٹی تھی خاصے خوش شکل تھے۔ اُجلی دھوتی باندھے اور اُجلا سلک کا کرتا پہنے تھے۔ کرتے میں سونے کے بٹن لگے تھے۔ اُنھوں نے ہاتھ جوڑ کر ہم سب کو نمستے کہا اور ظفر سے گلے ملے۔ پھر ہم سب بیٹھ گئے۔ چاندنی کا فرش تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر کچھ خوش شکل اور خوش آواز لڑکیاں آئیں اور اُنھوں نے سازوں پر نیم کلاسیکی گیت اور غزلیں سنائیں اور آخر میں مہاراج نے (جنھیں سب مہاراج ہی کہتے تھے) جو اس مندر کے بڑے پروہت اور ہمارے میزبان تھے ہمیں کچھ گیت سنائے۔ اس کے بعد دسترخوان بچھایا گیا اور کھانے اتارے گئے۔ شامی کباب، سیخ کے کباب، بریانی، قورمہ۔ مہاراج نے کھانے کے دوران کہا "حضور! آپ کی محبت میں ماتاجی کو حلال کروا ڈالا ہے۔ یہ گوشت اور کباب اُنھی کے ہیں۔ ایسا مزے دار کھانا تھا کہ آج تک اُس کی لذت کی یاد باقی ہے۔ کھانے کے بعد شراب آئی اور ساتھ ساتھ خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا تھا یا میں الف لیلہ کے زمانے کے بغداد میں پہنچ گیا تھا۔

پھر کچھ دنوں کے بعد ظفر کی شادی فیروز سنز کے مالک مولوی فیروزالدین کی صاحب زادی سے ہو گئی۔ ظفر کے سسرال والوں نے اُسے رہنے کے لیے ایک مکان دے دیا تھا۔ میں حسبِ دستور سنیچر کی شام کو اپنے کاموں سے فارغ ہو کر ظفر کے مکان میں ٹھہرتا اور صبح ظفر اور میں ایک دن کے لیے امرتسر چلے آتے۔ ظفر کا یہ مکان چھوٹا سا تھا۔ کبھی کبھی یہاں ایک چھوٹا سا مشاعرہ بھی ہو جاتا۔ میں نے پہلی مرتبہ مولانا چراغ حسن حسرت سے ان کی یہ غزل "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" انھی کی زبانی ترنم سے ظفر کے اسی مکان میں سنی تھی۔ مولانا کی آواز بہت اچھی تھی۔ ہلکی اور سُریلی۔

شادی کے بعد ظفر ایئر فورس میں ملازم ہو گئے۔ اور یہاں وہ خوب پینے لگے۔ اور پھر انھوں نے

ایر فورس کی ملازمت چھوڑ دی یا وہ ریٹائر ہو گئے۔ اب انھیں جب دیکھو وہ نشے میں ہوتے۔ انھوں نے کراچی میں ایک مکان کرائے پر لے لیا اور وکالت شروع کر دی۔ ظفر کی شاعری میں سرمستی تھی۔ حافظ کا رنگ تھا۔ کیا مزے کا شاعر اور کیا مزے کی شاعری۔ ظفر اپنی غزل کی طرح حسین اور دل کش۔ اُس کی ساری رعنائیاں اُس کی غزل میں سمٹ آئی ہیں۔ ظفر کی کوئی غزل اٹھالو اور سب کے سامنے پڑھو جس نے ظفر کو قریب سے دیکھا ہے' وہ غزل سنتے ہی پکار اٹھے گا کہ یہ ظفر کی غزل ہے۔ اور غزل خود پکار پکار کر اپنے شاعر کا نام بتاتی ہے۔ کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ فیروز سنز نے اپنے بندر روڈ کے شو رُوم کا ظفر کو مینجر مقرر کر دیا ہے۔ اُسی شو رُوم کی اوپر کی منزل میں ظفر کے بیوی بچے آکر رہنے لگے۔

نہ جانے ظفر پر کس کا اثر ہوا یا وہ کیا حالات ہوئے کہ ظفر نے شراب میں کمی کر دی۔ اور پھر اُس نے اُسے بالکل ترک کر دیا۔ لیکن اب ظفر وہ ظفر نہیں تھا۔ وہ بالکل بدل گیا تھا۔ اُس نے رندی سے اور رندی نے اُس سے توبہ کر لی۔ اُس کے دوستوں میں اور اُس میں فاصلہ پیدا ہو گیا۔ اب وہ اپنے بچوں کے لیے جینے لگا۔ ظفر انگریزی زبان میں بھی نظمیں لکھتا۔ اُس کی نظمیں امریکا اور انگلستان کے رسالوں میں شائع ہوئیں۔ اُسے تصوف سے بھی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ نعت لکھتا، اسے پڑھتا اور روتا۔ وہ علم نجوم کا بھی گہرا مطالعہ کرتا۔ دوستوں کی جنم پتریاں بناتا، مستقبل کے حالات بتاتا۔

وہ اپنی جوان بیٹی اور داماد کے مرنے کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور اردو ادب اور شاعری کا یہ درخشاں تارا ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔ اور یوں ایک رنگین افسانہ ختم ہو گیا۔

نہالؔ سیوہاروی

نہالؔ سیوہاروی بھی عجب کینڈے کے آدمی تھے۔ کچھ تو سر کے بال بکھرے اور کچھ خود بکھرے بکھرے میلے چیکٹ کپڑے۔ تنگ موری کا پاجامہ۔ ازار بند لٹکا ہوا تن پر شیروانی۔ پاؤں میں پمپ جس کا رنگ پہچاننا مشکل تھا۔ آنکھیں روشن اور ان میں بچوں ایسی معصوم شرارتیں۔ اکہرا بدن۔ شعر پڑھتے تو یوں لگتا کہ جیسے ڈرا رہے ہیں۔

میں ریڈیو پاکستان میں مشاعروں کا انچارج تھا اور نہالؔ صاحب کو ہفتے میں ایک آدھ بار ضرور بلواتا۔ ویسے یہ نظم کے شاعر تھے لیکن غزل بھی کہتے اور ایسی کہتے کہ لطف آجاتا۔ نہالؔ صاحب کا ایک شعر اکثر یاد آتا ہے:

زمینِ کوچۂ جاناں سے آ رہی ہے صدا
بلندیاں نہیں مخصوص آسماں کے لیے

ایک مرتبہ مجھے کسی صاحب نے اپنے خط میں یہ لکھا کہ جب کسی مشاعرے میں نہالؔ صاحب شرکت فرمایا کریں تو للّٰہ ہمیں پہلے سے بتا دیا کیجیے تاکہ ہم اپنے بچوں کو مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے سُلا دیا کریں یا اُس وقت ریڈیو بند کر دیا کریں کیوں کہ ہمارے بچے ان کی آواز سُن کر ڈر جاتے ہیں اور ہم اپنے بچوں سے، جب وہ شرارت کرتے ہیں، یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر تم نے پھر شرارت کی تو ہم ریڈیو والوں سے کہہ کر نہالؔ صاحب کا کلام سُنوا دیں گے انھیں کی آواز میں۔

خیر یہ تو اُن کا شعر پڑھنے کا انداز تھا لیکن ان کا ہر شعر دل میں ترازو ہو جاتا۔ بات یہ ہے کہ بے چارے نہالؔ صاحب سستی شہرت کے لیے شاعری نہیں کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ موشگافیوں کی بھرمار نہ ہوتی اور نہ ان کی شاعری مشاعرے لوٹنے والی شاعری تھی۔ نہ یہ شاعری نعرہ خیز ہوتی تھی۔ ایسی شاعری عوام میں تو بے شک مقبول نہ ہوئی لیکن ناقدانِ ادب اور تاریخ ادب کے مورخین جب ٹھنڈے دل سے ایسے شاعروں کی شاعری پر غور کرتے ہیں تو وہ ان کی حیثیت اور مقام کا صحیح تعین کر لیتے ہیں بشرطیکہ وہ غالبؔ کے طرف داروں میں نہ ہوں۔ یہاں نہالؔ صاحب کے

دو شعر اور یاد آگئے ؎

فطرت پیکار آدم رہ نہیں سکتی خموش
دوستوں سے جنگ ہوگی گر عدو باقی نہیں

سیکڑوں عالم آشوب نظر سے گزرے
ہم بھی اس عالم ہستی ہیں کدھر سے گزرے

ایک مرتبہ بخاری صاحب (سابق ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان) نے نہال صاحب سے کہا کہ تم ریلوے کے اکاؤنٹنٹس کے محکمے میں کیوں پڑے ہوئے ہو۔ تم کہاں اور یہ دردِ سر کہاں؟ پھر تن خواہ بھی تم کو بہت کم ملتی ہے۔ اتنے کم پیسوں میں تمھاری گزر بسر کیسے ہوتی ہوگی؟ کل صبح میرے دفتر میں چلے آؤ۔ میں تمھیں ریڈیو پاکستان میں پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ پر سٹاف آرٹسٹ کروا دیتا ہوں۔ یہ کام تمھارے ذوق کا ہوگا۔ نہال صاحب نے کہا۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن آسائشوں میں شاعری کہاں ہوتی ہے۔ جب تک جگر خون نہیں ہوتا تو شعر نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ بخاری صاحب نے نہال صاحب سے ایک پہلوان نما شاعر کا تعارف کرایا تخلص بھی ان کا ایسا ہی تھا۔ یہ صاحب فردوسی کے شاہ نامے پر تبصرہ فرمانے لگے۔ بخاری صاحب نے نہال صاحب سے پوچھا: کیا آپ ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں؟" تو نہال صاحب نے شاعر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔" کیا آپ پہلوانی کرتے ہیں؟" بخاری صاحب نے مسکرا کر کہا۔" نہیں بھئی یہ شاعر ہیں۔" نہال صاحب نے کہا۔" تو سنیے جناب۔ ایک عمر تو چاہیے فردوسی کا شاہ نامہ پڑھنے کے لیے اور پھر ایک اور عمر چاہیے اس کی شاعری کو سمجھنے کے لیے اور پھر اگر تیسری عمر ملے تو کوئی اس پر تبصرہ کرے۔ اپنی تو پہلی ہی عمر میں کچھ دن اور باقی رہ گئے ہیں۔ لہٰذا ہم کیا عرض کر سکتے ہیں؟"

شاہ نور خاں اختر کے گھر وہ ہر چھٹی کے دن صبح ہی صبح آجاتے اور میں بھی وہاں چلا آتا اور خوب مزے مزے کی باتیں ہوتیں۔ وہ بات اس طرح کیا کرتے تھے کہ" وہ جو ہم ہیں تو —— " ہم نے ان سے یہ کہا کہ —— " اور اس کے بعد بات شروع کر دیتے۔ ایک زمانے میں وہ ن م راشد کے بہت خلاف ہو گئے تھے۔ کہنے لگے:" شاہ نور سنتے ہو۔ وہ جی پچھلے دنوں وہ جو ہم ہیں تو ہم لاہور گئے تھے۔ کراچی سے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہوئے۔ ایک صاحب مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ادھر ادھر کی بے تکی باتیں کر رہے تھے۔ ان کی زبان تھی کہ تالو سے لگتی ہی نہیں تھی میں نے انھیں اپنی طرف مخاطب کر کے کہا:" قبلہ کیا آپ اسکول ماسٹر ہیں؟" کہنے لگے۔" جی ہاں۔ لیکن آپ نے یہ کیسے جانا؟" میں نے کہا۔" آپ کی باتوں سے اندازہ ہوا۔" وہ پھر شروع ہو گئے تو میں نے پوچھا۔" قبلہ کیا

آپ پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں؟" فرمایا۔ "ہاں میں پرائمری اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں۔ لیکن یہ آپ نے کیسے جان لیا؟" میں نے کہا۔ "آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے۔" اور پھر انھوں نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا تو میں نے کہا۔ "کیا آپ ن م راشد کے والد ہیں؟" فرمایا۔ "آپ تو حد کرتے ہیں۔ جی ہاں میں اُس کا والد ہوں۔ لیکن آپ کو یہ کیسے پتا چلا؟" میں نے کہا۔ "اسے آپ ہی کا بیٹا ہونا چاہیے تھا۔"

ایک مرتبہ ہم شاہ نور خان کے گھر سے جو باہر نکلے تو ہمیں پاکستان چوک کی لائبریری میں کچھ لوگ نظر آئے۔ نہال صاحب نے کہا کہ صورت شکل سے یہ لوگ شاعر معلوم ہوتے ہیں اور شاید کسی مشاعرے کی فکر میں ہیں۔ چلو شاہ نور خان تھوڑا سا وقت یہاں بھی برباد کرلیں۔ شاید ایک آدھ اچھا شعر سننے کو مل جائے۔

اور جب نہال صاحب کے ساتھ ہم لائبریری میں داخل ہوئے تو شاعروں نے انھیں گھیر لیا۔ اور ایک صاحب نے اعلان کر دیا۔ آج کے مشاعرے کے صدر جناب نہال سیوہاروی ہوں گے۔ نہال صاحب نے کہا۔ دیکھیے صاحب۔ وہ جو ہم جو ہیں تو آپ لوگوں سے شعر سننے آئے ہیں۔ ہم کوئی چغد نہیں ہیں کہ مشاعرہ کی صدارت کریں۔ چنانچہ شاعروں میں کوئی شاعر چغد بننے پر آمادہ نہ ہوا۔ لہٰذا مشاعرہ بغیر صدارت کے ہوا۔

ایک مرتبہ میں نے نہال صاحب کو ایک مصرع سنایا اور کہا کہ اس زمین میں مجھے پوری غزل چاہیے۔ کہنے لگے "مصرعے کو ایک کاغذ پر لکھ کر پانچ روپے کے نوٹ کے ساتھ سیماب صاحب کی شیروانی کی اوپر کی جیب میں ڈال دو اور دوسری جیب میں سے پوری غزل نکال لو۔ ایسے کام وہی کر سکتے ہیں۔"

ایک مرتبہ کہنے لگے کہ مجھے دو باتوں پر حیرت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ پنجاب میں ظفر علی خان کیسے پیدا ہو گئے۔ اور دوسری یہ کہ غالب نے یہ مصرع کیوں کہا:

چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اللہ بخشے بڑے مرنجاں مرنج انسان تھے۔

ڈاکٹر رشید جہاں

ڈاکٹر رشید جہاں بڑی پیاری شکل کی خاتون تھیں۔ ان پر نظر پڑتے ہی پھسل جاتی اور اگر جم جاتی تو جمی کی جمی رہ جاتی۔ وہ پرانی داستانوں کی ان شہزادیوں کی طرح تھیں جن کو دیکھتے ہی شہزادے ہوش و حواس کھو دیا کرتے تھے۔ کنول جیسی مسکراتی ہوئی روشن سیاہ آنکھیں، ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، کتابی چہرہ، رنگ دودھ اور شہاب، موزوں قد۔ آواز ایسی کہ جیسے جل ترنگ بج رہی ہے۔ نقرئی قہقہے جہاں رشیدہ ہوتیں وہاں قہقہے ہوتے اور جہاں قہقہے ہوتے وہاں رشیدہ ضرور ہوتیں۔

میکے میں سب سے انوکھی۔ نہ کوئی بہن ان پر گئی نہ بھائی۔ نہ صورت و شکل میں نہ عادات و اطوار میں اور نہ عقیدے اور نظریات میں۔ سسرال میں قدم رکھا تو سسرال کی کایا پلٹ دی۔

سسرال میں نوابی تھی، جاگیرداری تھی۔ ڈاکٹر صاحب زادہ سعید الظفر خاں کے بڑے امجد نواب نجیب الدولہ تھے۔ وہ لکھنؤ میڈیکل کالج کے پرنسپل تھے۔ ان کے دو ہی بچے تھے۔ ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ لڑکا رشید جہاں کا شوہر صاحب زادہ محمود الظفر خاں اور لڑکی حمیدہ سعید الظفر خاں جو گاندھی آئی ہسپتال علی گڑھ میں ماہر امراض چشم رہ چکی ہیں۔ حمیدہ کی شادی نہیں ہوئی۔ کچھ تو رشید پہلے ہی سے کمیونزم سے متاثر تھیں اور کچھ محمود کا ان پر اثر ہوا۔ لیکن محمود الظفر کا تعلق رشید جہاں سے شادی کرنے سے پہلے کمیونزم سے نظریات کی حد تک تھا۔ شادی کے بعد تو رشید محمود سے بہت آگے نکل گئیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کی سرگرم رکن بن گئیں اور پھر ان کی وجہ سے صاحب زادہ سعید الظفر خاں کا گھر یوپی کے کمیونسٹوں کا اڈا بن گیا۔ ذرا یہ ستم ظریفی تو دیکھو کہ کہاں اس گھر میں رئیسوں ایسے ٹھاٹ باٹ۔ بنگلہ۔ فٹن۔ نوکر چاکر۔ مغلانیاں چھوچھوپیں مامائیں۔ اور کہاں رشید بی کے آتے ہی وہ سارے ٹھاٹ باٹ ختم ہو گئے۔ ساس سو جان سے بہو پر صدقے واری ہوتی۔ لیکن بہو کو گھر کے طور طریقے پسند نہ آئے۔ ریاست کی تو بات تو جاتے ہی جاتی ہے لیکن رشید اکثر اپنی ساس اور خسر سے گستاخ بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ ساس بے چاری کچھ مدت کے بعد کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ کہتے ہیں کہ ایک دن رشید جہاں

نے صاحب زادہ صاحب کے والد کی تصویر پر جو ایک دیوار سے لٹکی ہوئی تھی ، تکیہ تان تاک کر مارا اور تصویر کا شیشہ کرچی کرچی تو ہوا ہی تھا ، تصویر بھی پھٹ گئی ۔ صاحب زادہ صاحب اب تک بڑے ضبط سے کام لیتے رہے تھے لیکن اب وہ اپنی بہو کے ہاتھوں اپنے والد کی یہ توہین برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے رشید جہاں کو زندگی میں پہلی بار اونچی آواز میں ڈانٹ کر کہا ۔ " رشیدہ ! ہم اپنے بزرگوں کی یہ توہین برداشت نہیں کر سکتے ۔" ڈاکٹر سعید الظفر خان اگر کچھ کرنا بھی چاہتے تو کیا کرتے ۔ دو آنکھیں ہوتیں تو ایک پھوڑ ڈالتے ۔ بیٹے کی صورت میں تو ایک ہی آنکھ تھی ۔ اور محمود الظفر ــــ ان کا ــــ اللہ آمین کا بیٹا ان کی بہو کی مٹھی میں تھا ۔ اور ادھر خاندانی شرافت تھی جو فیصلہ کن اقدام سے باز رکھتی ۔

رشیدہ نے محمود کے پورے خاندان اور ان کی بیشتر کزنز کو دین سے برگشتہ کر دیا ۔ ان میں محمود کی پھوپھی زاد ہاجرہ بیگم تو کمیونسٹ پارٹی کی ممبر بھی بن گئیں ۔ اور ان کی شادی مشہور کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر زیڈ اے احمد سے ہو گئی اور جب امرت سر میں ایم اے او ہائی اسکول ، کالج بن گیا تو محمود اس کے وائس پرنسپل مقرر ہو کر آ گئے ۔ رشیدہ ان کے ساتھ تھیں ۔ یہ لوگ سول لائنز میں رہتے تھے لیکن ڈاکٹر رشید جہاں کا مطب ڈھاب کھٹیکاں میں تھا ۔ ڈاکٹر رشید جہاں سے فیض اور ایم اے او کالج کے دوسرے طالب علم اور شہر کے ادیب اکثر ملتے رہتے ۔ وہ بے پناہ خلیق تھیں ۔ ہر ایک کا پاس لحاظ کرتیں ۔ کسی کو خفا ہونے کا موقع نہ دیتیں ۔ تاثیر اور فیض سے ان کے گہرے مراسم تھے ۔ فیض کی مسیں بھیگ رہی تھیں ۔ وہ بڑے شرمیلے تھے ۔ پھر یوں ہوا کہ مکھی مکڑی کے جال میں پھنس گئی ۔ ایک فیض ہی کیا ایسے کئی فیض رشیدہ کے حسن بیان اور ان کی تعلیمات کا اثر قبول کر کے کمیونسٹ ہو گئے ۔ یوں سمجھیے کہ فیض بچہ تھے اور رشیدہ ان کی اتا تھیں ۔ ان کو لوریاں دیتیں تھپک تھپک کے مارکسی نغمے سناتیں اور مارکسی خواب دکھایا کرتی تھیں ۔ اس خواب ناک ماحول میں فیض بھلا پہلے سے فیض کہاں رہتے ۔ بھرپور جوانی تھی ۔ بہک جانے کے مواقع اور اسباب بہت سے تھے ۔ غرض کہ فیض کو رشید جہاں نے بالکل بدل ڈالا ۔ ایک فیض ہی کیا ، امرت سر اور لاہور کا جو بھی جوان ان کے قریب آیا ، وہ ان کا ہو گیا ۔ اور ان کے راستے پر لگ گیا ۔

لاہور اور امرت سر میں کمیونسٹ پارٹی اور کمیونسٹ لیڈر تو پہلے بھی تھے لیکن ان کا حلقۂ اثر اتنا وسیع نہیں تھا جتنا رشید جہاں کے آنے سے ہو گیا تھا ۔ کمال تو یہ ہے کہ رشید جہاں کی زندگی کا ہر سانس مارکسی تحریک کے لیے وقف تھا ۔

رشید جہاں بہت اچھی معالج تھیں ۔ ان کے مطب میں مریضوں کا جمگھٹا لگا رہتا ۔ وہ غریبوں سے علاج اور دوا کے پیسے نہیں لیتی تھیں ۔ غریبوں سے ان کی ہمدردی کی یہ حالت

تھی کہ اگر آدھی رات کو اُن کی کسی مریضہ کی طبیعت بگڑ جاتی تو وہ گہری نیند سے اُٹھ کر اُس کے یہاں چلی جاتیں۔ ان کے اس اخلاق سے ان کا مشن بھی پورا ہو جاتا۔ مارکس کے حلقہ بگوشوں نے اپنی اسی جاں فروشی سے مارکس ازم کو بھی ایک طرح سے مذہب بنا دیا تھا۔

لاہور صوبائی حکومت کا دارالحکومت تھا۔ وہاں پارٹی کے لیے کام کرنے کے مواقع نہیں تھے۔ امرت سر پنجاب کا شہر تھا۔ رشید جہاں اور ان کے ساتھیوں کے لیے یہاں کام کرنے کی بڑی گنجائش تھی۔ لیکن امرت سر کے مسلمان مذہب کے معاملے میں بہت کٹر تھے۔ چناں چہ رشید اور محمود کی بڑی شدت سے مخالفت شروع ہو گئی اور آخر یہ شہر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

فیض کے لیے تو رشید کا امرت سر چھوڑ کر جانا ایسا ہوا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو جنگل میں اکیلا چھوڑ کر چلی جائے۔ چوں کہ فیض نظریاتی طور پر کمیونسٹ ہیں اور یہ عامل کمیونسٹ نہیں تھے لہذا یہ رشید کے جانے کے بعد کمیونسٹوں کے مخالفین کی دست بُرد سے بچے رہے۔ اور اپنی شاعری کی وجہ سے لوگوں میں مقبول اور اپنے بھول پن اور سادگی کے باعث محبوب رہے۔ ہر چند کہ ملامتوں کا ہدف بھی بنتے رہے۔

رشید افسانے بھی بہت اچھے لکھتی تھیں۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے۔ وہ ترقی پسندوں میں بڑی مقبول تھیں اور ترقی پسندوں میں ان کا نام سرِ فہرست آتا تھا۔ رشید جیسی بھی تھیں نڈر اور بے باک تھیں۔ ان کے یہاں آج کل کے بیشتر کمیونسٹوں کی طرح دُہرا معیار نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے مشن کی خاطر تکلیفیں اٹھائیں۔ اپنی سسرال کی ساری جاگیر اپنی پارٹی اور اپنے مشن پر نچھاور کر دی۔ رشید جہاں نے آج کل کے بیشتر نام نہاد کمیونسٹوں کی طرح محل میں بیٹھ کھیت اور کارخانوں میں کام کرنے والے کسانوں اور مزدوروں کی زبوں حالی پر جھوٹے آنسو نہیں بہائے بلکہ اپنے محل کو آگ لگا کر وہ آگ میں شامل ہو گئیں۔ انسان کافر ہو تو کھلا کافر ہو، مومن ہو تو پکا مومن ہو، لیکن منافق نہ ہو۔ اور رشید منافق نہیں تھیں۔ یہی ان کی بڑائی تھی۔

اور پھر رشید ایسی بیمار ہوئیں کہ ان کا سارا حسن غارت ہو گیا۔ وہ ایک ڈھانچہ بن کر رہ گئیں۔ اس ڈھانچے میں ان کی کنول ایسی آنکھیں یوں لگتیں جیسے کھنڈر میں چراغ جل رہے ہوں۔ محمود علاج کے لیے انھیں اپنے ساتھ ماسکو لے گئے لیکن وہ ماسکو سے واپس نہیں آئیں اور محمود نے انھیں وہیں دفنا دیا۔ جو پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ رشید کے آگے محمود کی نہیں چلتی تھی۔ محمود کا گھر گھر نہیں رہا، پارٹی کا مرکز بن گیا۔ رشید لیڈر تھیں اور محمود ان کے وفادار والنٹیر تھے۔ رشید عطیہ فیضی تھیں اور محمود فیضی جمیل تھے۔ ماسکو میں رشید کو دفنا کر محمود زندہ درگور ہو گئے۔ اور پھر ایک دن خبر آئی کہ محمود بھی دُنیا سے مُنھ موڑ گئے اور یوں یہ کہانی ختم ہو گئی۔

محمد حسن عسکری

میں نے بارہا ارادہ کیا کہ حسن عسکری صاحب[1] پر کچھ لکھوں لیکن جب بھی ان کی شخصیت پر غور کیا تو ہمت نے جواب دے دیا۔ اگر عسکری صاحب پر خود عسکری صاحب بھی لکھنا چاہیں تو ان کی ہمت بھی جواب دے دے گی۔

عسکری صاحب سے میری پہلی ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب وہ ساقی میں لکھا کرتے تھے۔ ان کی تحریر جو بھی پڑھتا، چونک اٹھتا۔ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے بت شکن تھے۔ وہ کئی سومناتوں میں داخل ہوئے۔ اور وہ بڑے بڑے بت جو ناقابلِ شکست سمجھے جاتے تھے، ان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے اور پھر عسکری صاحب کے بعد اردو ادب کی تنقید میں عسکریت کا سلسلہ چل نکلا۔ عسکری صاحب نے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھانے والے استادوں کی تنقید کا جو جواب مضمون قسم کی ایک چیز ہوا کرتی تھی، رنگ ڈھنگ ہی بدل ڈالا۔ ان کے ہاتھ سے نہ غالب بچا نہ مولوی حالی۔ عسکری صاحب کا یہ کہنا ہے کہ انسان بس انسان ہوتا ہے اسے فرشتہ کیوں بناتے ہو، اور انسان میں سب کچھ ہوتا ہے، اچھائیاں بھی اور برائیاں بھی۔ جب کسی انسان کا ذکر کرو تو اس کے تار و پود بکھیر کر رکھ دو اور یہ بتاؤ کہ یہ سب کچھ وہ ہے جیسے آپ نے نہ جانے کیا کچھ بنا رکھا تھا۔ یہ کیا ہے؟ بس یہی ہے۔ مجھ سے نہ پوچھیے خود دیکھ لیجیے۔

عسکری صاحب نقادوں اور ادیبوں سے چومکھی لڑا کرتے تھے۔ وہ اپنے وقت کے محمد علی (کلے) تھے۔ محمد علی (کلے) اور عسکری صاحب میں یہ فرق ہے کہ محمد علی ڈینگیں مارتا ہے اور عسکری صاحب ڈینگیں مارنے والوں کی ساری ڈینگیں ان کی شخصیت سے نکال کر ان کے منہ پر دے مارتے ہیں۔

پڑھنے والے تو ہم نے بہت دیکھے ہیں لیکن ان میں سے بہت سوں کو ہاضمے کی شکایت میں مبتلا پایا۔ ایک عسکری صاحب ہی کو ایسا دیکھا کہ سمندر پی گئے اور ہونٹ خشک ہی رہے۔ حوالے تو وہ بھی دیتے ہیں لیکن بات اپنی ہی کہتے ہیں۔ اگر کسی موضوع پر لکھتے ہیں تو موضوع سے ادھر ادھر گھوم پھر کر موضوع پر آجاتے ہیں اور کبھی نہیں بھی آتے۔ بات سے بات نکالتے چلے جاتے ہیں۔ بس ان کی انھی باتوں

---

[1] یہ مضمون عسکری صاحب کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

میں مزا آتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک کتب خانے کی ساری کتابیں بول رہی ہیں اور عسکری صاحب اپنی بولی الگ بول رہے ہیں۔ نہ کسی کی تعریف کرتے ہیں نہ بُرائی۔ بیچ کی راہ اختیار کرکے اپنی بات کہے جاتے ہیں۔ اور جو اپنی کہی ہوئی بات پر مطمئن نہ ہو وہ کسی دوسرے کی بات پر مطمئن کیوں کر ہو سکتا ہے، اور اطمینان تو تلاش و جستجو کی آخری منزل ہوا کرتی ہے۔ بے چینی ہی اصل چیز ہے۔

عسکری صاحب نقاد ہی نہیں ہیں افسانہ نگار بھی ہیں۔ اور گنتی کے جن لوگوں کے نام افسانہ نگاروں میں باقی رہ جائیں گے ان میں عسکری صاحب کا نام بھی ہوگا۔ وہ مصوری کی پرکھ بھی رکھتے ہیں اور ان کی نظر ہر چیز کی گہرائی میں جاتی ہے۔ آج سے بیس برس اُدھر کی بات ہے۔ ایک ٹی پارٹی میں، میں اور وہ شریک تھے۔ میرے نزدیک ایک مریل سی اور بڑی اداس اداس سی خاتون کھڑی مجھ سے باتیں کر رہی تھیں۔ عسکری صاحب میرے قریب آئے اور مجھ سے کہنے لگے۔ تم ان کو اچھی طرح جانتے ہو۔ میں نے کہا۔ خیریت تو ہے؟ کہنے لگے، مجھے یہ افسانے کا موضوع نظر آتی ہیں۔ میں عسکری صاحب کی نظر کا قائل ہو گیا۔ میں نے کہا۔ یہ خاتون تو ناول ہیں۔ کہنے لگے، خیر اتنا انھیں پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ افسانہ ہی ٹھیک رہیں گی۔ خود عسکری صاحب بھی ایک داستان کا موضوع ہیں لیکن ان پر اتنے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ انھیں یہ کبھی خود ہی اتار لیں تو اتاریں، کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں ہے۔

عسکری صاحب اپنی تحریروں میں جتنے شوخ ہیں اپنی عام زندگی میں اتنے ہی خاموش اور شرمیلے ہیں۔ ان کا قلم بولتا ہے اور وہ خاموش رہتے ہیں۔ وہ بہت سوچ کر اور تول کر اور اپنے مخاطب کا اندازہ کرکے بولتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے عسکری صاحب کو کھولنا چاہا لیکن جتنا کوئی ان کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے وہ اتنا ہی سمٹتے چلے جاتے ہیں۔ وہ محفلوں کے آدمی نہیں ہیں، گوشہ نشین ہیں، اور انتہائی قانع۔ ایک مرتبہ جب پاکستان اور امریکہ میں مثالی دوستی قائم تھی تو امریکی سفارت خانے کے ایک افسر نے مجھ سے کہا۔ "تم عسکری صاحب کو امریکہ کے سفر پر مائل کر دو کیوں کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ انھیں فیلوشپ پر امریکہ جانے کی دعوت دی جائے۔" میں نے عسکری صاحب سے تذکرہ کیا۔ سنتے رہے، اور پھر مسکرائے اور فرمایا:

"میں نے تو پیرالٰہی بخش کالونی ہی پوری طرح نہیں دیکھی ہے تو امریکہ جا کر کیا کروں گا۔ انسان پہلے اپنا ملک تو دیکھ لے۔"

اور مجھے یقین ہے کہ عسکری صاحب نے اب بھی پیرالٰہی بخش کالونی پوری طرح نہیں دیکھی ہوگی۔ خیر عسکری صاحب نے تو پیرالٰہی بخش کالونی پوری طرح نہیں دیکھی ہے لیکن پیرالٰہی بخش کالونی میں بھی شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے عسکری صاحب کو کبھی دیکھا ہو۔ کتنا عظیم انسان، کتنا بڑا ادیب اور نقاد،

پاکستان تو شاید اسے دیکھے یا نہ دیکھے، پیرکالونی بھی نہیں دیکھ پائے گی۔ اس کی زندگی میں تو ایسا نہیں ہوگا۔ ہاں سو پچاس برس بعد اگر کوئی دوسرا عسکری پیدا ہوگیا تو ممکن ہے کہ وہ اس عسکری کو سب کو دکھا دے جو تو دبھی پردوں میں رہا اور جس پر لوگوں نے بھی اس کی زندگی ہی میں پردے ڈال دیے۔ عسکری صاحب چھوٹے قد کے آدمی ہیں (یہ اُن کا ادبی قد نہیں ہے ادبی قد تو اُن کا ایسا ہے کہ دیکھنے والوں کی ٹوپیاں گر جائیں) بال گھنگھریالے، ہونٹ خاصے موٹے، رنگ گندمی، آنکھیں لمبی دھنسی ہوئیں، آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ۔ سوٹ بھی پہنا کرتے تھے۔ آج کل سپید یا سیاہ رنگ کی شیروانی پہنتے ہیں۔ کسی زمانے میں چتکبرے رنگ کی بے پناہ موٹے تلے کی جوتی پہنا کرتے تھے۔ پان بہت کھاتے ہیں اور اسی حساب سے سگریٹ بھی پیتے ہیں، بے پناہ کتابیں پڑھتے ہیں۔ ایک مرتبہ فرانسیسی ادب کا چسکا پڑ گیا تو شاید ہی کوئی کتاب چھوڑی ہو۔ اب بھی پڑھتے ہیں اور اسی حساب سے پڑھتے ہیں اور بے پناہ پڑھتے ہیں۔ آواز بہت باریک ہے۔ جب میں ریڈیو میں ملازم تھا تو میری وجہ سے ایک آدھ تقریر کا مسودہ لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے۔ وہ اسٹوڈیو سے بہت گھبراتے تھے۔ وہ کسی بند کمرے میں ایک منٹ کے لیے بھی بیٹھ نہیں سکتے تھے۔

میرے ایک عزیز دوست شاہین اقبال نے ۱۹۴۹ء میں ایک ادبی رسالے کا ڈیکلریشن حاصل کیا۔ اس رسالہ کا نام بھی انھوں نے اپنے نام پر "شاہین" رکھا۔ مجھ سے یہ کہا کہ میں ان کا تعارف چند مشہور ادیبوں سے کرا دوں۔ میں نے ایک تعارفی خط عسکری صاحب کے نام بھی لکھ کر دیا۔ اُس زمانے میں وہ ماہِ نو کے ایڈیٹر تھے۔ شاہین صاحب بے پناہ شریر تھے۔ عسکری صاحب سے مل کر آئے تو کہا۔ نصراللہ بھائی عسکری صاحب بے پناہ شریف انسان ہیں۔ وہ مضمون لکھیں یا نہ لکھیں، میرا جی چاہتا ہے کہ اُن کو خوب چھیڑا جائے۔ میں نے اُسے منع کیا کہ دیکھو ایسا نہ کرنا لیکن شاہین کب ماننے والا تھا۔ وہ ایک سیٹھ بن کر اُن سے ملا۔ اور اُس نے بقول اُس کے عسکری صاحب سے یہ کہا:

"عسکری صاحب۔ ہم رسالہ نکالے گا۔ آپ اچھا سا کہانی لکھ کر دو۔ آپ جتنا کہانی لکھے گا ہم ہر کہانی پر آپ کو پانچ سو روپے دے گا۔"

عسکری صاحب نے کہا: "میں اب کہانیاں نہیں لکھتا۔ مجھے معاف کیجیے۔"

شاہین نے کہا۔ "بابا۔ ہم پیسہ دیتا ہے۔ مُفت کہانی نہیں لکھواتا۔ اچھا۔ آپ جتنا بولے گا، اتنا پیسہ دے گا۔ اور آپ بولے گا تو فری ٹائم میں آپ کو کام دے کر پگڑی بھی دے سکتا ہے۔"

اور جب میں نے شاہین کو سمجھایا تو وہ دوبارہ نہیں گیا۔ شاہین نے کچھ غلط بھی نہیں کہا۔ ایک عسکری صاحب ہی ایسے نکلے جنھوں نے اپنے آپ کو کسی دوسرے کے ہاتھ نہیں بیچا۔ بہت سودے ہوئے لیکن اُن کی قلندری میں فرق نہیں آیا۔ وہ

ساقی میں جھلکیاں اُس وقت تک لکھتے رہے جب تک شاہد بھائی رائٹرز گلڈ میں شریک نہیں ہوئے تھے اور جب تک ساقی خالص ادبی پرچہ رہا۔ اور جب ساقی نے ایوب خان کی سیاست کا ساتھ دیا (اچھا کیا یا بُرا) تو عسکری صاحب آدمی تو بڑی مروت کے ہیں، انھوں نے لکھنے سے تو انکار نہیں کیا لیکن وہ برابر ٹال مٹول کرتے رہے۔

اور اب یہ سُنا ہے کہ عسکری صاحب تصوف کے ہو کے رہ گئے ہیں۔ ہمیں تو ذرا بھی تعجب نہیں ہوا، مزاج ان کا لڑکپن سے صوفیانہ تھا۔

پروفیسر اطہر صدیقی صاحب نے سات رنگ کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا۔ اور یہ اطہر صدیقی صاحب کی ہمت ہے کہ وہ عسکری صاحب سے اُس میں لکھواتے رہے۔ لیکن اس پرچے نے دفا نہ کی اور اس طرح عسکری صاحب کا لکھنے لکھانے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

عسکری صاحب کی جدید عالمی ادب پر بڑی گہری نظر ہے۔ اور عسکری صاحب نے جس طرح اس میں ڈوب کر اس کا مطالعہ کیا ہے یہ موقع بہت ہی کم لوگوں کو ملا ہے اور فرانس کے جدید ادب سے عسکری صاحب ہی نے اردو ادیبوں کو روشناس کرایا۔ یوں عسکری صاحب ایک مقامی کالج میں پروفیسر ہیں، لیکن جب تک اُن کے لکھنے کا سلسلہ جاری رہا، وہ ملک کے سارے ادبی حلقوں کے پروفیسر رہے۔ اور انھوں نے لکھنا چھوڑ کر سب کو اپنے فیض سے محروم کر دیا۔ عسکری صاحب یوں تو اسلامی رجحانات کے بڑی سختی سے پابند ہیں اور کچھ لوگ انھیں رجعت پسند بھی کہتے ہیں لیکن جب وہ ترقی پسندوں کی محفل میں ہوتے ہیں تو کوئی ان کے سامنے لب کشائی کرنے کی جرأت نہیں کرتا کیوں کہ جدید ادب پر نہ اُن جیسا کسی کا مطالعہ ہے، نہ کسی کی نظر ہے۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ جب ملک کی تقسیم سے پہلے ترقی پسندوں پر برٹش حکومت نے پابندیاں لگا دی تھیں تو عسکری صاحب نے ترقی پسند ادیبوں کی حمایت اور ترقی پسند ادب کے موضوعات پر بڑی جُرأت اور بے باکی سے لکھنا شروع کر دیا تھا اور آج جن لوگوں کو عسکری صاحب کے مسلک سے اختلاف ہے، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ عسکری صاحب اپنے مسلک پر بڑے خلوص سے قائم ہیں۔ ان کی دیانت میں اُن کے مخالف بھی شک نہیں کرتے۔ برصغیر میں ایک ہی نقاد اور ادیب ایسا ہے جس کی عظمت کے اُس کے مسلک کے حامی جتنے قائل ہیں، اس سے زیادہ اس کے مخالف قائل ہیں۔

عسکری صاحب کی قناعت پسندی اور درویشی اور قلندری کی دُور دُور تک مثال نہیں ملتی۔ ایک مرتبہ نیویارک کے پبلشرز سلور برڈیٹ کے چند کارکن پاکستان آئے تھے اور محکمۂ تعلیم نے انھیں ثانوی مدرسوں کے لیے کتابیں لکھنے اور چھاپنے کا کام دیا تھا۔ تاریخ کی کتابوں کے انگریزی زبان کے مسودے کا ترجمہ مولانا چراغ حسن حسرت کو سونپا گیا۔ پھر یہ ہوا کہ ان کتابوں پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آئی۔

پبلشرز چاہتے تھے ان کی کتابوں میں کوئی سقم نہ رہ جائے چنانچہ حسرت صاحب کے مسودے عسکری صاحب کو بھجوائے گئے اور نظرثانی کرنے کا معاوضہ جہاں تک مجھے یاد ہے، ایک ہزار روپے مقرر کیا گیا تھا۔ عسکری صاحب نے یہ مسودے بغیر دیکھے اس نوٹ کے ساتھ بھجوا دیے کہ اگر مولینا حسرت نے زبان میں کوئی غلطی کی ہے تو میرے یہاں ان کی غلطی بھی صحیح ہوگی اور پھر تاریخ کا مطالعہ میرا مولینا سے زیادہ نہیں ہے شکریہ۔ عسکری۔

عسکری صاحب کی تنخواہ کا بڑا حصہ کتابیں خریدنے میں خرچ ہو جاتا ہے۔ یوں لائبریریوں میں ایسی کتابیں کہاں ہوں گی جو انھوں نے پڑھی نہیں ہوں گی، یعنی ان کی پسند اور ان کے پسندیدہ موضوعات اور پسندیدہ لکھنے والوں کی کتابیں۔ وہ اگر اپنے ذوق و شوق کی پڑھنے لکھنے کی ملازمت نہ کرتے اور زیادہ سے زیادہ تنخواہ کی انھیں طلب ہوتی اور وہ اپنی درویشی کی گدڑی تھوڑی سی ہمت کر کے اتار پھینکتے تو وہ کیا نہ بن جاتے ؟ لیکن جو مزا انھیں اب اپنی درویشی اور اپنی زندگی کی تنہائی اور سناٹے میں ملتا ہے، وہ کہاں ملتا۔ مالی منفعت کے سلسلے میں تو انھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ یہ ان کی سوچ کا راستہ ہی نہیں ہے۔ کیا مزے سے گوشۂ تنہائی میں پڑے کتابیں پڑھتے رہتے ہیں، اور سوچتے رہتے ہیں۔ اس سناٹے میں بھلا کون آئے گا ؟ اور ان سے کیا لے جائے گا۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ شاگرد جن کے وہ استاد ہیں۔ اس دور میں بھی اُن کے شاگرد اُن کا احترام کرتے ہیں۔ اگر استاد عسکری ایسا عالم ہو تو علم کا رُعب آج بھی بڑا رُعب ہے، اور پھر مرعوب کرنے کے لیے انسان کا کردار بھی ہوا کرتا ہے، کردار کے بغیر مرعوب کرنے سے کون مرعوب ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ کالج میں ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ ایک بہت بڑے سرکاری عہدے دار اس جلسے کی صدارت کے لیے تشریف لائے۔ انھوں نے دیکھا کہ عسکری صاحب اُستادوں کی صف میں بیٹھے ہوئے ہیں تو عہدے دار صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے اور عسکری صاحب کے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور اُن سے باتیں کرنے لگے۔ عسکری صاحب بیٹھے ہی رہے۔ جب کالج کے منتظم صاحب نے یہ سماں دیکھا تو دوسرے ہی دن عسکری صاحب کی تنخواہ میں دوسو روپے کا اضافہ کر دیا۔ اس پر کسی نے اُن سے کہا۔ ذرا معلوم کر لیجیے کہ یہ رقم تنخواہ کا حصّہ ہے یا عہدے دار سے واقفیت کا الاؤنس۔

اگر عسکری صاحب کسی کالج کے پرنسپل ہونا چاہتے تو کب کے ہو چکے ہوتے لیکن ..... وہ عہدوں اور ذمہ داریوں سے گھبراتے ہیں۔ ان کی قابلیت کا اعتراف نہ ملک کی کسی یونیورسٹی نے کیا اور نہ کسی حکومت نے انھیں درخورِ اعتنا سمجھا۔ مشکل یہ ہے کہ وہ بھی تو کسی کو نہیں گردانتے۔ ایسے معاملوں میں تالی دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے اور عسکری صاحب کا ایک ہاتھ تو قناعت

کا تکیہ بن کر سو ہی گیا ہے۔

یہ بتاتا چلوں کہ اس ناچیز کو عسکریؔ صاحب نے ہی شخصیت نگاری پر مائل کیا۔ ہوا یوں کہ شاہد احمد دہلوی پر میرا ایک مضمون ان کی نظر سے گزرا تھا جس میں انھوں نے یہ بات دیکھی کہ میں اس سلسلے میں چل نکلوں گا اور پھر بار بار تکرار بھی کرتے رہے کہ کچھ اور لکھو۔ ایک مرتبہ قاضی ابرارؔ صدیقی صاحب اور جمالیؔ مرحوم نے ان سے کہا کہ یہ آپ پر لکھ رہے ہیں۔ عسکریؔ صاحب نے کہا۔ مجھ پر کوئی نہیں لکھ سکتا، مجھ پر لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اور مجھے منع بھی کیا کہ ایسا نہ کرنا۔ عسکریؔ صاحب نے یہ درست فرمایا۔ بھلا اُن پر کوئی کیا لکھ سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھ سے یہ حق ادا نہیں ہوا۔ میری کیا بساط۔ یہ خاکہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ جو لوگ انھیں بہت قریب سے جانتے ہیں اور اُن پر لکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں، وہ جرأت و ہمّت سے کام لیں اور اُن پر لکھنے کی کوشش کریں۔ عسکریؔ صاحب پر وہی لکھ سکتا ہے جس کی نظر میں اُن کا مطالعہ بھی ہو، اُن کی سوچ بھی ہو اور اُن کی شخصیت بھی۔ سو انسان تین زندگیاں کہاں سے لائے۔

سلیم احمد

سلیم احمد جیا بھی شان سے اور مرا بھی شان سے۔ وہ جب تک زندہ رہا، ہنگامے برپا کرتا رہا۔ اِسے چھیڑا، اُسے چھیڑا۔ اِس پر حملہ کیا، اُس پر حملہ کیا۔ وہ کسی گھر بند نہیں تھا۔ کیا شعر و شاعری۔ کیا تنقید نگاری اور کیا ڈراما نویسی۔ قلم کاغذ سامنے رکھ دو اور جو جی چاہے لکھوا لو۔ ہمہ وقت اور آخری دَم تک لکھتا رہا۔ اور اپنے قلم سے جہاد کرتا رہا۔ لیکن اُس کی تحریر میں کہیں تکان کے آثار نمایاں نہیں ہوئے اور کہیں جھول نہیں آیا۔ جو لکھا، شروع سے آخر تک ایک جیسا۔ کیا مجال جو کہیں فرق آ جائے اور یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔

روزنامہ "حریت" میں اُسے لکھتے ہوئے مشکل سے دو تین ہی برس گزرے ہوں گے کہ لوگوں نے شکایات کا طومار باندھ دیا۔ کوئی کہتا کہ دیکھیے صاحب یہ سلیم احمد کا سلسلہ اب منقطع ہو جانا چاہیے۔ آخر یہ لکھنا کیا ہے؟ اینٹ پتھر برساتا ہے۔ ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ لیکن جب سلیم دُنیا سے رخصت ہوا تو سارے گلے شکوے دُور ہو گئے۔ اور مَیں نے سلیم کے جنازے میں ان لوگوں کو بھی ایک دُوسرے سے گلے مِل مِل کر روتے دیکھا جو سلیم سے اختلافات رکھتے تھے اور سب ہی کو یہ کہتے سُنا کہ سلیم بے پناہ محبتوں کا آدمی تھا۔ وہ جو لکھتا تھا اس میں نفرت یا حقارت یا تضحیک کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ پھر سلیم اختلافات رکھنے والوں کی ہر بات رَد بھی نہیں کرتا تھا۔ جو بات اُس کی سمجھ میں آجاتی تو کھُل کر اُس کی حمایت کرتا۔ سلیم سے رِند ہی عاجز نہ تھے، عابد اور زاہد بھی نالاں تھے۔ سلیم مصلحتوں کا آدمی نہیں تھا۔ اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے:

نِکل جاتی ہو سچی بات جس کے مُنھ سے مستی میں
فقیہہ مصلحت بیں سے وہ رِندِ بادہ خوار اچھّا

۱۹۴۹ء کے آخر میں میرا تقرر ریڈیو پاکستان پشاور میں ہُوا۔ اور جب میرا تبادلہ کراچی ہُوا تو

ایک دُبلا پتلا سا لڑکا اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے یہاں ملازم ہُوا۔ اُس وقت اُس کی عمر تقریباً بیس اکیس برس کی ہوگی۔ سیّد ظفر حسین صاحب ہمارے شعبے کے انچارج تھے۔ ایک دن انھوں نے سلیم سے کہا۔ میاں صاحب زادے! یہ لو دس روپے کا نوٹ اور شہر میں جاؤ اور جو فلم تمھیں نظر آئے وہ دیکھ آؤ، اور اُس پر ایک تبصرہ لکھ لاؤ۔ چناں چہ یہ شام کو آیا اور جب اس نے اپنا تبصرہ سُنایا تو طبیعت خوش ہوگئی۔ اور پھر علامہ اقبال پر اُس نے قلم برداشتہ کئی فیچر لکھے۔ جو بے پناہ پسند کیے گئے۔ اُس نے غنائیے بھی لکھے اور پھر یہ ہُوا کہ ہر نیا پروگرام سلیم ہی سے لکھوایا جاتا۔ مَیں نے "دیکھتا چلا گیا" کا آغاز کیا تو سلیم نے "مُفت کا جھگڑا" نامی پروگرام شروع کیا اور دونوں پروگرام بہت مقبول ہوئے اور یہاں یہ راز کھُلا کہ سلیم میں طنز و مزاح بھی کوُٹ کوُٹ کر بھرا ہُوا ہے۔ اور جب یہ تاریخی ڈرامے لکھنے پہ آیا تو سب سے آگے نکل گیا لیکن اُس کے بہت سے یادگار ڈراموں کے مسوّدے محفوظ نہیں ہیں۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اس وقت انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ وہ پڑھائی سے وقت نکال کر ہمارے پاس آجاتے اور ہم ان سے دل چسپ اور معلوماتی پروگرام لکھواتے اور پھر شمس زبیری اور اسلم فرخی اور ان کے ساتھ ساتھ شاہد بھائی بھی اس ادارے سے منسلک ہوگئے۔ سلیم بہت سیلے دیے رہتا تھا۔ وہ عسکری صاحب کے ساتھ ان کے مکان میں جو مکرانی مسجد پیر کالونی کے قریب تھا، رہا کرتا تھا۔ دونوں کنوارے تھے۔ عسکری صاحب لکھنے پڑھنے والے آدمی تھے۔ لیکن ایک کام انھوں نے یہ بھی کیا کہ ہم جو سلیم میں گھرتنت دیکھتے ہیں، وہ اُنھی کی ہے۔ جہاں تک دینی تعلیم اور اُردو فارسی زبانوں کے علم کا تعلق ہے تو سلیم اور عسکری صاحب میں کوئی فرق نہیں تھا۔ پھر طرزِ فکر اور طرزِ بیان بھی سلیم کا اپنا تھا۔ اُس زمانے میں البتہ عسکری صاحب کی توجہ تصوّف اور دین کی طرف نہیں تھی۔ اور تصوّف سلیم کی گھُٹی میں شامل تھا۔ اُس نے ایک دین دار صُوفی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ غرض کہ عسکری صاحب کے پاس جو کچھ تھا وہ سلیم نے اُن کے ساتھ دن رات رہ کر اُن سے اِس طرح لے لیا کہ یہ سب سلیم ہی کا ہوگیا۔ چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عسکری صاحب کے چراغ کی روشنی سلیم میں منتقل ہوگئی لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ سلیم خالی مٹی کا دیا تھا البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ عسکری صاحب کی روشنی سے یہ روشنی فزوں تر ہوگئی۔ سلیم کی تحریریں عسکری صاحب کی تحریروں سے کم جان دار نہیں ہیں۔ عسکری صاحب کی فکر میں البتہ زیادہ گہرائی تھی۔ غرض کہ استاد اور شاگرد میں جو فرق ہونا چاہیے وہ تھا۔ سلیم اس سقراط کا افلاطون تھا۔ خیر سقراط اور افلاطون کا معاملہ تو متنازعہ فیہ ہے کیونکہ بعض لوگ سقراط کے بارے میں وُہی کہتے ہیں جو فردوسی نے رستم کے بارے میں کہا تھا۔ لیکن

عسکری صاحب اور سلیم، دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔ سلیم نے عسکری صاحب کو اچھالنے اور اجالنے میں حقِ شاگردی ادا کیا۔ پھر سلیم کی زندگی میں مولوی محمد ایوب بر آ گئے۔ مولوی صاحب شاہ ولی اللہ کے مدرسے کے آخری چراغ تھے۔ علم الکلام سے مولوی صاحب ہی کے ذریعے سلیم کا تعلق ہُوا۔ اس کا طریقۂ استدلال بھی کلامیوں کا سا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے سلیم کا معاملہ، جو شروع میں علم الیقین کا نہ تھا، آخر میں عین الیقین کا ہوگیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی لکھتا اور کہتا، پوری دیانت اور پورے یقین سے لکھتا تھا۔ اس کے حریف بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔

سلیم ہزار داستان تھا۔ وہ جہاں بیٹھ جاتا ایک محفل لگ جاتی۔ وہ بولتا تھا تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے اور جب وہ گھر آتا تو اس کے عقیدت مند اور اس کے شاگرد اور کبھی کبھی اس کے حریف اسے گھیر لیتے۔ اور یہ معلوم ہوتا کہ یہ سلیم کا گھر نہیں، علم و ادب کا کوئی اکھاڑہ ہے جہاں پہلوان سلیم احمد اپنے شاگردوں کو زور کروا رہا ہے۔ چاروں طرف سے اس کے شاگرد، اس کے حریف اس پر وار کرتے اور وہ سب کو ایک ساتھ پچھاڑ دیتا۔

سلیم سے سلیم کے شاگردوں ہی نے نہیں سیکھا، اس کے ہم عصروں بلکہ اس کے استادوں نے بھی بہت کچھ سیکھا۔ وہ ایسے مسئلے اٹھاتا کہ لوگوں کو اپنا مطالعہ جاری رکھنا پڑتا۔

سلیم جو کچھ کماتا وہ اپنے دوستوں پر خرچ کر دیتا۔ وہ مستحقین کی اس طرح مدد کرتا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ سلیم کو بولنے سے فرصت ملتی تو لکھنے لگ جاتا۔ "حریت" کے ایڈیٹر نے اس سے کئی بار کہا کہ وہ ایک آدھ دن کی چھٹی کر لیا کرے۔ لیکن سلیم نے کہا کہ پھر اس دن میں کیا کروں؟ میں لکھتا نہیں ہوں تو پریشان رہتا ہوں، بیمار ہو جاتا ہوں۔ سلیم نے پہلی مرتبہ اس دن تھکن محسوس کی ہوگی جو اس دُنیا میں اس کا آخری دن تھا۔ اور اب وہ آرام سے ایسا سویا ہے کہ کوئی اسے اٹھا نہیں سکتا۔ وہ دُنیا میں اپنی عمر بھر کی ساری کمائی چھوڑ گیا ہے جس سے آنے والی نسلوں کا ایمان تازہ ہوتا رہے گا اور اپنے ساتھ سلیم جو نقد کمائی لے کر گیا ہے وہ وہاں بہت کام آتی ہے۔

سلیم جوانی میں بہت دُبلا پتلا تھا لیکن مرنے سے کئی برس پہلے وہ بہت پھول گیا تھا۔ وہ چلتا پھرتا بہت کم تھا۔ یا تو بیٹھا رہتا یا لیٹ جاتا۔ وہ چائے پانی کی طرح پیتا اور سگریٹ سے سگریٹ سُلگائے جاتا۔ سگریٹ ایسے پیتا جیسے حُقّہ پی رہا ہو۔ اور دو چار کشوں میں اس کا بھرکس نکال دیتا لیکن نہ اپنی صحت کی فکر تھی اور نہ اپنی زندگی کی۔ البتہ کسی دوست یا عزیز کی موت پر یوں لگتا، جیسے اس کے لیے جینا مشکل ہو جائے گا۔ وہ جُدائی کے ایسے کئی صدمے سہہ گیا۔۔۔۔ اور پھر وہ اچانک ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا اور اپنے پیچھے ایک مہیب سناٹا چھوڑ گیا۔

مجیؔد لاہوری

مجید لاہوری عوام کا آدمی تھا۔ وہ جیا بھی عوام میں اور مرا بھی عوام میں۔ وہ عوام کے لیے لکھتا تھا، عوام کے مسائل پر لکھتا تھا۔ اور عوام کی زبان میں ہی لکھتا تھا۔ اس کی تحریروں میں عوام کے دُکھ درد اور ان کی چھوٹی چھوٹی معصوم سی توشیاں اور ان کے دلوں کی دھڑکنیں شامل ہوتیں۔

اس کے کالم ایسے دل کش ہوتے کہ انجیں رمضانی بھی پڑھتا، مولوی گل شیر خان بھی پڑھتا۔ اور ٹائرجی ٹیوب جی بھی پڑھتا۔ یہاں تک کہ وزیر اور سفیر سبھی پڑھتے اور کوئی بے مزا نہ ہوتا۔ مجیؔد لاہوری نہ گھر پر ملتا اور نہ دفتر میں۔ وہ کسی نواڑی کی دکان کے سامنے کسی ٹوٹی کرسی پر بیٹھا ہوتا یا فٹ پاتھ کے کسی ملباری کے ہوٹل کی بنچ پر نظر آتا۔ مزدوروں اور رکشا اور گدھا گاڑی اور اونٹ گاڑی چلانے والوں نے اسے گھیرا ہوتا اور وہ ان کی سنتا اور اپنی سناتا اور وہ انھی کی زبان بولتا اور ان کی ان کہی باتوں کو زبان دیتا۔ مجید لاہوری کی تحریر میں عوام کے جذبات اور ان کی زبان ہوتی۔

مجید لاہوری کے مرنے کی خبر مجھ تک یوں پہنچی کہ ایک دن صبح جب میں اپنے گھر سے نکلا تو کمیونٹی کے نلکے پر میں نے ایک بہشتی کو دوسرے بہشتی سے یہ کہتے سنا:

"یار آج اپنا رمضانی مر گیا" اور یہ سن کر دوسرے بہشتی کے ہاتھ سے اس کی بھری ہوئی مشک کا منہ کھل گیا اور مشک کا سارا پانی بہہ گیا۔ یہ ملک کا پہلا صحافی اور مزاح نگار تھا جس کی موت پر ملک کے تمام عوام نے خاموشی سے آنسو بہائے۔ مجید لاہوری کے مرنے کے بعد پھر کوئی مجید لاہوری پیدا نہ ہوا۔ وہ بہت کھرا اور سچا آدمی تھا۔ اس میں بڑا پیار تھا، بڑا خلوص تھا۔ بناوٹ نہ تھی، منافقت نہ تھی۔ وہ خالی ہاتھ آیا کہ وہ ایک غریب گھرانے کا آدمی تھا اور جب وہ دنیا سے گیا تو وہ اپنا دامن جھاڑ کر گیا۔ دوسرا دن گزارنے کے لیے اس کے گھر میں دانے تک نہ تھے۔

مجید لاہوری بڑا پیارا دوست تھا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا۔ اور جن لوگوں نے مجھے مزاح نگاری پر آمادہ کیا ان میں مجید لاہوری بھی شامل تھا۔ مجھ سے "نمک دان" کے لیے مضمون لکھواتا۔ ایک زمانہ ایسا تھا اور شاید قیام پاکستان سے پندرہ بیس برس پہلے میرے اور مجید کے مضامین روزنامہ "احسان" میں چھپا کرتے تھے لیکن اس زمانے میں ہم ایک دوسرے سے واقف نہ تھے۔ میری ملاقات اور پھر ملاقات کے بعد دوستی کراچی میں ہوئی۔ اور پھر سالک صاحب کچھ مدت کے لیے کراچی اُٹھ آئے تو ہم دونوں کا ٹھکانا اُن کا گھر ہوتا۔

مجید لاہوری اپنا بھی مذاق اڑایا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے لکھا کہ میں نے ایک دن ایک رکشا والے سے کہا کہ مجھے فلاں جگہ لے چلوگے تو رکشا والے نے کہا کہ لے چلوں گا لیکن دو پھیروں میں۔ مجید لاہوری پہلوان معلوم ہوتا تھا۔ بھاری بھرکم۔ سر پر بڑے بڑے گھنے اور بکھرے ہوئے بال۔ دن بھر چائے پیتا اور ڈبل جوڑے کا پان کھا کر جگالی کرتا رہتا۔ وہ شلوار قمیص پہنتا۔ پاؤں میں چپل۔ اس کے کپڑے کبھی میلے کچیلے ہوتے اور کبھی اُجلے۔ وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔

مجید لاہوری کے کالم کی مقبولیت کی یہ حالت تھی کہ جو لوگ پڑھے لکھے نہ ہوتے، وہ دوسروں لوگوں سے اس کا کالم پڑھوا کر سُنتے۔ صبح اخبار ملتے ہی ایک دوسرے سے پوچھتے۔ آج مجید لاہوری نے کیا لکھا ہے؟

ایک دن مجید لاہوری نے یہ لکھا کہ آج ایوان صدر میں عجیب واقعہ ہوا۔ میں نے ایک لاری کو ایک بس سے گلے ملتے دیکھا۔ آپ پوچھیں گے کہ یہ کیسے ہوا۔ تو میں عرض کروں گا کہ یہ ایسے ہوا کہ میں نے ایوانِ صدر میں جسٹس لاری سے بس والے فرلینئی کو گلے ملتے دیکھا۔

ایک دن مجید لاہوری نے اپنے کالم میں لکھا کہ نام کے اِدھر اُدھر ہونے سے بھی شخصیتوں میں کتنا اور کیسا فرق آجاتا ہے۔ ایک حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ تھے اور ایک ہمارے حضرت حسین امام علی عنہ ہیں۔ مجید لاہوری کی شخصیت میں جیسی انفرادیت تھی ویسی ہی انفرادیت اس کی تحریر میں تھی۔ اس کا لہجہ اور اس کی آواز سب سے الگ تھی۔ وہ مزاحیہ شاعری بھی کرتا۔ مجید کے کردار رمضانی، مولوی گل شیر خان اور ٹائر جی ٹیوب جی بہت مشہور ہوئے۔ رمضانی تو عام آدمی تھا۔ مزدور، دوکان دار، گدھا گاڑی والا، پنواڑی۔ گل شیر خان کٹ مُلا تھا۔ اور ٹائر جی ٹیوب جی سیٹھ تھا جو لوگوں کا خون چوستا ہے۔ یہ کردار ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ مجید کے مرتے ہی عوامی ادب کی تخلیق بھی ختم ہو گئی۔ وہ پاکستان کا پہلا مزاحیہ کالم نویس تھا اور مجید کے ساتھ اس کا اندازِ تحریر بھی ختم ہو گیا۔ مجید کے بعد مجید کے رنگ کو اپنانے کی بہت کوشش

کی گئی لیکن یہ مُنھ چِڑانا تھا مجید لاہوری بننے کے لیے بہت بڑی قربانی دینا پڑتی ہے۔ بلکہ خود بھی قربان ہو جانا پڑتا ہے تب کہیں جاکر لکھنے والا عوام کے دل کی دھڑکنوں کا ترجمان بنتا ہے۔ یعنی مجید لاہوری بنتا ہے۔

مجید لاہوری کے مرنے سے ایک دو دن پہلے میری اس سے آخری ملاقات ڈاکٹر یاور عباس کے مطب میں ہوئی۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ مرحوم کہیں سے پسینے میں شرابور گھر آیا۔ اور ٹھنڈے پانی سے غسل کر لیا۔ نمونیہ ہو گیا۔ ڈاکٹر یاور عباس نے اپنی سی کوشش کی لیکن ایک رات جو سونے کے لیے لیٹا، تو دل بند ہو گیا اور یوں لگا جیسے اُس کے ساتھ رمضانی، مولوی گل شیر خان اور یہاں تک کہ ٹائر جی ٹیوب جی کے دل کی دھڑکنیں بھی رُک گئیں جب وہ مرا تو اُس کی عمر ۴۲ برس کی تھی۔ طنز و مزاح کی بہار لُٹ گئی۔ کالم نویسی کا سہاگ اُجڑ گیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اِنشا جی

اِنشا جی سے میری پہلی ملاقات کراچی میں ہوئی جب وہ ریڈیو پاکستان کے خبروں کے شعبے میں ملازم تھے۔ اس زمانے میں کراچی کے روزنامہ "امروز" میں ان کا مزاحیہ کالم چھپتا تھا۔ کبھی کبھی شام کو وقت نکال کر میں اور طفیل احمد جمالی "امروز" کے دفتر پہنچ جاتے اور وہاں خوب محفل جمتی اور وقت جو اَب کاٹے نہیں کٹتا، وہاں کتنی آسانی سے کٹ جاتا تھا۔ قاضی ابرار صدیقی کے کمرے میں جو "امروز" کے ایڈیٹر تھے، انشا جی اور ابراہیم جلیس بھی آجاتے اور پھر ایک دوسرے پر مزے مزے کی چوٹیں ہوتیں اور قہقہے گونجتے۔ جب میں نے اِنشا جی کے کالم پڑھ کر "امروز" کے دفتر میں انھیں پہلی مرتبہ دیکھا تو مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ ابنِ انشا ہیں۔ انتہائی سنجیدہ۔ ہنسنے کو ہنس لیتے لیکن اس مدت میں ان کے منھ سے ایسی کوئی بات نہیں نکلی، جس سے یہ معلوم ہو کہ یہی ابنِ انشا ہیں جن کے کالم اِمروز میں چھپتے ہیں۔ پھر کچھ دنوں بعد یہ اندازہ ہوا کہ ابنِ انشا کے منھ سے ایسے جملے بھی نکلتے ہیں جو مزاح نگار ابنِ انشا کے قلم سے نکلا کرتے ہیں۔ بشرطیکہ ابنِ انشا کے اِردگرد کوئی اجنبی نہ ہو اور ماحول بے تکلفی کا ہو لیکن ایسے جملے بولنے والا ابنِ انشا لہجے کے اعتبار سے اُس ابنِ انشا سے مختلف ہے جو ادیب اور کالم نویس ابنِ انشا ہے۔ ادیب اور کالم نویس ابنِ انشا کی زبان تو بڑی البیلی ہے اور یہ وہ زبان ہے کہ جس پر لکھنؤ اور دِلّی والوں کو رشک آتا ہے۔ لیکن ابنِ انشا کو دیکھ کر یوں لگتا کہ جیسے یہ ہمارے سامنے جو ابنِ انشا کھڑا ہے، یہ پنجاب کا کوئی اُجڈ دیہاتی ہے۔

مولانا چراغ حسن حسرت کے بعد جو "امروز" میں سندباد جہازی کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے، قاضی جی کی فرمائش پر ہم سب "چہار درویش" کے نام سے باری باری یہ کالم لکھنے لگے اور اب یہ ہوا کہ انشا جی سے گاڑھی چھننے لگی۔ اور جب "امروز" بند ہوگیا اور مجید لاہوری کا انتقال ہوگیا تو شوکت تھانوی اور ابراہیم جلیس "جنگ" میں کالم نویس ہوگئے اور طفیل احمد جمالی نے مجید لاہوری کا "نمکدان" نکالنا شروع کر دیا۔ اس میں میں بھی لکھتا تھا۔ اِنشا جی اور

مشفق خواجہ کے علاوہ جمالی کے دوسرے احباب بھی اس میں لکھتے رہے ۔ مطلب یہ کہ ہم سب کو جمالی کا "نمکدان" چلانا تھا ۔ سو یہ چلتا گیا ، مارے باندھے گھسٹتا رہا ۔ اور جب ماتری مرحوم نے "حریت" نکالا تو میں وہاں چلا گیا اور انشا جی روزنامہ "جنگ" میں "دخل در معقولات" کے نام سے کالم لکھنے لگے جو ہفتے میں ایک بار اور کبھی دو بار شائع ہوتا تھا ، اور خوب پڑھا جاتا تھا ۔ انشا جی صحافی سے زیادہ ادیب تھے ۔ وہ اخبار کے کالم نویس اتنے نہیں تھے جتنے اخبار کے ادبی مزاح نگار تھے ۔ وہ اپنی تحریروں میں بہت لیے دیے رہتے تھے اور بہت سنبھل سنبھل کر لکھتے ۔ جب من میں موج آتی تو لکھتے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالم بڑے جان دار ہوتے اور خوب پڑھے جاتے ۔

انشا جی اچھے دوست اور مخلص انسان تھے ۔ وہ ضرورت مندوں اور امداد کے مستحق لوگوں کی اس طرح مدد کرتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی ۔ وہ دیکھنے میں بڑے کاہل نظر آتے تھے لیکن تھے بڑے قاعدے اور سلیقے کے آدمی ۔ ویسے انشا جی بڑے دل پھینک بھی تھے ۔ ان کے اندر جو شاعر تھا وہ بڑا دکھی تھا ۔ اصل میں وہی انشا تھا ۔ باہر کا انشا محض بہروپ تھا ۔ اندر کا آدمی کیا تھا ، یہ تو کُھرچنے سے بھی ظاہر نہ ہوتا ۔ قدرت اللہ شہاب اور عالی جی سے ان کی خوب بنتی عالی سے ان کی چھیڑ چھاڑ بھی چلتی رہتی ۔ ایک دن میں نے انشا جی سے کہا کہ عالی کے رشتہ داروں کا کوئی حساب کتاب نہیں ہے ۔ کہا ۔ "تم صحیح کہہ رہے ہو ۔ پچھلے دنوں تو اُس کی مجھ سے بھی رشتہ داری نکل آئی ۔ میں کل جو اپنے ایک عزیز کی شادی کی تقریب میں شامل ہُوا تو دیکھا کہ وہاں عالی بھی ڈٹے ہوئے ہیں ۔ میں نے پوچھا ۔ تم یہاں کیسے ؟ تو فرمایا کہ بھئی یہ بھی میرے رشتہ دار ہیں ۔ تو پتا چلا کہ عالی میرا بھی رشتہ دار ہے ۔"

پھر ہم سب کی ملاقاتیں ریڈیو پاکستان کی عالمی سروس میں کالم نویسوں کی محفلیں ہونے لگیں ۔ اس محفل میں عالی جی پروڈیوسر ہوتے ۔ اور میں اور ابن انشا اور طفیل احمد جمالی اور ارشاد احمد خان اور انعام درانی اپنا اپنا کالم سناتے ۔ لیکن اس پروگرام کے دوران ، اس سے پہلے اور اس کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر جملے بازی ہوتی اور قہقہے گونجتے ۔ ایک مرتبہ عالی نے ان سے کہا : "یار انشا تم زبان تو دلی والوں کی لکھتے ہو لیکن جب بات کرتے ہو تو سارا ملمع اُتر جاتا ہے ۔ اور گنوار معلوم ہوتے ہو ۔" عالی نے جلیس سے پوچھا تو جلیس نے کہا ۔" ہاں انشا جی ! عالی جی ٹھیک کہہ رہے ہیں ۔" تو انشا جی نے کہا ۔ "ماشاءاللہ اب تو دکنی بھی زبان کے معاملے میں بولنے لگے ۔"

انشا جی سے مل کر سارے دُکھ دلدر دور ہو جاتے اور دل ہلکا ہو جاتا ۔ انشا جی بہت کم

لوگوں سے کھُلتے تھے۔ بہت لیے دیے رہتے اور جب کھُلتے تو یوں لگتا کہ جیسے بہار آگئی ہے۔ وہ لطیفے سُنا کر یا گدگدیاں کر کے ہنسانے والوں میں نہیں تھے..... اُن کی باتیں سُن کر دل کی گہرائی سے ہنسی کے فوارے چھوٹتے۔ ایک دن میں ان کے دفتر گیا تو کہنے لگے "اچھا ہُوا تم آگئے۔ اب میں تمھارے ساتھ عید کا چاند دیکھوں گا" چناں چہ شام کو میں اور انشاجی فٹ پاتھ پر آکر چاند دیکھنے لگے۔ وہ مجھ سے کہتے "تم چاند دیکھو" میں کہتا۔ "تم کیوں نہیں دیکھتے؟" تو کہنے لگے "یار آج تو مجھے سُورج تک نظر نہیں آرہا ہے۔ اور تمھیں جو میں نے روکا ہے وہ چاند دیکھنے کی غرض سے تو روکا ہے۔ اس سے پہلے میں خود چاند دیکھا کرتا تھا۔ لیکن آج میرا چشمہ ٹوٹ گیا ہے" خیر جب چاند دیکھنے کا اعلان ہو گیا تو میں نے انشاجی سے پوچھا۔ "اب میں گھر جاؤں؟" تو کہا "اور مجھے میرے گھر کون پہنچائے گا؟" چناں چہ میں انھیں اُن کے گھر چھوڑ آیا۔

ایک دن انشاجی نے کہا "میں نے ایک نظم لکھی ہے" اور وہ اپنی نظم سُنانے لگے۔ اور میں ہنسنے لگا۔ کہنے لگے "بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا "دیکھو انشاجی میں تمھیں مزاح نگار سمجھتا ہُوں۔ اسی لیے میں یہ سمجھا کہ یہ نظم بھی مزاحیہ ہو گی۔ ویسے وہ جب بھی میں نظم یا غزل پڑھتے تھے، اس پر مجھے کیا سب کو ہنسی آتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ انشاجی بڑے شاعر تھے، لیکن میں انشاجی کو بڑا مزاح نگار سمجھتا تھا۔

جب امانت علی خان نے انشاجی کی یہ غزل گائی کہ:

"انشاجی اٹھو اب کوچ کرو"

تو یہ غزل سُن کر نہ جانے کیوں میرے آنسو نکل آئے۔ اور میں نے انشاجی کو ٹیلی فون پر بہت بُرا بھلا کہا کہ تم نے ایسی منحوس غزل کیوں لکھی ہے۔ انشاجی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور پھر یہ خبر آئی کہ امانت علی خان کہ جس نے بڑے گہرے جذبے کے ساتھ یہ غزل گائی تھی، وہ کوچ کر گیا۔ پھر تسنیم فاضلی نے اس غزل کا ڈھانچہ بدلا تو انشاجی کو بہت دُکھ پہنچا اور انھوں نے ٹیلی فون پر مجھ سے کہا "تسنیم فاضلی کی سینہ زوری دیکھی؟" میں نے اس پر ایک کالم بھی لکھا۔ اور پھر یہ ہُوا کہ گھر گھر یہ غزل کہ "انشاجی اٹھو اب کوچ کرو" گائی جانے لگی۔ اور کچھ دنوں بعد انشاجی بھی لندن میں کوچ کر گئے۔

اور یوں یہ ہنسنے ہنسانے والا ہنستے ہنستے ہم سب کو رُلا گیا۔ اللہ تعالےٰ اس کی رُوح پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ (آمین)

جب طفیل احمد جمالی کی موت کی خبر شہر میں عام ہوئی تو انشاجی کے چھوٹے بھائی محمود ریاض یہ خبر سنتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ چناں چہ میرے کہنے سے انشاجی نے محمود ریاض کے دل کا معائنہ

کروایا اور ساتھ ساتھ اپنا بھی معائنہ کروا آئے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ محمود ریاض کے دل کا معائنہ کروانے کی کیا رپورٹ ملی تو کہا: "اس کا دل تو نارمل نکلا البتہ میرا کلوسٹرول بڑھا ہوا تھا۔"

ایک دن میں اور انشا جی اور شہاب صاحب اور محمود ریاض انشا جی کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ محمود ریاض کی طبیعت ابھی سنبھلی نہیں تھی۔ اُس نے پانی مانگا۔ ملازم پانی لے کر آیا اور محمود ریاض کی جگہ انشا جی پی گئے۔ محمود ریاض نے کہا۔ "بھائی جان! پانی تو میں نے منگوایا تھا۔" تو انشا جی نے کہا۔ "جب ہی میں یہ سوچ رہا تھا کہ بغیر پیاس کے یہ پانی کیوں پیا؟" ویسے انشا جی بدحواس بھی غضب کے تھے۔ جو خط مختار صدیقی کو لکھتے اسے قدرت اللہ شہاب کے لفافے میں ڈال دیتے۔ اپنے چشمے کی جگہ میرا چشمہ لگا کر یہ سوچتے کہ انھیں اس چشمے سے نظر کیوں نہیں آرہا ہے۔ ان کے مزاج میں بڑی نفاست تھی۔ وہ اپنے لکھنے پڑھنے کے کام بڑے سلیقے سے کرتے۔ وہ اپنے خول میں رہ کر سب کچھ دیکھتے اور سنتے اور کبھی کبھی خول سے گردن باہر نکال کر دُنیا کے کاموں میں بھی شریک ہو جاتے۔

انشا ہمیں سدا بہار پھلجھڑیاں دے گیا ہے۔ اردو ادب میں مزاح کے ایسے پھول کھلا گیا ہے جو ہمیشہ تر و تازہ رہیں گے۔

طفیل احمد جمالی

ویسے تو "چالو" بازاری لفظ ہے لیکن اکثر لکھنے لکھانے میں ایسے مواقع آتے ہیں کہ اس قبیل کے الفاظ مافی الضمیر کو واضح کرنے میں بڑا کام کر جاتے ہیں۔ مثلاً طفیل احمد جمالی کے بارے میں یہ کہوں گا کہ نثر ہو یا نظم، تقریر ہو یا عام بات چیت، جب وہ "چالو" ہوتا تو یوں لگتا تھا جیسے ایک دریا ہے جو رواں دواں ہے۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ آپ ان کی تحریر پڑھ کر یا خود ان سے اسے سن کر بور نہیں ہوتے تھے —— یہی ان کی بات چیت کا انداز تھا۔ وہ بولتے تو ان کے ایک ایک فقرے پر لوگ لوٹ پوٹ ہو جاتے اور جمالی کے قہقہے بھی قہقہہ آور ہوتے۔ وہ جملے باز اس بلا کے تھے کہ ادھر آپ کے منھ سے جملہ نکلا اور ادھر انھوں نے ترت سے جواب میں ایسا جملہ رسید کیا کہ آپ کا جملہ ڈھیر ہو گیا۔ ان کی نثر پڑھیے تو جمالی صاحب کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ خود بول رہے ہیں ۔ ان کی شخصیت میں بناوٹ نام کو نہیں تھی، اسی طرح ان کی تحریروں میں بھی بناوٹ نہ تھی۔ بس پڑھتے جائیے اور ہنستے مسکراتے جائیے۔ عجب زندہ دل اور مرنجان مرنج آدمی تھا۔ وہ جان انجمن ہی نہیں تھا، خود بھی ایک انجمن تھا۔

مکتب سے فارغ ہو کر مغربی تعلیم کے مدارج سے گزرا اور آخر میں الہ آباد یونی ورسٹی سے اردو میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ یوں تو جمالی کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا لیکن نصاب کی کتابوں میں اس کا جی نہ لگتا۔ جمالی کے ساتھیوں کا کہنا ہے ہم پڑھ پڑھ کر مر جاتے اور جمالی کتاب اٹھا کر بھی نہ دیکھتا، البتہ امتحانوں کے دنوں میں وہ ہماری باتیں سنتا اور امتحان میں بیٹھ جاتا اور جب نتیجہ نکلتا تو جمالی کی پوزیشن ہم سے اچھی ہوتی۔

جمالی درمیانے قد کا آدمی تھا۔ گٹھا ہوا جسم، بھورے بال، بھوری آنکھیں، رنگ گورا چٹا، آواز مولویوں ایسی، منھ کھول کر لیکن آواز ناک سے نکلتی۔ جو لباس پہنتا وہ اس کے جسم پر کھب جاتا۔ وہ خوش پوش بھی تھا اور خوش خوراک بھی۔ چٹورپن میں دلی والوں کو مات کرتا۔ مٹھائی اور بالائی بڑے ذوق وشوق سے کھاتا۔

جمالی جس روانی سے اردو بولتا اور لکھتا تھا، اسی روانی سے انگریزی بھی بولتا اور لکھتا تھا۔ چنانچہ پاکستان کے انگریزی اخباروں کے لیے میں نے جمالی کو اس طرح لکھتے دیکھا ہے کہ وہ باتیں بھی کر رہا ہے

اور مضمون بھی لکھ رہا ہے۔ اے ٹی چودھری نے جمالی سے مارننگ نیوز کے لیے مضامین لکھوائے۔ اے ٹی کو بہت کم لوگوں کی انگریزی پسند آتی ہے پھر ایک دن ایسا ہوا کہ میرے منہ سے ایک بات ایسی نکل گئی کہ جمالی نے انگریزی لکھنا چھوڑ دی۔ جمالی سے میں نے کہیں یہ کہہ دیا کہ تمھاری انگریزی میں مجھے بابائے اردو کی داڑھی نظر آتی ہے! پھر اس دن سے مرتے دم تک جمالی نے انگریزی میں مضمون نہیں لکھا۔ اب میں سوچتا ہوں تو مجھے ندامت ہوتی ہے۔ میں نے تو یہ محض تفریحاً کہا تھا لیکن جمالی سیریس ہو گیا۔

جمالی کے بارے میں میں نے جو لفظ "جالو" استعمال کیا ہے تو میرے خیال میں اس کی پوری زندگی اس لفظ میں سمٹ آئی ہے۔ جمالی بلا کا ذہین تھا اس میں بڑی صلاحیتیں تھیں۔ وہ ہر موضوع پر اس طرح بولتا اور لکھتا جیسے یہ اس کا خاص موضوع ہے اور اس میں بھی وہ طنز و مزاح کے پہلو نکال لیتا۔

جب کراچی سے روزنامہ "امروز" جاری ہوا تو اس کے سنڈے ایڈیشن میں جمالی کا مضمون "اگر تو برا نہ مانے"، "بت شکن" کے قلمی نام سے شائع ہوا کرتا تھا۔ امروز کے سنڈے ایڈیشن کو وہ لوگ بھی جو امروز باقاعدہ نہیں پڑھا کرتے تھے ضرور خریدتے تھے اور جمالی کا مضمون پڑھتے ہی نہیں تھے اوروں کو بھی پڑھ کر سناتے۔ اس طرح ہر اتوار کی صبح گھروں میں قہقہے بلند ہوتے۔ "اگر تو برا نہ مانے" پڑھ کر جمالی کی ذہانت اس کے مطالعے اور مشاہدے اور زبان پر اس کی بھرپور قدرت کا اندازہ ہوتا تھا۔

جمالی ایسے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے معاشرے کو ایک شکایت رہی ہے اور وہ یہ کہ قدرت نے انھیں جن صلاحیتوں سے نوازا تھا وہ ان تمام صلاحیتوں کو اپنے ساتھ لے کر قبر میں سو گئے، لیکن سچ پوچھیے تو اس میں خود معاشرے پر بھی الزام آتا ہے۔ جمالی ایسے لوگوں کی مثال تو ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی ہے۔ سمندر بکھرتا ہے اور پھیرتا ہے۔ سنورتا اور سمیٹتا نہیں ہے۔ سمندر سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ اس کی تہ میں سے قیمتی موتی نکالتے ہیں اور اس کے ذخائر کو محفوظ کرتے ہیں۔ جمالی نثر میں بکھرتا ہے۔ البتہ غزل میں کبھی کبھی وہ سمٹتا ہوا پایا جاتا ہے۔ اس کی نثر میں گھن گرج ہے، مزاح کی پھوار ہے اور طنز کی کڑکتی ہوئی بجلیاں ہیں۔ لیکن اس کی غزلوں میں محبت کا رس ہے جمالی باہر سے نثر تھا اور اندر سے غزل تھا۔

جمالی جس طرح اپنی نثر میں "جالو" تھا، اسی طرح وہ عام زندگی میں بھی جالو رہا۔ اس کی زندگی کا بڑا حصہ ایسا گزرا ہے جس میں کوئی ٹھہراؤ نہیں۔ آج آپ کے یہاں ہے کل میرے یہاں، جو کمایا وہ اڑایا۔ کچھ دن ٹھاٹ سے گزارے اور پھر وہی قرض ادھار۔

ایک دن جمالی سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگا یار! جن لوگوں کی وجہ سے میں نے ہجرت کی تھی وہ کم بخت بھی ہجرت کر کے یہاں چلے آتے ہیں۔ آج برنس روڈ پر ایک شخص نے مجھے آواز دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میری روح پرواز کر گئی۔ یہ وہ سود خور تھا جس سے میں نے دلی میں قرض لیا تھا۔ اب

میری یہ حالت کہ نہ تو ٹھہر سکتا ہوں اور نہ دوڑ سکتا ہوں۔ خیر بڑی مشکل سے پیچھا چھڑا کر آیا ہوں۔ اب کون جانے کہ اور کتنے قرض خواہ یہاں آچکے ہیں"! شروع شروع میں جمالی کی گذر بسر امروز کے کالم کے معاوضے پر تھی۔ کبھی کبھی ریڈیو کے مشاعرے سے بھی کچھ مل جاتا۔ دو چار دن ہوٹل فردوس میں خوب کھاتا پیتا۔ رہائش کا یہ تھا کہ شروع میں حضرت قبلہ ظفر احمد انصاری کے یہاں اٹھ آیا۔ ان سے بڑی بے تکلفی تھی۔ ظفر احمد انصاری صاحب دوستوں میں بڑے بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ بڑے زندہ دل اور باغ و بہار انسان ہیں۔ موصوف کسی زمانے میں شاعری بھی کیا کرتے تھے اور جمالی بھی اکثر ان کے اشعار سنایا کرتا تھا۔ جمالی کی طبیعت میں قرار نہیں تھا چنانچہ کچھ دنوں بعد اس نے یہاں سے بھی بستر باندھا اور پھر اپنے الہ آباد کے دوستوں فضیل اور جمیل برادران کے یہاں جا کر کھول ڈالا۔ کچھ دنوں وہاں رہا اور پھر وہاں سے بھی چل دیا۔ مستقلاً کسی سے بنا رہنا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔

ایک دن مجھے جمالی صدر میں مل گیا، پوچھا۔ جیب میں پیسے ہیں۔ میں نے کہا ہاں پانچ روپے ہیں۔ بولا بس بس بہت ہیں۔ کیفے جارج کے قریب ایک لڑکا جو دس بارہ برس کا ہوگا بیٹھا کرتا تھا اور جوتوں پر پالش کیا کرتا تھا، جمالی نے اس سے کہا۔ نکال دس روپے۔ اور لڑکے نے دس روپے کا ایک نوٹ اسے تھما دیا۔ میں نے پوچھا۔ یہ کیا؟ جمالی نے کہا۔ اِدھر اُدھر سے جو پیسے ملتے ہیں وہ اس کے پاس رکھ دیتا ہوں اور جتنی ضرورت ہوتی ہے اس سے لے لیتا ہوں اور دو چار روپے چھوڑ دیتا ہوں۔

جمالی کی پوری زندگی کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں میں گذری لیکن وہ خود کمیونسٹ تھا نہ سوشلسٹ۔ ایوب خاں کے عہد حکومت میں رائٹرز گلڈ قائم ہوا۔ اس کے کرتا دھرتا عالی جی تھے۔ عالی جی نے جمالی کو اٹھایا اور "ہم قلم" کا ایڈیٹر بنا دیا۔ اس کی مالی حالت سدھر گئی۔ ادھر جمالی کے دوسرے جگری دوست جمالی ایاس نے مجید لاہوری کی بیوہ سے ہفت روزہ "نمک دان" کا ڈیکلیریشن لے لیا۔ اور اسے جمالی کے حوالے کر دیا۔ افضل صدیقی، مختار زمن، مشفق خواجہ اور راقم الحروف اس پرچے کا پیٹ بھرتے۔ خود جمالی کی نظمیں اور مضامین اس میں چھپتے۔ دوست احباب اشتہار دلوا دیتے۔ اور یوں جمالی کا ماہانہ پانچ سو روپے کا بندوبست ہو گیا۔ ادھر "حریت" کا اجرا ہوا۔ یہاں وہ روزانہ ایک قطعہ لکھتا اور پانچ سو روپے ماہانہ پاتا۔ سستا زمانہ تھا۔ اچھی خاصی گذر بسر ہو جاتی۔ میرے خیال میں تو جمالی کا یہی زمانہ سب سے اچھا زمانہ تھا۔ کاش جمالی کا یہ زمانہ آگے نہ بڑھتا اور وہ اسی زمانے میں مر جاتا۔ لیکن قدرت کے کھیلوں کو کون سمجھتا ہے۔ جمالی نے اپنے سے بہت چھوٹی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ ادھر عالی جی کی کوششوں سے وہ روزنامہ "انجام" کا ایڈیٹر ہو گیا۔ اب اس کے ٹھاٹ باٹ ہی اور تھے۔ جمالی وہ پہلا سا جمالی نہیں رہا تھا۔ بیوی اور ایڈیٹری سے اس کا معیار زندگی اور اس کی ضرورتیں اور بڑھ گئیں۔

ایک تو اس کی تلون مزاجی اور دوسرے جوان بیوی کے چونچلے اور مطالبے، ازدواجی زندگی نے اس سے اس کی درویشی اور قلندری چھین لی اور اصل جمائی ختم ہو گیا اور ایک مصنوعی جمائی ابھر کر سامنے آ گیا۔ اب نہ وہ قلندرانہ ادائیں تھیں اور نہ وہ سکندرانہ جلال تھا۔

ایک مرتبہ ذوالفقار علی بخاری نے نہال سیوہاروی سے کہا کہ ریلوے کے محکمے میں دوڈھائی سو روپے میں تمہاری کیا گزر بسر ہوتی ہوگی۔ ریڈیو میں آ جاؤ۔ چھ سات سو روپے دلوا دوں گا۔ اس پر نہال صاحب نے کہا۔ یہ تو آپ نے صحیح کہا ہے لیکن وہ جو ہمارے جگر کے خون میں ڈوب کر اور بن سنور کر شعر نکلتا ہے اس کا کیا ہوگا۔

حاتی جی نے جمالی کو "انجام" کا ایڈیٹر بنوا دیا تو معاشرے میں جمائی کا سر اونچا ہو گیا۔ رہنے کو جمائی کو شان دار رہائش گاہ ملی، موٹر، ملازم، باورچی اور پھر بیگم۔ باقی لوازمات کی حیثیت جمالی سمیت بیگم کے آگے ثانوی ہو گئی۔ اور یہاں سے زندگی کا معیار اوپر سے اوپر ہوتا گیا اور ضرورتوں میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ چنانچہ بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور پیسے کے چکر میں ادیب اور شاعر اور صحافی اور قلندر جمالی شعر و ادب اور صحافت کے دائرے سے نکل کر پیسہ اور صرف پیسہ کمانے کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔

وہ پاکستان سے چین گیا لیکن چین میں بھی اس کی گزر بسر نہ ہوئی اور پھر وہ پاکستان چلا آیا اور یہاں بیمار ہو گیا۔ ایک دن کسی نے مجھے بتایا کہ جمائی کو کینسر ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہم سب جو جمائی کے چاہنے والے تھے، برابر اس کے یہاں پہنچتے رہے اور اسے تسلیاں دیتے رہے۔ کینسر کا محض شبہ تھا۔ جب میں جمائی سے ملا تو اس نے کہا۔ اب بچنے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ کچا ساتھ ہے۔ اب کیا ہو گا؟ میں نے کہا، تمہارے گھر کے سامنے جو مسجد ہے، میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ جب سے تم بیمار ہوئے ہو، اس میں نمازیوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ یہ سب تمہارے قرض خواہ ہیں۔ بے چارے پانچوں وقت دعا کرتے ہیں کہ مولا کہیں سود کے ساتھ اصل نہ ڈوب جائے۔ یقین جانو اللہ تعالیٰ ان کی ضرور سنے گا۔ وہ اپنے گنہ گار بندوں کی دعا ضرور سنا کرتا ہے اور پھر جب وہ سود بھی معاف کرنے کو تیار نہیں تو بھلا کیوں نہیں سنے گا؟" جمالی اتنا ہنسا کہ لوٹ پوٹ ہو گیا اور دوسرے دن جمائی کے ایک دوست ہسپتال سے یہ رپورٹ لے کر آئے کہ جمائی کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ لیکن اس زمانے میں جب جمائی کی مالی حالت انتہائی خراب تھی۔ میں نے یہ دیکھا کہ دونوں وقت کا کھانا کیفے ڈی خان سے آتا ہے۔

جمائی کے بارے میں میں پہلے یہ عرض کر چکا ہوں کہ وہ کسی سے نباہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات اس کی فطرت کے خلاف تھی۔ وہ دوسروں پر الزام لگاتا، ان سے تعلقات بگاڑ لیتا۔ لیکن نہ جانے اس میں ایسی کیا بات تھی کہ جو ایک بار اس کے قریب آ جاتا پھر اسے نہ چھوڑتا۔ اس کی بدگمانیاں

بھی سہتا، اس کے طنز بھی برداشت کرتا اُس کے ہاتھوں نقصان بھی اٹھاتا لیکن جب اس پہ وقت پڑتا تو سب اگلی پچھلی باتیں بھول کر اس کی مدد کو پہنچ جاتا۔ جمالی میں جہاں بے اعتنائی اور توتا چشمی تھی وہاں یہ بھی تھا کہ وہ اپنے پرائے کو تکلیف میں دیکھ کر رو دیتا۔ اس کا دل موم کی طرح پگھل جاتا اور وہ لٹ جاتا۔ بہت سے لوگوں نے اسے اس طرح لوٹا بھی ہے، تو پھر یہ بے اعتنائی یہ خود غرضی، اور اس کے ساتھ ساتھ دردمندی اور دل سوزی کے کیا معنی ہیں۔ وہ زندگی بھر بے چین اور بے قرار کیوں رہا۔ کسی سے اس نے بنا کر کیوں نہ رکھی۔ جان نچھاور کرنے والے دوستوں پہ اس نے اعتماد کیوں نہیں کیا۔ کیا جمالی مردم گزیدہ تھا؟ یہ جمالی کی زندگی کا بہت بڑا راز تھا۔ اگر کسی نے اس راز سے پردہ اٹھایا تو جمالی کی شخصیت بڑی آسانی سے سمجھ میں آنے لگے گی۔

جمالی کی موت پہ مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ زندگی میں وہ ایسی ہی حرکتیں کرتا تھا۔ چپ چپاتے نکل جاتا۔ آخری مرتبہ وہ بہت دور نکل گیا۔ اگر جمالی نے کسی سے نباہ کیا تو صرف اس عورت سے جس سے اس نے شادی کر لی تھی۔ اور اسی کی خاطر جمالی نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے دوستوں کو اس سے گلہ نہیں تھا۔ وہ خوش تھے کہ جمالی کسی کے ساتھ تو خوش ہے۔

ابراہیم جلیس

صفیہ جالندھری ایک لمبے تڑنگے، دُبلے پتلے، موٹے موٹے ہونٹوں اور گھونگر یالے بالوں والے ایک صاحب کو اپنے ساتھ لے کر میرے خیمے میں آئے اور اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ہیں ابراہیم جلیس۔ یہ کل ہی حیدرآباد دکن سے آئے ہیں۔ اور پھر چائے آئی۔ اور پھر ابراہیم جلیس کی جملے بازی شروع ہوگئی اور خیمے میں قہقہے گونجنے لگے۔ یہ خیمہ دراصل ریڈیو پاکستان کے دفتروں میں سے ایک دفتر تھا۔ کیوں کہ ریڈیو پاکستان اپنی عمارت میں نہیں تھا۔ کوئین روڈ پر انیٹلی جینس اسکول کی عمارت کی ایک بیرک میں ریڈیو پاکستان کے اسٹوڈیو تھے اور اس کے آس پاس خیموں میں دفاتر تھے۔ میں اور سلیمی حسین، جو اب سلیمیٰ احمد ہو گئی ہیں، اور خالد حسن قادری اور یونس واسطی اور رفیک محمد قریشی ایک ہی خیمے میں بیٹھا کرتے تھے۔ جلیس کی اس پہلی ہی ملاقات میں ہم ایک دوسرے سے کھل گئے۔ یوں لگا جیسے برسوں سے ملاقات ہے۔ بڑے کھلے دل اور بڑی کھلی طبیعت کا آدمی تھا۔ ایک منٹ کے لیے نچلا نہیں بیٹھتا تھا۔ کبھی اسے چھیڑتا کبھی اسے چھیڑتا۔ کبھی لفظوں کے اُلٹ پھیر سے ہنساتا۔ اور کبھی لطیفے پہ لطیفہ سناتا۔ وہ خود بھی ہنستا اور دوسروں کو بھی ہنساتا۔ پھر یہ ہُوا کہ کچھ دنوں کے بعد جلیس میرا پڑوسی بن گیا۔ اور اب روزانہ کئی کئی گھنٹے تک ہم گھل مل کر باتیں کرتے۔ وہ میرے گھر آجاتا اور کبھی میں اُس کے گھر چلا جاتا۔

شروع شروع میں جلیس نے "امروز" میں ملازمت کی اور پھر مجید لاہوری کے بعد وہ روزنامہ "جنگ" میں کالم نویس ہوگیا۔ یہاں شوکت تھانوی بھی تھے اور جلیس بھی تھا۔ جلیس کے کالم شوکت کے کالموں سے زیادہ پڑھے جاتے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ شوکت کا مزاج ڈرائینگ روم کا مزاج تھا اور جلیس عام لوگوں کی سوجھ بوجھ کے مطابق انھی کی زبان میں ان سے باتیں کرتا۔ اُس کے کالموں کا رنگ افسانوی بھی ہوتا اور کبھی کبھی ڈرامائی بھی۔ پھر جب امروز بند ہُوا تو انشاجی کے کالم بھی جنگ میں چھپنے لگے۔ اِنشاجی کی تحریر پڑھ کر

زیرِ لب مسکراہٹ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور کبھی کبھی دل کی گہرائیوں سے ہنسی پھوٹ نکلتی۔ لیکن جلیس عامی ادیب تھا۔ اُس کے کالم ہر طبقے میں مقبول ہوئے جلیس جس انداز سے لکھتا تھا اسی انداز سے بولتا بھی تھا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا کہ جیسے وہ کالم بول رہا ہے۔ جلیس مرحوم کا کچا سا تھ تھا۔ لڑکیاں جوان ہو رہی تھیں، لڑکے زیرِ تعلیم تھے۔ ایک لڑکے کی دماغی حالت کمزور تھی۔

اندر سے وہ بہت دُکھی تھا لیکن وہ قہقہے لگا کر اپنے دُکھ درد کے سارے گرد و غبار دُور کر دیتا۔ اپنے اُس لڑکے سے بھی وہ خوب مذاق کرتا جس کی دماغی حالت خراب تھی۔ کبھی کبھی وہ جھلا کر باپ کو ڈھیر کر دیتا لیکن جلیس کو غصہ نہ آتا۔ وہ اسے بھی ہنساتا۔ تنخواہ میں گزر بسر نہ ہوتی تو فلمی ڈرامے لکھتا۔ اِدھر اُدھر کے کام لے لیتا۔ کالم نویس کی حیثیت سے جلیس کی بڑی شہرت اور اہمیت تھی۔ لیکن مالی مجبوریوں کی وجہ سے اسے ایڈیٹری کا عہدہ بھی قبول کرنا پڑا۔ وہ "انجام" کا ایڈیٹر ہو گیا۔ اور پھر پیپلز پارٹی کے اخبار "مساوات" کا ایڈیٹر بھی ہوا۔ اور اسی ایڈیٹری میں وہ جان سے جاتا رہا۔

جلیس گپ مارنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو افسانہ بنا دیتا۔ ایک مرتبہ جلیس کی اسی گپ بازی اور گپ سازی کے بارے میں طفیل احمد جمالی نے یہ کہا کہ اصل میں ایک ماہر امراضِ قلب نے اس سے یہ کہہ رکھا ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی دن تیرے مُنھ سے سچ نکل گیا، اُسی دن تیرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ اس لیے جلیس احتیاطاً سچ نہیں بولتا۔ میرے خیال میں اگر جلیس جھوٹ نہ بولتا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اتنا بڑا کالم نویس بھی نہ بنتا۔ ایسے جھوٹ کو جس سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور جو کسی بڑے جھوٹ کو واضح کرنے کے لیے بولا جائے، جھوٹ نہیں سمجھنا چاہیے۔ ایک مرتبہ جلیس ہمیں یہ سُنا رہا تھا کہ مرحوم ایوب خان نے جلیس کے اخبار کے مالک سے یہ کہا ہے کہ یہ لفنگا جلیس اپنے کو سمجھتا کیا ہے، تو اس پر خواجہ معین الدین مرحوم زیرِ لب اپنی مخصوص ہنسی ہنسنے لگے جلیس نے کہا "بتا خواجہ تو کیوں ہنستا ہے۔ کیا تجھے میری بات پر یقین نہیں آیا؟"

خواجہ صاحب نے کہا "نہیں یہ بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایوب خان کے بارے میں میرا یہ خیال نہیں تھا کہ وہ مردم شناس بھی ہے۔"

جلیس نے ایک ہفت روزہ اخبار "عوامی عدالت" کے نام سے نکالا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے کراچی کے کمشنر سے کہا کہ میرے اخبار کے پہلو میں جو سڑک ہے اُس کا نام میرے اخبار کے نام پر رکھ دیجیے تاکہ اگر اخبار نہ چلے تو اس اخبار کے نام سے یہ سڑک ہی چلتی رہے۔

ایک دن میں اور جلیس، دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر اپنے اپنے کالم لکھ رہے تھے۔ میں نے کالم لکھنے کے بعد جلیس سے کہا کہ "یار آج کالم بہت پھیکا ہے"۔ جلیس نے کہا کہ "چار آنے ہیں اور کتنا گڑ ڈالو گے"۔ اس زمانے میں اخبار کی قیمت چار آنے تھی۔

میری اہلیہ کے جنازے میں جلیس میرے ساتھ تھا۔ جب ہم قبرستان سے واپس آئے تو جلیس نے کہا۔ "خان صاحب! میں سوئم میں شریک نہیں ہو سکوں گا کیوں کہ مجھے صرف چنے پڑھنے آتے ہیں"۔

جلیس بہت تھوڑے دن پنجاب میں رہا۔ لیکن وہ پنجابی یوں بولتا تھا کہ جیسے وہ اصل پنجابی ہے۔ قاسمی صاحب جب کراچی آتے تو وہ ان سے کہتا۔ "آپ لاہور کب جا رہے ہیں"۔ قاسمی صاحب یہ کہتے کہ میں فلاں دن جا رہا ہوں۔ تب وہ کہتا "کمال ہے میں نے اس کے دوسرے دن آپ کی دعوت کا انتظام کیا تھا"۔ ایک مرتبہ قاسمی صاحب اور جلیس کا لطیفے سنانے کا مقابلہ ہوا، لیکن جلیس بری طرح ہار گیا۔

ایک مرتبہ کراچی پریس کلب میں "ادب و صحافت کے رشتے" کے موضوع پر بہن ہاجرہ مسرور کو ایک مقالہ پڑھنا تھا۔ احمد علی خان صاحب بھی ان کے پاس بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہاجرہ مسرور مقالہ پڑھتیں، جلیس نے کہا کہ "ادب و صحافت میں وہی رشتہ ہے جو ہاجرہ مسرور اور احمد علی خان میں ہے"۔

اگرچہ ابراہیم جلیس ہمارے درمیان سے اٹھ گیا لیکن اس کی باتیں ہمیشہ یاد آتی رہیں گی۔

آغا خلش کاشمیری

ایسا بدنصیب انسان شاید ہی کبھی پیدا ہُوا ہو۔ اس نے سیکڑوں کو بنایا اور خود کو بگاڑا۔ بڑا ذہین آدمی تھا۔ اگر صحیح راستے پر لگ جاتا تو دُوسرا ظفر علی خاں ہوتا۔ فارسی، اُردو، ہندی اور پنجابی میں شعر کہتا۔ کڈھب قافیوں اور سنگلاخ زمینوں میں شعر کہتا۔ غنڈوں میں غنڈہ، شریفوں میں شریف، عالموں میں عالم۔ کبھی صوفی اور کبھی سوفی۔ کبھی ڈاڑھی مونچھیں رکھ لیں اور ساری ساری رات عبادت میں گزار دی۔ اور کبھی چار ابرُو کا صفایا، سرگھوٹ موٹ، کانوں میں بالے، جوگیوں کا لباس۔ ہاتھ میں چمٹا۔ کبھی محلے کے لونڈے لاڑیوں میں بیٹھا بازاری حرکتیں کر رہا ہے تو کبھی علّامہ عنایت اللہ خاں مشرقی اور مولانا ظفر علی خان سے اُلجھ رہا ہے کبھی پنجابی شاعروں کا ناطقہ بند کر رہا ہے تو کبھی اُردو کے مشاہیر شعرا کے بخیے اُدھیڑ ڈالے۔ کبھی فقہ و حدیث پر آیا تو علماء کو پریشان کر ڈالا۔ کبھی گرنتھ کی تشریح کرنے پر آگیا تو سکھ مذہب کے عالموں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

نام غلام احمد بٹ اور تخلص خلش۔ امرت سر کی عدالت خفیفہ میں اہلمد تھا بچ پناہ مانگتے۔ وکیل گھبراتے۔ جو کماتا، لٹا دیتا۔ سارا دن گھومتا رہتا۔ ساری رات گھومتا۔ جہاں کھڑا ہوتا محفل لگ جاتی شعر کہتا تو اس میں اعتراض کا کوئی پہلو ضرور رکھتا۔ اور اگر کوئی قسمت کا مارا اعتراض کر بیٹھتا تو اساتذہ کے اشعار سند میں پیش کرتا۔ یہ سارا سامان شعر کہتے ہی مہیا کر لیتا۔ مجھے اس وقت ایسا صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے اور شعر یہ ہے:

مجھے علاج تپ سوزش دروں دے دے
تو میرے درد بھرے قلب کو سکوں دے دے

جب ڈاکٹر تاثیر نے علاج دینے پر اعتراض کیا تو موصوف نے اساتذہ کے اسی قبیل کے بے شمار اشعار پیش کر دیئے۔

اس کا ایک مصرع ہے:

اے گندمی تبسم! اے بیسوی تکلم!!

یک صاحب نے کہا۔ یہ عیسوی تکلم تو خیر سمجھ میں آ گیا لیکن یہ گندمی تبسم کیا۔ فرمایا۔ ایک پیغمبر کا نام آیا تو بات آپ کی سمجھ میں آ گئی۔ اور ابوالبشر کا نام نہیں لیا تو آپ کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔

جب مجلسِ احرار نے روزنامہ "احسان" اور "زمیندار" کی ضبطی کے بعد روزنامہ "مجاہد" جاری کیا تو آغا صاحب کی نظمیں اس کے سرورق پر شائع ہوتی رہیں۔

ہم چند دوستوں نے مل کر آغا صاحب کی ادارت میں ۱۹۳۷ء میں امرت سر سے ایک ادبی ماہنامہ "آبشار" نکالا۔ اس کے اجرا سے پہلے ہم نے امرت سر اور لاہور کی دیواروں پر قدِ آدم پوسٹر لگائے جس کی سرخی کچھ اس طرح کی تھی:

آسمانِ ادب

پر

ایک اور درخشندہ ستارے کا طلوع ـــــ آبشار

یہ وہ زمانہ تھا جب امرت سر سے غازی عبدالرحمٰن صاحب کی ادارت میں روزنامہ "مساوات" کا اجرا ہوا تھا۔ ادارۂ تحریر میں باری علیگ اور حاجی لق لق تھے۔ اسی اخبار میں منٹو اور حسن عباس انٹرنیس کا امتحان پاس کرکے باری صاحب کے زیرِ تربیت آ گئے تھے اور وہ خبروں کے شعبہ میں کام کر رہے تھے۔ حاجی لق لق نے اپنے مزاحیہ کالم میں ہمارے اس اشتہار کا مذاق اڑایا، اور یہ لکھا کہ آسمانِ ادب پر آخر کتنے ستارے طلوع ہوں گے۔ ایک دُم دار ستارہ طلوع ہوا تھا تو قحط پڑ گیا تھا۔ اب دیکھیں آبشار طلوع ہونے کے بعد کیا ظہور میں آتا ہے۔

آغا صاحب نے اس رسالے کے پہلے شمارے میں (جو آخری شمارہ بھی تھا) "سیلِ عرم" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جس میں مساوات کے ادارۂ تحریر کے ہر رکن کے پرخچے اڑائے۔

کہتے ہیں کہ آغا صاحب ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ زمانہ وہ تھا کہ اگر خدانخواستہ کوئی لڑکا کسی لڑکی کو یا کوئی لڑکی کسی لڑکے کو پسند کر لیتی تو دونوں کو آوارہ اور بدمعاش سمجھا جاتا تھا اور پھر سزا کے طور پر دونوں کی علیحدہ علیحدہ شادیاں کروا دی جاتیں۔ یہ گویا ان کی بدچلنی کی سزا ہوتی۔ ایسی ہی سزا سے آغا صاحب کے کردار میں بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔

جب منٹو نے روسی اور فرانسیسی افسانوں کے اردو میں ترجمے کروائے اور اس نے "ہمایوں" ساقی اور عالمگیر کے روسی اور فرانسیسی نمبر نکلوائے تو آغا صاحب بھی اس ٹیم میں شامل تھے۔ فیض صاحب بھی تھے، ڈاکٹر رشید جہاں بھی تھیں (جو اس زمانے میں امرت سر میں پریکٹس کر رہی تھیں) حسن عباس بھی تھے جو منٹو کے سب سے قریبی دوست اور اس کی ادبی زندگی میں اس کے شریک کار رہے ہیں اور آج کل کراچی میں مارے کھدیڑے پھر رہے ہیں۔ مشہور افسانہ نگار ابوسعید قریشی بھی تھے۔ اور ہمارے اور منٹو اور حسن عباس

رانا مبارک مند خان سالک
کے اُستاد جنھوں نے ہم میں اَدبی ذوق پیدا کیا تھا۔ یعنی ....
صہبائی بھی تھے۔ آغا خلش کاشمیری نے روسی اور فرانسیسی طویل منظوم افسانوں کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا۔
اور ہم نے آغا صاحب کو ترجمہ کرتے اس طرح دیکھا ہے کہ سامنے کتاب رکھی ہے اور وہ قلم برداشتہ منظوم
ترجمہ کر رہے ہیں۔ اور ایک نشست میں پُوری نظم کا ترجمہ کر کے اُٹھے۔
ان میں سے بیشتر منظوم مختصر افسانے یا طویل افسانے یا تو کسی کے نام ہی سے نہیں چھپے، اور
چھپے تو صرف منٹو کے نام سے چھپے۔ باری صاحب کا زیادہ وقت منٹو اور حسن عباس کے ساتھ گزرتا اسی
زمانے میں منٹو نے باری صاحب کی نگرانی میں لامزریبا کا ترجمہ سرگزشت اسیر کے نام سے کیا۔ منٹو کو سب
ہی جانتے ہیں لیکن حسن عباس منٹو کی دوستی اور کچھ اپنی قلندری میں مارا گیا۔ اب رہے آغا صاحب تو
وہ ایک ایسا سُورج تھے جس کی روشنی دوسرے ستاروں اور سیاروں کو چمکاتی ہے لیکن خود یہ سُورج ہمیشہ
گہن میں رہتا ہے آغا صاحب نے اپنے نام سے ایک دو نہیں، ہزاروں نظمیں اور غزلیں لکھی ہوں گی۔ لیکن
شاید ہی کسی کو اُن کے دو چار اشعار یاد رہے ہوں۔ اور پھر مشکل تو یہ تھی کہ جو اشعار ان کے اپنے نام سے
ہوتے ان میں وہ لڑنے جھگڑنے کی باتیں رکھتے۔ ان کی بہترین غزلیں دُوسروں کے نام سے شائع ہوتیں۔
اس طرح آغا صاحب اپنے پیچھے دواوین کی بجائے اپنے بے شمار شاگرد چھوڑ گئے۔
جب منٹو بمبئی گیا تو آغا صاحب سے اُس کی خط وکتابت جاری رہی۔ منٹو بمبئی میں اپنے لیے ادبی
فضا بنانا چاہتا تھا اور آغا صاحب سے بہتر یہ کام کون کر سکتا تھا۔ بمبئی سے نذیر لدھیانوی کا ایک فلمی
پرچہ ہفت روزہ "مصوّر" بڑی آن بان سے شائع ہوتا تھا۔ منٹو اس پرچے کا ایڈیٹر ہو گیا تھا۔ پھر
جب اسے ایک فلم کمپنی میں کہانی نویس کی جگہ مل گئی تو انھوں نے اپنی جگہ آغا صاحب کا تقرر کروا دیا۔
اور آغا صاحب اپنی سرکاری نوکری چھوڑ چھاڑ کر بمبئی چلے گئے اور یہاں اُس نے منٹو کے مخالفوں کو
وہ پھبتیاں دیں کہ رہے نام سائیں کا۔ اور منٹو کے لیے ادبی فضا ہموار کی۔ خلافت کے علی بہادر کے پرخچے
اُڑائے۔ بمبئی کے اَدبی حلقوں میں منٹو کے ساتھ ساتھ آغا صاحب کی بھی دھاک بیٹھ گئی۔ پھر حسن عباس
بھی چلے گئے۔ اس عرصے میں آغا صاحب کے خطوط برابر میرے نام آتے رہے اور وہ اپنے معرکوں کے
حالات بتاتے رہے۔ منٹو اُن سے مشورے بھی لیتا رہا۔ لیکن کوئی صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں
کہ منٹو کی افسانہ گری میں بھی آغا صاحب کا ہاتھ تھا۔ آغا صاحب کو افسانے سے کوئی مناسبت نہیں
تھی۔ وہ بے چارے تو خود اپنی زندگی کے طویل اور پیچیدہ افسانے میں اُلجھے رہے۔ اور پھر منٹو کی اَدبی ذہانت
شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ اُس کے افسانوں کا رنگ ڈھنگ ہی ایسا ہے کہ اُسے کوئی اپنا نہیں سکتا۔
منٹو کا ہر افسانہ خود منٹو ہے۔ پھر یہ خبر آئی کہ نذیر مر گیا اور مصوّر اور اپنا سارا جما جمایا کاروبار آغا صاحب
کو سونپ گیا۔ آغا صاحب کاروباری آدمی ہی نہیں تھے۔ لہٰذا وہ جما جمایا کاروبار آن کی آن میں بگاڑ

ضرور سکتے تھے۔ آغا صاحب نے کسی سے بنا کر نہیں رکھی البتہ وہ دو چار لوگ جنھوں نے آخری وقت تک ان سے نباہ کیا تو یہ اُن لوگوں کا کمال تھا اور یقیناً ایسے لوگوں کی ضرور بخشش ہو جائے گی۔ آغا صاحب کی دوستی بڑی صبر آزما تھی۔

آغا صاحب باہر سے جتنے کڑوے تھے اندر سے اتنے ہی میٹھے تھے کسی پر وقت پڑتا تو اس پر اپنی جان قربان کر دیتے۔ اور اُس کو اس کا احساس بھی نہ ہونے دیتے۔ جو کچھ کماتے، دوستوں اور بالخصوص حاجتمندوں میں لُٹا دیتے۔ اُن کی شخصیت اس طرح کی تھی کہ آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ ایک بدنام سے بازار میں کھڑے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرافت کی اُونچی دوکانوں والے ایسے بازار میں کس طرح ٹِک سکتے ہیں۔

آغا صاحب نے ساٹھ سال کی عمر میں یہ سوچا کہ کیوں نہ وہ شادی کر ڈالیں، یہ بھی ایک اچھا مذاق رہے گا۔ چناں چہ ایک تیس برس کی توبہ زدہ عورت اُن کو پسند آگئی۔ جب بات پکی ہو گئی تو آغا صاحب نے قرض اُدھار لے کر دُلھن کے لیے بڑے قیمتی ریشمی لباس سلوائے۔ کچھ دوستوں کی مدد سے زیور بھی خریدا۔ نکاح سے کچھ دن پہلے عورت فرار ہو گئی۔ آغا صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے اُس کا پیچھا کیا۔ رقیب نے لاٹھی ماری جس سے آغا صاحب کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کئی دن ہاتھ پر پلستر چڑھا رہا۔ اور اب جو آغا صاحب گھر سے نکلتے تو "اپنی" دُلھن کا عرُوسی جوڑا اور زیور پہن کر نکلتے۔ کوئی پوچھتا کہ یہ کیا ہے۔ تو کہتے ۔۔۔ بھائی اپنے کیے کی سزا پا رہا ہوں۔ یہ ریشمی جوڑا جو مَیں نے اپنی دُلھن کے لیے سلوایا تھا، اب اس کا اس سے بہتر مصرف کیا ہو سکتا ہے۔

اور جب پاکستان بنا اور منٹو اور آغا صاحب کے دُوسرے احباب پاکستان چلے آئے تو آغا صاحب کی پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا۔ جب کبھی مَیں انھیں پاکستان آنے کے لیے لکھتا تو وہ یہی لکھتے کہ پاکستان میں پاک لوگ رہتے ہوں گے۔ مجھ ایسے ناپاک کی وہاں کہاں گنجائش ہو گی۔ پھر میری ماں زندہ ہوتی تو ضرور آتا۔ میرا شہر پاکستان میں ہوتا تو بھی آتا۔ دو بھائی ہیں، اُن کا اپنا اپنا راستہ ہے۔ خدا انھیں خوش رکھے۔ میری ایک گڑیا سی بہن ہے (جب میری چھوٹی بہن پیدا ہُوئی تھی تو آغا صاحب نے اُسے گود لے لیا تھا اور اُس کا نام محمُودہ رکھا تھا۔ کیوں کہ یہ اُن کی اکلوتی مرحومہ بہن کا بھی نام تھا جو بچپن ہی میں مر گئی تھی) سو اس کی یاد اکثر آتی ہے اور وہ بھی اپنے گھر کی ہو گئی۔

آغا صاحب کا بمبئی میں بھی کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ سکھوں کے محلے میں ایک چھوٹی سی کھولی میں رہتے تھے۔ ہندو مُسلم فسادات شباب پر تھے۔ وہ صبح اٹھتے تو محلے کے سارے سکھوں کا مذاق اڑاتے۔ اُن کو گالیاں سُناتے اور اپنے کام پر نکل جاتے لیکن سکھ ان کا احترام کرتے اور اُن پر جان دیتے۔

اگرچہ مصوّر کا آغا صاحب کباڑا کر چکے تھے۔ کسی سے بنا کر رکھنے کے فن سے تو وہ واقف ہی نہیں تھے۔ البتہ دشمن بنانے میں ضرور ماہر تھے۔ "مصوّر" جاری رہتا تو کیوں کر رہتا لیکن آغا صاحب کی جیب میں جب بھی تھوڑے سے پیسے آتے وہ دو چار صفحوں پر ہی اُسے نکال ڈالتے۔ اس میں کچھ وضع داری بھی تھی اور کچھ اپنے ذوق کی تسکین بھی۔

شاید ۱۹۵۲ء میں آغا صاحب ایک مہینے کے لیے پاکستان آئے۔ لاہور گئے اپنے بھائیوں سے ملے۔ کراچی آئے تو میرے یہاں قیام رہا۔ اس زمانے میں کیلے چھلکوں سمیت کھانے کا شوق چرایا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کہنے لگے تم نہیں جانتے کیلے کے چھلکوں میں ضرور کوئی وٹامن ہوگا جس کا اب تک ماہرین طب نے پتا نہیں چلایا لیکن مجھ ان چھلکوں سے بہت فائدہ ہوا ہے۔ میں نے کہا کیا فائدہ ہوا۔ فرمایا: "ایک سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ پیٹ بھر جاتا ہے اور دنوں بھوک نہیں لگتی۔" اور پھر جو آغا صاحب گئے تو پلٹ کر نہیں آئے۔

جب ۱۹۵۴ء میں میری ہمشیرہ اور اُس کے شوہر بمبئی گئے تو بڑی مشکل سے انھیں آغا صاحب کے مکان کا پتا چلا۔ انھوں نے دروازے پر دستک دی تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے دروازہ کھولا اور پوچھا۔ "تم کون لوگ ہو اور کس سے ملنا چاہتے ہو؟"

میری بہن نے کہا۔ "میں خلش صاحب کی بہن ہوں۔ کیا وہ یہاں رہتے ہیں؟"

اس ادھیڑ عمر کی عورت نے کچھ اس طرح آغا صاحب کا نام پکارا کہ یوں لگا کہ جیسے وہ اپنے کسی ملازم کو آواز دے رہی ہے۔ دیکھا تو یہ آغا وہ آغا نہ تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ میلے کچیلے کپڑے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ دونوں بہن بھائی رونے لگے۔ اس ادھیڑ عمر کی عورت نے آغا صاحب سے پوچھا۔ یہ اچھی بہن ہے کہ خالی ہاتھ آئی ہے۔ آغا صاحب نے اُسے ڈانٹا تو اُس نے اور زیادہ اونچی آواز سے ڈانٹ کر کہا۔ "بہن کے سامنے رُعب جماتا ہے ابھی کان سے پکڑ کر گھر سے نکال دوں گی۔"

جب وہ عورت کسی کام سے باہر نکلی تو آغا صاحب نے کہا۔ "یہ میری بیوی ہے۔ میں اس سے شادی کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مصلحتوں نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے نباہنے پر مجبور کر دیا۔ بات یہ ہے کہ اسے شوہر نہیں ملتا تھا اور مجھے مکان۔" اور پھر ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور پھر کچھ مدت کے بعد یہ خبر آئی کہ آغا صاحب مر گئے۔

خواجہ معین الدّین

ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ "میں خواجہ معین الدین سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے آغا حشر کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ سید امتیاز علی تاج سے بارہا مل چکا ہوں اور اب یہ خواہش ہے کہ خواجہ معین الدین کی زیارت کروں۔" میں نے کہا۔ "خواجہ معین الدین سے مل کر تمھاری یہ خواہش پوری نہیں ہوگی۔" خیر ان کے اصرار پر میں نے ان کی ملاقات خواجہ صاحب سے کروائی۔ یہ بولتے رہے۔ خواجہ صاحب حسبِ عادت سنتے رہے۔ یہ جملوں پر جملے بولتے رہے اور خواجہ صاحب ایک جملے میں ان کے سارے جملوں کا جواب دیتے رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ بہت بڑے ڈراما نسٹ ہیں اور خواجہ صاحب ان کے تماشائی ہیں۔ جب ہم خواجہ صاحب کے گھر سے باہر نکلے تو انھوں نے کہا: "مجھے یقین نہیں آتا کہ جن صاحب سے آپ نے میری ملاقات کروائی تھی، وہ خواجہ معین الدین تھے۔ میں جب آغا حشر سے ملا تو ملتے ہی پتا چل گیا تھا کہ یہ آغا حشر ہیں لیکن خواجہ صاحب نے ایسا کوئی تاثر نہ چھوڑا۔"

خواجہ صاحب صرف اپنے دوست احباب کی محفلوں میں کھلتے تھے لیکن یہاں بھی ان کا یہ حال تھا کہ مرحوم ابراہیم جلیس ان پر چوٹیں کرتے رہتے اور یہ ایک خاص انداز سے مسکراتے رہتے۔ اور پھر وہ ایک بات ایسی کہہ دیتے کہ محفل میں ایک قہقہہ گونجتا اور اس قہقہے میں جلیس کا بھی قہقہہ شامل ہو جاتا۔ غرض کہ دوست احباب کی اس محفل کے باہر خواجہ معین عجز و انکسار کی تصویر بن جاتے۔ وہ سب کی سنتے اور بہت غور سے سنتے۔ اچھی بھی سنتے، بری بھی سنتے۔ برائی بھی سنتے اور جواب میں وہی ایک زیرِ لب مسکراہٹ۔ ان کی آنکھیں اور ان کے کان ہمیشہ کھلے رہتے لیکن ان کے ہونٹ کبھی کبھی کھلتے اور اسی انداز سے انھوں نے اپنی قوم کے عروج و زوال کا وہ ڈراما بھی دیکھا جو لال قلعے سے شروع ہوا اور لالوکھیت میں اب بھی جاری ہے لیکن اس ڈرامے کا یہ عظیم تماشائی اور یہ عظیم ڈراما نویس ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔ خدا اس کی روح پر اپنی رحمتیں نازل کرے (آمین)۔

خواجہ معین الدین کے ڈرامے ہماری قومی زندگی کے عظیم ڈرامے کے عکاس ہیں۔ اس ڈرامے میں زندگی کے وہ گوشے بڑی اہمیت کے حامل ہیں جنھیں خواجہ معین نے اپنے ڈراموں میں واضح کیا ہے اور ان میں اپنے خون کا رنگ بھرا ہے۔ خواجہ معین کے ڈرامے میں حالی کا مسدس بھی ہے اور اکبر کا طنز بھی۔ اور مقصد ان ڈراموں کا بھی کم و بیش وہی ہے جو حالی اور اکبر کا تھا۔

خواجہ معین الدین جس بے سرو سامان قافلے کے ساتھ اپنا گھر بار چھوڑ کر آئے تھے "اُن قافلے والوں کے پاس جو تھوڑا سا سامان رہ گیا تھا اس میں صرف چند خواہشیں تھیں، چند حسرتیں تھیں، چند آرزوئیں تھیں اور مسائل کا ایک انبار تھا۔ چند دیکھے ہوئے خواب تھے اور چند اَن دیکھے خوابوں کے دیکھنے کی آرزو تھی اور تلاشِ تعبیر کی حسرت، سو وہ الگ۔ ان کے سارے ڈرامے ہمارے قومی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سارے مسائل اُس وقت بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ ان میں کمی نہیں ہوئی ہے، اضافہ ہوا ہے۔ کیوں کہ جب قومیں اپنے مسائل حل نہیں کرتیں تو مسائل سے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح انڈوں بچوں کا یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔

حصولِ پاکستان میں ملتِ اسلامیہ نے جس جذبے سے کام لیا تھا، اور پاکستان کے قیام کی جس اہمیت کی وضاحت کی گئی تھی، خواجہ معین الدین کے ڈرامے اس کی تفسیر ہیں۔ اور جس نظریاتی تصادم سے ملتِ اسلامیہ پاکستان کے قیام کے وقت سے دوچار ہوئی تھی، وہی تصادم ہمیں خواجہ صاحب کے ڈراموں میں آج بھی نظر آتا ہے۔

نظریاتی یا قومی سطح پر ہمیں دو چیزیں نظر آتی ہیں۔ پاکستان اور خواجہ معین کے ڈرامے۔ یہ ڈرامے اُس وقت کے پاکستان کی آواز ہیں جب پاکستان نے جنم لیا تھا۔ اور آج جب ہم ان ڈراموں کو اپنے قومی ڈراموں میں شامل کرتے ہیں تو یہ ڈرامے ہماری قومی تاریخ کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے ڈرامے دیکھ کر ہمارے دلوں سے قہقہے نکلتے ہیں لیکن ان قہقہوں کے پیچھے ہمیں خواجہ معین الدین مرحوم کے دل سے اٹھتی ہوئی چیخیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ خواجہ صاحب کے ہر ڈرامے کے ہر جملے کے اندر ایک چیخ اور باہر ایک قہقہہ ہے جو اُن کے قومی درد کا ثبوت اور طنز کی ارفع و اعلیٰ مثال ہے: مرزا غالب بندر روڈ پر کے پیش لفظ میں جناب مختار مسعود یہ فرماتے ہیں کہ نظریاتی وابستگی کی شدت کے باوجود ان کے ڈراموں نے ہمیشہ تکنیکی اور فنی کمالات کی بنا پر خاص و عام سے داد پائی۔ ان پر کبھی ناصحانہ بوجھل پن، اصلاحی سخن، چاٹ یا اعصابی تھکن تقسیم کرنے والے ڈراما نویس کا الزام نہ آیا۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ لکیر کے فقیر حضرات اس کے باوجود اپنا روایتی ڈنڈا لیے خواجہ صاحب کے پیچھے آج بھی دوڑے آتے

ہیں اور ایک بزرگ نے تو خواجہ سے ان کی زندگی میں یہ سوال کیا تھا کہ "آپ کے ڈراموں میں ڈرامے ایسی کوئی بات نہیں۔ نہ اس میں کہانی، نہ پلاٹ، نہ تصادم، نہ نقطۂ عروج نہ اینٹی کلائمیکس۔ پھر ان پر ڈرامے کا اطلاق کیوں کر ہو سکتا ہے؟"

خواجہ صاحب نے کہا۔ "آپ ہی کوئی مناسب سا نام تجویز کر دیجیے۔ میں نے تو بہت سوچا میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

سچ تو یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے ڈرامے، ڈراموں میں ایک نظریاتی تجربہ اور بڑا بھرپور اور کامیاب تجربہ ہے۔ اور جیساکہ مختار مسعود صاحب نے کہا ہے: "ان کے ڈرامے نہ ہوائی قلعہ ہیں، نہ ریت کے محل۔ نہ شیشے کے گھر۔ یہ تو سیدھی سادی زندگی کی مدح میں لکھے ہوئے قصیدے ہیں۔ جن میں نہ تشبیب ہے نہ گریز۔ خواجہ صاحب نے تخیل کو روزمرہ زندگی کے لالوکھیت میں پابند کیا اور تخلیق سے سلامت روی کی ضمانت لے کر اسے صرف بندر روڈ تک جانے کی اجازت دی۔ ڈراما لکھتے ہوئے وہ حقیقت سے اس قدر قریب ہو جاتے کہ نقل میں ہوبہو اصل کی صورت اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔"

خواجہ معین الدین کے ڈراموں میں طنز اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ ان کا ہر جملہ برجستہ و برمحل، گویا طنز نگاری سے ان کے مکالمے ایسے تیکھے اور دل میں اترنے والے ہو جاتے کہ پھر ڈرامے کی روایات کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ مثلاً "مرزا غالب بندر روڈ پر" کا ایک منظر ہے کہ مرزا ایک ہوٹل میں ایک نوٹس لگا ہوا دیکھتے ہیں جس پر یہ عبارت لکھی ہے:

"حکومت کا بات کرنا۔ نسا کرنا اور ساڑی مارنا منا آہے۔"

نہ املا درست۔ نہ انشا درست۔ لیکن بات بالکل درست۔ ایک جگہ دلبر شاہ چھوٹے نواب سے کہتے ہیں:

"ٹوپی پہن لو برخوردار۔ ننگے سروں پر تاج برطانیہ کا سایہ ہوتا ہے۔"

اور حوالدار ٹیپو سے کہتا ہے: "شرم نہیں آتی تجھے اپنے آپ کو ٹیپو کہتے ہوئے؟" اور ٹیپو جواباً کہتا ہے: "اور شرم نہیں آتی تجھے ٹیپو کو اس بھیڑے حال میں دیکھ کر بھی کم بخت جب میں میسور کا بادشاہ تھا اور انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنا چاہتا تھا، اس وقت بھی تو نے چند ٹکوں کے عوض ایسا ہی لباس پہن کر میرے سینے پر گولی چلائی تھی۔ یہ دیکھو۔ یہ ٹیپو کا سینہ ہے۔ یہ مسلمانوں کی تاریخ کا سینہ ہے۔ آہ! اس سینے میں اپنے ہی بھائی کا خنجر چبھا ہوا ہے۔"

اسی ڈرامے میں قادر بندر والے کے پیچھے کھڑے ہو کر اسے کمر سے پکڑ لیتا ہے اور دونوں ایک ساتھ قدم اٹھا کے رکھتے ہیں مگر آگے نہیں بڑھتے۔

بندر والا اور قادر : "لیفٹ ۔ لیفٹ ۔ لیفٹ" (ترنم سے) "مجاہدانِ صف شکن ۔ بڑھے چلو بڑھے چلو"

بندر والا (نعرہ لگاتا ہے) "لے کے رہیں گے کشمیر"

قادر : "ابی سالا بولتا ہے بڑھے چلو بڑھے چلو"

بندر والا : "ارے بڑھتا کون ہے دیوانے، سب بولتے ہیں ۔ یہ تو سب بولنے کی باتیں ہیں میری جان!"

میں مضمون کو طول دینا نہیں چاہتا ۔ البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ آج بھی ہمیں ان ڈراموں کی ضرورت ہے ۔ خواجہ معین کے جملوں میں وہ نشتر ہے جو ہمارے جمود کو توڑ سکتا ہے اور جو خون ہماری بے عملی کی وجہ سے ہماری رگوں میں جم گیا ہے، یہ اس میں روانی پیدا کر سکتا ہے ۔ آج بھی ہمارے وہی مسائل ہیں اگرچہ آج وہ پہلے جیسا جذبہ کارفرما نہیں ہے ۔ اس جذبے کو خواجہ معین کے ڈراموں سے انگیخت کیا جا سکتا ہے ۔ تنظیم، اتحاد اور یقین کے وہ تینوں گھڑے جو خواجہ معین الدین ٹوٹی ہوئی حالت میں چھوڑ کر گئے تھے، اب یہ نعروں میں سمٹ گئے ہیں ۔ اور اب تو ہمیں ان گھڑوں کے ٹکڑے تک نظر نہیں آتے ۔

سنا ہے کہ ٹی وی والے ہزاروں روپے خرچ کر کے خواجہ صاحب کا ڈراما "لال قلعے سے لالو کھیت" فلما چکے ہیں ۔ لیکن یہ ڈراما کئی برس گزرنے کے بعد بھی ٹیلی کاسٹ نہیں کیا گیا ۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر اس میں کیا مصلحت ہے؟ کیا یہ ڈراما اسی قابل تھا کہ اسے فلما کر کسی گھڑے میں بند کر کے رکھ دیا جاتا ۔ کیا آج ہمیں خواجہ معین الدین کے ڈراموں کی ضرورت نہیں ہے؟ حالاں کہ خواجہ معین الدین کا جذبہ، جس میں خلوص اور سچائی شامل ہے، ہر زمانے کو اس کی ضرورت رہے گی ۔ ہر زمانہ خواجہ معین الدین کا اور ان کے ڈراموں کا زمانہ ہوگا ۔

خواجہ معین الدین کے دو ڈرامے قرض ادھار کر کے چھاپے گئے لیکن ان میں سے نوے فی صد کتابیں تحفے کے طور پر ان کے دوست احباب میں تقسیم کی گئیں بمشکل دس فی صد کتابیں بکی ہیں ۔

ایم اے کے امتحان میں فارسی کے مضمون میں اوّل آنے والے طالب علم کے لیے خواجہ معین الدین گولڈ میڈل کا خواجہ صاحب کی اہلیہ نے اعلان کیا تھا ۔ یہ رقم بیگم معین نے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر دی ہوگی ۔ ہم جو خواجہ صاحب کے دوست احباب اور ان کے قدردان ہیں، انھوں نے اپنی دوستی اور قدردانی کا حق صرف تالیاں بجا کر ادا کیا ۔

چودھری خلیق الزماں

میں اپنے کالم میں جب بھی چودھری صاحب کا ذکر کرتا تو ان کے نام سے پہلے لیڈر آخرالزماں چودھری خلیق الزماں لکھتا۔ اور کہیں کہیں ہلکی پھلکی گستاخیاں اور جسارتیں بھی کر جاتا لیکن چودھری صاحب سے جب بھی ملاقات ہوتی تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ میرے کالم کے وہ جملے سناتے جو اُن کے بارے میں لکھتا تھا۔ اور اُن جملوں سے وہ خود بھی لطف اندوز ہوتے اور دوسروں کو بھی اپنے اوپر ہنسنے ہنسانے کا موقع دیتے۔

ایک مرتبہ ایسی ہی ایک مجلس میں چودھری صاحب نے مجھ سے پوچھا یہ تم مجھے "لیڈر آخرالزماں" کیوں لکھتے ہو؟ تو میں نے عرض کیا کہ جس نسل اور جس ڈھب کے لیڈروں سے آپ کا تعلق ہے آپ اس نسل کے آخری لیڈر ہیں اور آپ کے بعد اس قسم کا لیڈر پیدا نہیں ہوگا۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ جو بات میں نے مذاق میں کہی ہے وہ آگے چل کر میری پیش گوئی بن جائے گی اور چودھری صاحب کے قد کاٹھ کا اور کوئی لیڈر ان کے بعد پیدا نہیں ہوگا۔

چودھری صاحب سیاست کے کھیل میں چیمپین اور آل راؤنڈر کھلاڑی تھے۔ سیاسی لیڈروں میں ایسے بھی لیڈر ہوتے ہیں جنھیں حالات لیڈر بنا دیتے ہیں مثلاً بعض لیڈروں کو لیڈری ورثے میں ملتی ہے۔ بعض صنعت کار، تجار اور زمیندار اپنے تجارتی مفادات کی خاطر لیڈری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وکیلوں کے لیے تو خیر سیاست مشغلہ بھی ہے اور کبھی کبھی یہ پیشہ بھی بن جاتا ہے۔ گویا سیاست زیادہ تر ہمارے یہاں لیڈروں کی مجبوری رہی ہے لیکن تقسیم سے پہلے ایسے بھی لیڈر تھے جنھیں ہم پیدائشی لیڈر کہہ سکتے ہیں اور سیاست ان کی رگ رگ اور نس نس میں رچی ہوتی ہے۔ چودھری صاحب کا شمار ایسے ہی لیڈروں میں ہوتا ہے۔ یوں تو چودھری صاحب پابند صوم وصلوٰۃ تھے اور سچے اور پکے مسلمان تھے لیکن سیاست میں وہ اپنے خیالات اور اپنی پارٹی کے مفاد کی خاطر سب کچھ کر گزرتے اور اسے جائز سمجھتے۔ وہ سیاست میں اینچ پینچ کرنا اور چھوٹے چھوٹے جھانسے اور پھبتیاں دینا روا سمجھتے تھے یا نہیں یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن ان کے یہاں یہ سب کچھ تھا اور وہ یہ سارے کام وہ بڑے سلیقے اور تدبیر سے کرتے۔

انڈین نیشنل کانگریس کے باراں دیدہ، گرم و سرد چشیدہ، تیز و طرار و وقت شناس لیڈروں کے توڑ پر ہمارے یہاں کوئی تھا تو وہ ہمارے چودھری خلیق الزماں صاحب تھے۔ پنڈت نہرو اور

گاندھی جی بھی ان کی چالوں سے چوکنے اور ہوشیار رہتے لیکن ایک زمانے میں جب مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد تھا تو یہ لیڈر ہر معاملے میں چودھری صاحب سے مشورہ لیتے۔ سیاست میں ان کی قریب کی نظر بھی اچھی تھی اور دور کی بھی۔

ایک مرتبہ چودھری صاحب نے مجھے بتایا کہ ایوب خان کے زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو یہاں آئے تھے اور ایوان صدر (کراچی) میں ٹھہرے تھے۔ ایک دن بھٹو صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے آپ کو صدر صاحب نے بلایا ہے۔ میں نے کہا خیریت تو ہے۔ بھٹو صاحب نے کہا۔ پنڈت جی نے آپ کو یاد کیا ہے۔ چنانچہ میں بھٹو صاحب کے ساتھ ایوانِ صدر پہنچا۔ جب پنڈت جی نے مجھے دیکھا تو وہ کھڑے ہو گئے اور مجھ سے لپٹ گئے اور کہنے لگے "خلیق تم تو ہمیں یہاں آکر بھول ہی گئے ہو" پھر چودھری صاحب نے کہا "یہ تو تم جانتے ہو کہ جواہر سے میری بڑی گہری دوستی تھی اگرچہ سیاست میں ہم دونوں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ لیکن ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہمارے ان سے خاندانی مراسم بھی تھے۔ غرض کہ اس ملاقات میں ہم ادھر ادھر کی ذاتی نوعیت کی باتیں کرتے رہے اور پھر یکایک جواہر لعل نے مجھ سے پوچھا۔ خلیق تم آزادی کی تحریک پر کتاب لکھنا چاہتے تھے اس کا کیا ہوا ؟ تو میں نے کہا۔ اس کے لیے فرصت اور کچھ سہولتوں کی ضرورت ہے۔ انشاءاللہ وہ جب بھی میسر آئیں گی میں یہ کام شروع کر دوں گا۔ غرض کہ کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد میں چلا آیا اور پنڈت جی بھی چلے گئے۔ لیکن تیسرے دن پھر بھٹو صاحب میرے یہاں آئے اور کہا آپ کو صدر صاحب نے یاد کیا ہے اور میں ان کے ساتھ ایوانِ صدر پہنچا۔ پہلے ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں اور پھر ایوب خان نے مجھ سے کہا۔

"چودھری صاحب آپ نے پنڈت جی سے کہا تھا کہ اگر آپ کو فرصت ملی اور سہولتیں میسر آئیں تو آپ تحریک آزادی پر کتاب لکھیں گے تو یہ فرمائیے کہ اس سلسلے میں ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں ؟"

تو میں نے بات کا رُخ پھیرتے ہوئے کہا۔ آپ کوئی اپنی سیاسی پارٹی کیوں نہیں بنا لیتے۔ آخر آپ کب تک مارشل لا کو مسلط رکھیں گے، اور اس کے ذریعے ملک پر حکومت کریں گے ؟

ایوب خان نے کہا کہ کیا آپ پارٹی بنانے میں میری مدد کریں گے ؟ میں نے کہا ہاں میں آپ کی پارٹی بنوا دوں گا۔ چنانچہ میں نے کنونشن مسلم لیگ کی داغ بیل ڈال دی اور ایوب خان کو اس کا چار آنے کا ممبر بنا دیا اور پھر میں نے ملک کے تمام سیاست دانوں سے یہ کہا کہ میں نے شیر کو پنجرے میں بند کر دیا ہے۔ اب اسے سدھانا اور اس سے کام لینا تمہارا کام ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ان لوگوں نے وقت کی نزاکت کا اندازہ نہیں کیا اور اپنی پارٹیوں کی تنگنائے سے باہر نکلنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ورنہ یہ ایسا وقت تھا کہ جمہوریت آہستہ آہستہ پوری طرح بحال ہو جاتی۔"

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان بننے کے بعد قائداعظم اور چودھری صاحب کے تعلقات میں

کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ بڑی لمبی بات ہے اور یہاں اس کے لکھنے کا موقع بھی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ جب چودھری صاحب ہمیشہ کے لیے پاکستان آ گئے تو ایک دن قائدِاعظم نے چودھری صاحب کو بلا کر کہا، خلیق۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم پاکستان کے سارے صوبوں کا دورہ کر کے مجھے یہ بتاؤ کہ ہمارے مسلم لیگی لیڈر کیا کر رہے ہیں اور ان کی کارکردگی کیسی ہے؟ تو چودھری صاحب نے کہا میں کچھ دنوں کے بعد اپنے دورے سے واپس آیا اور قائدِاعظم کے یہاں پہنچا تو قائدِاعظم نے پوچھا تم نے اپنے دورے کی رپورٹ لکھ لی ہے؟ تو میں نے کہا کہ رپورٹ کی ضرورت نہیں۔ میں اس سلسلے میں صرف یہ لکھوں گا کہ آپ نے کہاں گھوڑے بیچ کر گدھے خریدے ہیں۔

چودھری صاحب نے علی گڑھ ہی میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ وہ فٹ بال اور ٹینس کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے اور یہیں علی گڑھ میں انھیں سیاست کا چسکا پڑا۔ یہیں سے وہ سید ہاشمی فرید آبادی کی نظم "چل بلقان چل" سے متاثر ہو کر ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں جو طبی مشن ترکوں کو طبی امداد پہنچانے کی غرض سے استنبول جا رہا تھا، اس میں شامل ہو گئے۔

چودھری صاحب نے کہا کہ زیارت جانے سے پہلے میں اور قائدِاعظم اور لیاقت علی خان ایک تقریب میں اس طرح چل رہے تھے کہ میں اور لیاقت علی خان قائدِاعظم کے پیچھے تھے اور وہ ہمارے آگے تھے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ قائدِاعظم کے قدم ٹھیک طرح زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں تو میں نے لیاقت علی خان سے کہا "تم دیکھ رہے ہو کہ قائد کے قدم اب لڑکھڑانے لگے ہیں۔ مجھے یہ امید نہیں کہ اب وہ زیادہ دن ہمارے ساتھ رہیں گے۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ انھیں کچھ ہو، ملک کی سربراہی کے بارے میں کچھ سوچ لو" لیاقت علی خان نے مجھ سے پوچھا۔

تمھارے خیال میں کوئی ایسا شخص ہے تو میں نے کہا کہ جس شخص نے اپنی قابلیت اور اپنی ذہانت اور اپنے خلوص اور اپنے اثرات سے ہماری جد و جہد کو آگے بڑھایا ہے وہ نواب حمیداللہ خاں ہیں۔ لیاقت علی خان نے مجھ سے اتفاق کیا اور مجھ سے پوچھا کیا نواب صاحب بھوپال چھوڑ کر یہاں آنے کے لیے تیار ہو جائیں گے؟ تو میں نے ان سے کہا کہ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ کوشش کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔

نواب بھوپال کے بارے میں مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ انھوں نے مسلم لیگ کے لیے ہندوستان کے بہت سے نوابوں سے چندہ جمع کر کے اور ایک خطیر رقم اس میں اپنے پاس سے ملا کر قائدِاعظم کو دی تھی اور جب قائدِاعظم نے نواب بھوپال سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ انھیں انگلستان میں ایک قانونی مشیر کی ضرورت ہے جو برطانوی پارلیمان اور کابینہ کے ممبروں اور ان لوگوں کو جو برطانوی حکومت میں ذی اثر عہدوں پر فائز ہیں ہمارا نقطۂ نظر سمجھا سکے اور مغربی ملکوں میں ہماری ترجمانی کر سکے تو نواب صاحب نے پوچھا کہ آپ کے خیال میں اس کام کے لیے چودھری ظفراللہ خان کیسے رہیں گے۔ وہ بڑی مدت تک وائسرائے

کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر رہے ہیں۔ برطانوی حکومت کے مزاج شناس بھی ہیں اور راز داں بھی اور بڑے اعلیٰ پائے کے قانون داں بھی ہیں۔ قائداعظم نے نواب صاحب کی رائے سے اتفاق کیا۔ چنانچہ نواب صاحب نے چودھری ظفراللہ خاں صاحب سے یہ کہا کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے استعفیٰ دے دیں۔ استعفیٰ دینے سے چودھری صاحب کا بہت بڑا مالی نقصان ہوتا۔ پھر تنخواہ کا معاملہ بھی تھا۔ اور مسلم لیگ کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا۔ چنانچہ نواب صاحب نے چودھری صاحب کو اپنا قانونی مشیر بنا کر انھیں لندن بھجوا دیا اور چند مسلمانوں ریاستوں سے چندہ اکٹھا کر کے انھیں فراہم کیا۔

یہ بات مجھے ریاست جاؤرہ کے وزیر اعظم خان بہادر بنیاد حسین اور صاحبزادہ ڈاکٹر عبدالواحد خاں نے جو کسی زمانے میں ایوان شہزادگان کے جنرل سیکریٹری رہے تھے بتائی تھی اور جس کی چودھری صاحب نے میرے ایک مضمون کا جو میں نے "حریت" میں لکھا تھا، حوالہ دے کر اپنے خط میں جو میرے نام لکھا تھا اس کی تائید کی تھی۔ چنانچہ چودھری ظفراللہ خاں نے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے استعفیٰ دے دیا اور وہ مسلم لیگ کی وکالت کرنے کی غرض سے لندن چلے گئے۔ اس کے علاوہ بھی نواب صاحب ہر طرح سے مسلم لیگ اور پاکستان کی تحریک کی حمایت کرتے رہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں ان کا نام بھی مسلم لیگ اور پاکستان کے قائدین میں آتا ہے۔

چودھری صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ نواب صاحب یہ چاہتے تھے کہ قائداعظم پاکستان بننے کے بعد ہندوستان ہی میں رہیں اور دونوں ملکوں کے مسلمانوں کی قیادت کرتے رہیں اور کسی قیمت پر پاکستان کی گورنر جنرلی کا عہدہ قبول نہ کریں۔ چودھری صاحب نے کہا کہ نواب صاحب نے اس سلسلے میں قائداعظم سے اپنی بات منوا بھی لی تھی۔ ان کے خیال میں اس طرح قائداعظم کی شخصیت اور بلند ہو جاتی۔ قائداعظم یہ چاہتے تھے کہ پاکستان کے گورنر جنرل کی شخصیت کسی طرح سے ماؤنٹ بیٹن سے جسے انڈین نیشنل کانگریس ہندوستان کا گورنر جنرل بنانا چاہتی تھی اور خود ماؤنٹ بیٹن پاکستان کا گورنر جنرل بننے کا بھی خواہش مند تھا، کم نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اور اتنی بڑی شخصیت مسلم لیگ اور پاکستان میں موجود نہیں تھی لہٰذا نواب صاحب خود پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بننے پر آمادہ ہو گئے اور قائداعظم بھی اس بات پر تیار ہو گئے تھے۔ چنانچہ نواب صاحب اپنے ذاتی طیارے میں بیٹھ کر پاکستان کے لیے روانہ ہونے لگے تو انھیں یہ خیال آیا کہ کہیں لوگ ان کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں، وہ واپس چلے آئے۔ یہ باتیں کہاں تک صحیح تھیں اور کہاں تک غلط اور اس میں کتنی حقیقت تھی اور کتنی فسانہ سازی تو اس کے ذمہ دار چودھری صاحب ہیں۔

یوں تو چودھری صاحب بچپن سے صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ لیکن آخری عمر میں ان کے مکان کے ڈرائنگ روم میں جہاں ایک چارپائی پر ان کا بستر بچھا تھا اس کے قریب ہی ایک چوکی پر جانماز بھی تھی۔ چنانچہ صبح دس گیارہ بجے تک میں جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھیں کلام پاک کی تلاوت میں

مصروف دیکھا۔

اور جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کی صورت میں ہم سے علیحدہ ہوگیا تو میں جب بھی چودھری صاحب کے یہاں گیا تو میں نے یہ دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اور وہ تلاوت میں مصروف ہیں۔ ایک دن انھوں نے اس سلسلے میں فرمایا کہ ہم نے اپنی جس حماقت سے پاکستان کے ٹکڑے کروائے ہیں نہ جانے یہ حماقت کب تک جاری رکھیں گے ہم میں تنگ نظری اس حد تک اور اس شدت سے پیدا ہو چکی ہے کہ ہم میں اجتماعی یا قومی شعور پیدا ہونا مشکل ہو گیا ہے۔ ہم ہر قومی مسئلہ پر انفرادی یا گروہی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں اور ہوش اور قومی جذبے سے کام لینے کی بجائے جوش اور انفرادی اور گروہی جذبے سے کام لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں منطق اور فلسفے کی جگہ نعرے رہ جاتے ہیں۔

چودھری صاحب کے بارے میں کسی نے یہ صحیح کہا ہے کہ وہ جتنے زمین کے اوپر تھے۔ اتنے ہی زمین کے اندر تھے۔ ان کا قد چھوٹا تھا۔ آواز گمبھیر تھی۔ داڑھی نہیں تھی لیکن مونچھیں خشخشی تھیں۔ علی گڑھ کی شیروانی، علی گڑھی پاجامہ اور بالوں والی ٹوپی پہنتے تھے۔ پاؤں میں پمپ ہوتا۔ چھڑی ہر وقت ہاتھ میں رہتی۔ وہ جس محفل میں ہوتے پوری محفل پر چھا جاتے۔ چودھری صاحب ہمیشہ متنازعہ فیہ شخصیت رہے ہیں۔ وہ سیاست کے اکھاڑے کے نامی گرامی پہلوان تھے۔ سنتے بھی تھے سناتے بھی تھے۔ وار کرتے بھی تھے وار سہتے بھی تھے۔ ان کے خلاف ان کے منہ پر جو چاہے کہہ دیجیے یا ان کے خلاف لکھ دیجیے وہ کبھی بے مزانہ ہوتے۔ وہ صرف دلیل سے قائل کرتے تھے۔ اللہ بخشے بڑے جھگڑالو آدمی تھے۔ مسلم لیگ کی سیاست میں ان کا کام حریفوں کا زور توڑنا تھا۔ اس کام میں ان کا مدِمقابل نہ انڈین نیشنل کانگریس میں کوئی تھا اور نہ مسلم لیگ میں۔ جب پاکستان بن گیا تو سیاست سے انھیں دور رکھا گیا۔ پاکستان کے بعد یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اب پاکستان کو ان کی ضرورت نہیں رہی ہے یا جس کام کے لیے قدرت نے انھیں بنایا تھا وہ کام اب پورا ہو چکا تھا۔

مولانا ظفر علی خان، چودھری صاحب کو پنڈت جواہر لال نہرو کا ہم پلہ سمجھتے تھے۔ جب مولانا نیشنلسٹ مسلمانوں میں شامل تھے تو انھوں نے چودھری صاحب کے بارے میں یہ شعر کہا۔

دو دو جوانیاں مرے حصے میں آئی ہیں
نہرو انھیں ملا تو خلیق الزماں مجھے

برِصغیر کی سیاست میں چودھری صاحب کے بعد بھی اس کینڈے اور اس ڈھب کا دوسرا سیاستدان پیدا نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح پر اپنی رحمتیں نازل کرتا رہے (آمین)

شیخ صادق حسن

شیخ صادق حسن کی جاگیریں بھی تھیں۔ دوسرے کاروبار بھی تھے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی صنعت جو انھیں ورثے میں ملی تھی، قالین بافی کا کارخانہ تھا۔ یہ بڑے وسیع و عریض رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ اور ہندوستان میں اس کے ٹکّے کے شاید ہی دو چار کارخانے ہوں گے۔ شیخ صادق حسن امرت سر کے بے تاج بادشاہ تھے۔ شاید ہی کوئی شخص یا خاندان ایسا ہو جس پر ان کے احسانات نہ ہوں۔ امرت سر کے لوگوں کے دلوں پر ان کی حکومت تھی۔ رات ہو یا دن، آندھی آئے یا طوفان اگر آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف ہے تو آپ شیخ صاحب کے یہاں پہنچ جائیے، وہ آپ کی ہر ممکن مدد کریں گے۔

شیخ صاحب انجمن اسلامیہ کے صدر رہتے۔ انجمن اسلامیہ کی نگرانی میں چار ہائی اسکول اور ایک کالج چل رہا تھا۔ ان اداروں کے لیے انجمن کو کبھی چندے کی فراہمی کی ضرورت نہیں پڑی۔ امرت سر کی کشمیری برادری کے دولت مند افراد مرنے سے پہلے اپنی جائداد کا ایک حصہ انجمن کے نام منتقل کر جاتے تھے۔ جن لوگوں نے اپنی جائیدادوں کے حصّے انجمن کو دیے ہیں ان میں سرِ فہرست خواجہ غلام صادق اور شیخ صادق حسن کے گھرانوں کے نام آتے ہیں۔ اس سستے زمانے میں سبزی منڈی کی یومیہ آمدنی ایک ہزار روپے سے کم نہ تھی۔ پھر مسجد شیخ خیر الدین مرحوم کی دکانوں کا کرایہ آتا۔ اور دوسری جاگیروں کی آمدنی الگ تھی۔ اگرچہ شیخ صاحب انجمن کے صدر اور لائف ممبر تھے لیکن وہ اسکولوں اور کالجوں کے معاملات میں کبھی دخل نہ دیتے۔ وہ ان اداروں کے سربراہوں کا احترام کرتے۔ شیخ صاحب کے ملازمین خان صاحب اور خان بہادر ہوتے رہے لیکن شیخ صاحب نے آخری وقت تک کوئی خطاب لینا پسند نہیں کیا۔ وہ ہر اس تحریک میں شامل ہوتے رہے جو فرنگی حکومت کے خلاف ہوتی اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفّظ کے لیے چلائی جاتی۔ وہ کانگریس کے رکن رکین بھی تھے۔ میں نے انھیں کھدر کا لباس پہنے اور گاندھی ٹوپی لگاتے دیکھا ہے۔ وہ تحریکِ خلافت میں بھی شامل رہے۔ احرار میں بھی شریک رہے۔ پھر مولانا ظفر علی خاں کی تحریکِ اتحادِ ملّت میں شامل ہو گئے۔ اور آخر میں

مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو مرتے دم تک مسلم لیگ ہی میں رہے۔ شیخ صاحب کے دو بھائی بھی تھے۔ منجھلے بھائی کا نام شیخ محمد صادق تھا (جو شیخ مسعود صادق کے والد تھے) اور چھوٹے کا نام شیخ احمد صادق تھا۔

شیخ صادق حسن شروع سے مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے۔ اضلاع لاہور یعنی امرتسر، لاہور اور فیروزپور کے حلقۂ انتخاب سے منتخب ہوتے رہے۔ ایک مرتبہ ان کا مقابلہ چودھری ظفر اللہ خان سے بھی ہوا۔ چودھری صاحب کا نمبر دوسرا رہا۔ شیخ محمد صادق پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے لیے اسی حلقے سے لگاتار منتخب ہوتے رہے۔ ان بھائیوں کی کامیابی کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ وہ رئیس ابن رئیس تھے، بلکہ ان کی خدمات تھیں، ان کی سادگی تھی اور ان کا لوگوں میں گھلا ملا رہنا اور ہر عوامی تحریک میں حصہ لینا تھا۔ دونوں بڑے بھائی بیرسٹر تھے۔ شیخ صادق حسن نے تو پریکٹس نہیں کی۔ اپنے کاروبار اور قومی کاموں ہی سے انھیں فرصت نہیں ملتی تھی۔ شیخ محمد صادق البتہ پریکٹس کرتے تھے۔ یہ تھوڑے سے باؤلے بھی تھے۔ انتہائی جذباتی اور غصیلے آدمی تھے۔ بات کرتے تو منہ سے تھوک اڑتا۔ چناں چہ یہ "تھک صاحب" کے نام سے مشہور تھے۔ دونوں بھائی بڑے نڈر تھے۔ شیخ صادق حسن اچھے منتظم، معاملہ فہم اور ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی تھے۔ شیخ محمد صادق کو ذرا سی بات پر غصہ آجاتا۔ شیخ محمد صادق دوہرے جسم کے آدمی تھے۔ یہ اپنے جوتوں کے تلووں میں اسپار لگواتے۔ ایک مرتبہ یہ پنجاب کے چیف جسٹس سر شادی لال کی عدالت کے سامنے سے گزر رہے تھے، جب ان کے جوتوں کی آواز گونجی تو سر شادی لال کے چپراسی نے انھیں برآمدے میں سے گزرنے سے روکا۔ بس شیخ صاحب کا ناریل چٹخ گیا۔ بڑی گرج دار آواز میں کہا۔ دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔ یہ کہہ کر کئی مرتبہ برآمدے سے گزرے اور جوتوں پر زور دے دے کر گزرے۔ سر شادی لال چیمبر سے باہر نکل آئے۔ اور جب انھوں نے دیکھا کہ شیخ صاحب ہیں تو مسکرا دیے۔ شیخ صاحب نے چپراسی کی شکایت کی اور یہ کہا کہ بھلا یہ کون سا قانون ہے کہ کوئی آپ کی عدالت کے سامنے سے گزرے تو جوتے ہاتھ میں اٹھا کر گزرے۔

۱۹۴۷ء میں جب امرتسر میں ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے تو کسی نے بم پھینکا اور شیخ محمد صادق شہید ہو گئے۔ کوئی تحریک ایسی نہیں ہے جو پنجاب میں پہنچی ہو اور شیخ صادق حسن اور ان کے بھائیوں نے اسے دل کھول کر چندہ نہ دیا ہو اور دوسروں سے بھی نہ دلوایا ہو۔ کیا کانگریس، کیا تحریک خلافت، کیا احرار اور کیا مجلس اتحاد ملت۔ روزنامہ "زمیندار" کی جب بھی ضمانت ضبط ہوتی تو ضمانت کی رقم کا نصف حصہ شیخ صاحب اپنی جیب سے ادا کرتے اور اپنے اثر و رسوخ سے دوسرے لوگوں سے بھی چندہ وصول کر کے میرے ہاتھ بھجواتے۔ اس طرح تین مرتبہ

تو مَیں نے زرِ ضمانت کی یہ رقم مولینا اختر علی خان اور مولینا ظفر علی خان کو پہنچائی ہے۔ شیخ صاحب چندہ اس طرح وصول کرتے کہ مجھ سے دفتر "زمیندار" سے چندے کی رسید بُک منگواتے پہلی رقم کراس چیک کے ذریعے خود دیتے اور پھر مجھے لے کر میر مقبول محمود کے یہاں جاتے اور اپنے چندے کی رقم انھیں دکھاتے اور پھر کہتے اب تم چندہ دو۔ اور پھر ہم خواجہ غلام صادق اور میاں حبیب اللہ صاحب اور دیگر رؤسا کے یہاں سے چندہ لاتے اور یوں زرِ ضمانت کی نصف رقم کا بند وبست شیخ صاحب کر دیتے اور باقی نصف "زمیندار" کے قارئین ہاتھوں ہاتھ پوری کر دیتے۔ غرض کہ دو دن کے اندر اندر یہ رقم بڑی آسانی سے وصول ہو جاتی۔

شیخ صاحب سیچے آدمی تھے۔ تقریر اور تحریر میں کورے تھے۔ فکر اچھی پائی تھی مشورہ اچھا دیتے لیکن طریقۂ اظہار پر قابو نہ تھا۔ کہنا کچھ چاہتے تھے اور کہہ کچھ جاتے تھے۔ لکھنا کچھ چاہتے تھے اور لکھ کچھ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ لندن سے آئے تو کہنے لگے۔ اسلامک کلچر پر کام ہونا چاہیے علامہ اقبال سے ملے۔ کچھ پٹی انھوں نے پڑھائی۔ اب اسلامی کلچر پر تقریریں ہونے لگیں۔ شیخ صاحب خود اسلامی کلچر پر بولنے کے بہت شوقین تھے۔ اسلامی کلچر پر اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے "ہر ملک کا ایک کلچر ہوا کرتا ہے۔ قومیں بغیر کلچر کے پنپ نہیں سکتیں مسلمانوں کا بھی ایک کلچر ہے اور اسے ہونا ضرور چاہیے۔ اور جب اسلامی کلچر تھا تو مسلمانوں کی ترقی کا کیا حال تھا اور اب جو نہیں ہے تو دیکھ لو کیا حال ہو رہا ہے۔ لہٰذا اپنے کلچر کو اپناؤ۔" شیخ صاحب کبھی یہ نہیں بتا سکے کہ آخر ان کا مطلب کیا ہے اور وہ کیا چاہتے ہیں۔ ایک مدت تک ان کے کلچر کا مذاق اُڑتا رہا۔

مَیں اور شیخ صاحب شام کے وقت اُن کی چھکڑا موٹر میں سیر کے لیے نکل جاتے۔ کبھی وہ کلب میں بیٹھتے اور کبھی ایک عیسائی خاندان تھا، اس میں جا بیٹھتے۔ جس طرح ان کی طبیعت سادہ تھی، اسی طرح ان کا لباس اور ان کا کھانا بے پناہ سادہ ہوا کرتا تھا، اور مجھے ان کے گھر میں ان کے ساتھ کھاتے ہوئے تکلف ہوتا تھا۔ اگر ہم بازار سے پیدل گزرتے اور راستے میں کوئی حلوے پراٹھے کی دکان آجاتی تو شیخ صاحب وہاں ضرور کھڑے ہوتے اور بھاؤ ضرور پوچھتے۔ اور پھر مَیں دیکھتا کہ ان کے منھ میں پانی بھر آتا۔ لیکن وہ بغیر خریدے آگے بڑھ جاتے اور یوں لگتا جیسے انھوں نے کھا لیا ہے۔ شہر میں جتنی شادیاں ہوتیں ان میں بیشتر شادیوں میں وہ شریک ہوتے۔ لڑکے یا لڑکی کے باپ کو سو دو سو روپے دے کر آتے اور کھانے میں شریک نہ ہوتے۔ پھر شاید کوئی ہی خاندان ایسا ہو کہ جس کے تمام افراد، کیا عورتیں کیا بچے اور کیا مرد، جن کو وہ نہ جانتے ہوں۔ اور جن کی وہ پوری پوری خبر نہ رکھتے ہوں۔ کسی کو کہیں نوکری دلواتے اور کسی کو اپنے ہی کارخانے میں نوکر رکھ لیتے۔ کسی پر مقدمہ چلتا تو مقدمہ کا خرچہ خود اُٹھاتے۔ بے شمار بیواؤں اور یتیموں کی پرورش اِس طرح کرتے

کہ کسی کو پتا نہ چلتا۔ اور ان بھائیوں میں اتنا اتفاق تھا کہ شاید ہی دنیا میں کوئی بھائی ایسے ہوں جن میں اتنا اتفاق ہو — جب یونینسٹ پارٹی بنی تو شیخ صاحب نے اس کی مخالفت کی، حالاں کہ ان کے سر سکندر کے خاندان سے گہرے مراسم تھے۔ مسلم لیگ کو پنجاب میں کامیاب بنانے میں شیخ صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور جب امرت سر میں پاکستان کے قیام کے سلسلے میں فسادات ہوئے تو شیخ صادق حسن اور ان کے بھائیوں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیا۔ امرت سر کے مسلمانوں کو دفاع کے لیے ہتھیار مہیا کیے۔ دونوں بھائی شہر میں یوں گشت کرتے کہ جیسے اس محصور فوج کے یہ کمانڈر ہیں۔ نصیرا، سعید جالی ہمُس پہلوان ان کے لیفٹیننٹ تھے۔ کچھ مسلمان عورتیں، جو سکھوں کے سندر میں تھیں، انھیں سکھوں کے محلوں سے ٹرک میں گزر کر، جب کہ سب لوگ انھیں دیکھتے رہے، جا پہنچے اور سکھ راہ نماؤں نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ اور یہ ان خواتین کو جنھیں سکھوں نے محفوظ رکھا تھا، اپنے ساتھ لے آئے۔ شیخ صاحب پر کسی سکھ نے حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اُن کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ ہندو اور سکھ بھی ان کا احترام کرتے۔ پھر جب امرت سر کے مسلمان دم توڑنے لگے تو شیخ صاحب کے قالین کے کارخانوں کے منتظمین اپنا سامان ٹرکوں پہ لادنے لگے تاکہ یہ سامان لاہور لے جائیں۔ جب شہر کے مسلمانوں نے یہ منظر دیکھا تو شیخ صاحب سے طنزاً کہا "ہمارے گھر لٹ رہے ہیں اور آپ کو اپنے کارخانے کی فکر ہے۔" شیخ صاحب نے کارخانے سے ہاتھ اٹھا لیا اور وہ مہاجرین کر مہاجروں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ پھر انھیں یہ فکر ہوئی کہ جو مسلمان عورتیں مشرقی پنجاب میں رہ گئی ہیں ان کو واپس لانا چاہیے۔ یہ منصوبہ خود شیخ صاحب نے بنایا اور حکومت سے منظوری اور تعاون حاصل کیا اور وہ بے شمار مسلمان عورتوں کو مشرقی پنجاب سے نکال کر لائے۔ اگر پنجاب کے کسی علاقے میں مسلمانوں پر زیادتی ہوتی تو وہ کسی تحریک کے محرک ضرور ہوتے لیکن خود تحریک کے پیچھے رہتے۔ تحریک کو منظم کرتے اور بے دریغ روپے پیسے خرچ کرتے۔ ہندوستان کی ہر اس تحریک میں شیخ صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا جس سے برِّصغیر کے مسلمانوں کا مفاد وابستہ ہوتا اور سچ تو یہ ہے کہ پنجاب میں ہر تحریک شیخ صاحب کی آزمودہ اور پُرخلوص محترم و مقبول شخصیت کی شرکت، ان کے ایثار اور بے دریغ مالی امداد کی وجہ سے پھلتی پھولتی۔ شیخ صاحب خاموش کارکن تھے اور انھیں شہرت سے نفرت تھی۔ جب مسلمانوں پر کہیں بھی کوئی ستم ٹوٹتا تو پنجاب سے پہلی آواز شیخ صاحب کی بلند ہوتی۔ کشمیر کی آزادی کی تمام پچھلی تحریکوں میں شیخ صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ کانگریس اور خلافت کے زمانے میں شیخ صاحب پیش پیش رہے۔ ظفر وال کی مسجد میں اذان دینے پر جب گولی چلی تو شیخ صاحب نے اعلان کیا کہ وہ خود مسجد میں اذان دیں گے اور یہ قافلہ امرت سر سے روانہ ہوا۔ جب پنجاب کی حکومت کو پتا چلا تو یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

شیخ صاحب نے میرا تعارف میری خواہش کے مطابق مولانا ظفر علی خاں سے کروایا اور میں نے شیخ صاحب سے یہ عرض کی تھی کہ مولانا کی تحریریں مجھے پسند ہیں اور میں ان سے صحافت سیکھنا چاہتا ہوں۔ شیخ صاحب نے کہا۔ کل ایک تعارفی خط لکھ کر لے آنا میں دستخط کر دوں گا۔ میں نے خط میں لکھا۔ " مطاعی۔ اُمید کہ آپ مع الخیر ہوں گے میں عزیزم نصراللہ خان کا آپ سے تعارف کروا رہا ہوں۔ اسے صحافت کا شوق ہے۔ اگر آپ تھوڑی سی توجہ دیں گے تو آپ کی توجہ اور دلچسپی اس کے مستقبل کو درخشاں کر دے گی۔ والسلام۔ آپ کا نیاز مند۔"

جب شیخ صاحب نے خط پڑھا تو کہا " یہ کیا بکواس لکھ لائے ہو۔ مطاعی کسے کہتے ہیں"؟ میں نے کہا، "اُسے جس کی اطاعت کی جائے۔" فرمایا " وہ سلسلہ میرا صرف حضور ؐ سے ہے۔ ظفر علی خان کون ہیں؛ اور یہ مستقبل کی درخشانی کیا معنی؛ کیا میں کوئی نجومی ہوں؟ اور نیاز مند کیا بکواس ہے؟ ظفر علی خان میرے دوست ہیں۔ اور خیریت کیوں دریافت کی؟ کیا ظفر علی خان کسی ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں سے خیریت آنا مشکل ہے۔ یہ خط پھاڑ دو اور میں جو لکھاؤں، وہ لکھو"! میری عمر اُس وقت چودہ برس کی تھی اور میں انٹرنس کی تیاری کر رہا تھا۔ اب شیخ صاحب کا وہ خط ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے لکھوایا۔۔۔ ° محترم ظفر علی خاں السلام علیکم۔ نصراللہ خان میرے عزیز ہیں اور جرنلزم سیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ نے بڑے بڑے جرنلسٹ بنائے ہیں، ان پر بھی توجہ کیجیے۔ آپ کا مخلص شیخ صادق حسن۔"

ایک شاعر نے شیخ صاحب کی مدح میں قصیدہ کہا۔ قصیدے کا ایک مصرع یہ تھا: "اے رئیس، ابنِ رئیس، ابنِ رئیس، ابنِ رئیس" شیخ صاحب نے اسی مصرع پر شاعر کو پکڑ لیا۔ اور کہا کہ بس قصیدہ یہیں ختم کر دو، ورنہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ اور آگے نہ سُناؤ۔ کیوں کہ یہی گالی میرے لیے کافی ہے۔" شاعر نے کہا ایسی بات میں نے اس مصرع میں کیا کہہ دی ہے؟

شیخ صاحب نے کہا "میرا باپ رئیس تھا۔ دادا رئیس تھا، اور دادا کا باپ بھی رئیس تھا لیکن اس کا باپ بہت غریب تھا۔ لہٰذا میرے دادا کو رئیس کا بیٹا بتانا بہت بڑی گالی ہے۔" شاعر نے کہا۔ "مصرع بحر سے خارج ہو جائے گا۔" شیخ صاحب نے جواب دیا۔ "میرا شجرہ چاہے بگڑ جائے لیکن تمھارا مصرع بحر سے خارج نہ ہو، یہ بات مجھے منظور نہیں"۔

پاکستان بننے کے بعد میری پہلی ملاقات شیخ صاحب سے کئی برس کے بعد صدر میں ہوئی۔ شیخ صاحب کو جیسا امرت سر میں دیکھا تھا ـــــ وہ اب بھی ویسے ہی تھے۔ حقیقت پسند۔ قوم پرست۔ محبِ وطن۔ خاموش قومی کارکن۔ شیخ صاحب نے اختر علی خان کے بارے میں یہ بتایا۔ تم نے تو دیکھا کہ میں نے زمیندار کی کتنی مدد کی تھی لیکن ایک اداریے میں اختر علی خان نے مجھ پر

تمغے کیسے ہیں میں نے شیخ صاحب سے کہا اگر آپ فرمائیں تو میں آپ پر مضمون لکھوں اور یہ بتاؤں کہ آپ نے نہ صرف زمیندار کی مدد کی بلکہ ہر قومی ادارے اور ہر قومی تحریک کی دل کھول کر خاموش طریقے سے چھپ چھپا کر مدد کی ہے۔ اس پر شیخ صاحب نے کہا "مجھے اشتہاری شہرت پسند نہیں ہے۔ جو کچھ میں نے کیا اپنا فرض سمجھ کر کیا" اور پھر دوسری ملاقات پاکستان میں شیخ صاحب سے یوں ہوئی کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے مجھ سے یہ کہا کہ میں ان کے ساتھ شیخ صاحب سے ملوں اور ان سے یہ کہوں کہ وہ اردو کالج کے لیے اپنے اثر و رسوخ سے چندہ دلوائیں جب میں مولوی صاحب کے ساتھ شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے مولوی صاحب کی خواہش ظاہر کی تو شیخ صاحب نے کہا۔ "صاحب۔ میں چندہ دوسروں سے اس طرح دلوا سکتا ہوں کہ پہلے میں خود چندہ دوں اور اتنا دوں کہ دوسروں سے اس سے کم کی توقع رکھوں۔ لیکن اب میری یہ حالت ہے کہ میں چندہ دینے کے قابل نہیں رہا" شیخ صاحب تو بڑے دل کے آدمی تھے۔ وہ تو اپنی بات کہہ گئے لیکن میری چیخ نکل گئی۔ اور میں چونکہ شیخ صاحب کی دریا دلی کے قصے مولوی صاحب کو سنا چکا تھا اس لیے مولوی صاحب کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ مولوی صاحب کو شیخ صاحب کی یہ کھری اور سچی بات بہت پسند آئی اور کئی دنوں تک ہر ملنے جلنے والے کو یہ بات سناتے رہے۔

شیخ صاحب اکہرے جسم کے آدمی تھے۔ گورا چٹا رنگ، درمیانہ قد۔ کشادہ پیشانی۔ کتری ہوئی مونچھیں۔ لمبی ناک۔ باریک بال۔ ترچھی مانگ۔ لہجہ کشمیری پنجابیوں کا سا۔ یوں امرت سر میں ایک سے ایک دولت مند پڑا تھا لیکن شیخوں کے خاندان کی قومی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

مرزا عبدالقادر بیگ

مَیں نے اجمیر سے بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد بی ٹی کالج اجمیر ہی میں داخلہ لے لیا۔ پروفیسر حبیب الرحمان خان صاحب کا شمار ہندوستان کے صفِ اوّل کے ماہرینِ تعلیم میں ہوتا تھا۔ وہ اس کالج کے پرنسپل تھے۔ بڑے کلے ٹھلے کے خوب رُو انسان تھے۔ آواز میں گھن گرج تھی۔ نفسیاتِ تعلیم کا مضمون پڑھاتے تھے۔ ان کی زبان میں جادُو تھا۔ ان کے لیکچر کے دوران جماعت کے کمرے میں سناٹا چھاجاتا تھا۔ وہ اپنے مضمون میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ انگریزی اور اُردو زبانوں پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ وہ پان کا بیڑا کلّے میں دبا کر لیکچر دیتے۔ پان میں خوشبُو ہوتی۔ ایسی خوشبُو، جو دُور دُور تک پھیل جاتی۔ صفِ اوّل میں لڑکیاں بیٹھتیں۔ اللہ بخشے، بڑے عاشق مزاج انسان تھے۔ اسی کالج کے وائس پرنسپل ڈاکٹر پی سی لال تھے جو بے شمار مضامین میں ڈاکٹریٹ کر چکے تھے۔ ٹیگور کی یُونی ورسٹی شانتی نیکیتن سے آئے تھے۔ انگریزی مسز ورگیس پڑھاتی تھیں جو بڑی خوبیوں کی مالک تھیں۔ ہم نے یہاں پڑھانے کا فن ہی نہیں سیکھا، اپنے قابل استادوں کی صحبت میں وہ کچھ سیکھا جو کتابوں میں نہیں ملتا۔ ہمارے زمانے کے استاد چلتے پھرتے کتب خانے تھے۔ اور علم کے خزانے تھے۔ میرے زمانے میں گورنمنٹ کالج اجمیر کے پرنسپل ڈاکٹر سیشادری تھے۔ ان کی شاگردی کا فخر تو حاصل نہیں ہوا۔ البتہ مَیں نے ان کے انگریزی ادب کے لیکچروں میں ضرور شرکت کی ہے۔ یوں تو سیشادری صاحب نے منفرد ڈویژن میں انگریزی میں ایم۔اے کیا تھا لیکن انگریزی ادب میں ہندوستان میں ان کے ٹکر کا کوئی دوسرا شاید ہی کہیں ہو اور برطانیہ میں بھی شیکسپیئر کے بارے میں پروفیسر سیشادری کی بات سند کے طور پر مانی جاتی تھی۔

مَیں نے کچھ دنوں معینیہ اسلامیہ اسکول میں پڑھایا بھی ہے۔ یہ اسکول پہلے درگاہ کمیٹی کا تھا۔ پھر کمیٹی نے اسے حکومت کے حوالے کر دیا۔ اگرچہ یہ گورنمنٹ اسکول تھا لیکن اس کی اپنی روایات تھیں۔ یہاں صرف مسلمان بچے تعلیم پاتے تھے۔ اس اسکول کے پہلے ہیڈ ماسٹر خان بہادر سید رضا حسین تھے جو مشہور افسانہ نگار رضیہ سجاد ظہیر کے والد تھے۔ ویسے خان بہادر صاحب کا سجاد ظہیر

سے بھی رشتہ تھا ۔ وہ لکھنؤ کے باشندے تھے ۔ خان بہادر صاحب کے زمانے میں معینیہ اسلامیہ اسکول کا ڈسپلن بہت اچھا تھا ۔ وہ اپنے اصولوں کے بڑی سختی سے پابند تھے اور وضع قطع اور طور طریقوں میں انگریز تھے ۔ خان بہادر پہلو بچا کر سیاست میں بھی حصّہ لیا کرتے تھے ۔ میں نے ان میں سب سے بڑی خصوصیت یہ دیکھی کہ وہ جوش اور جذبے کی جگہ ہوش اور سوجھ بوجھ سے کام لیتے تھے ۔ ان کی تقریر بڑی سلجھی ہوئی ہوتی ۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، آسان الفاظ اور سمجھ میں آنے والی بات کہتے ۔ چوں کہ ہم مسلمان اُس زمانے میں جوشیلی تقریریں اور لچھے دار باتیں سننے کے عادی ہو چکے تھے لہٰذا ہم پر خان بہادر صاحب کی تقریر کا اثر نہ ہوتا ۔ ویسے خان بہادر صاحب بڑے جوڑ توڑ کے آدمی تھے ۔ اوّل و آخر وہ خان بہادر تھے ۔ اپنے عہدے سے بہت اُونچا انھوں نے سرکار دربار میں مقام پایا ۔ خان بہادر صاحب سے میرے تعلقات بہت اچھے تھے ۔ اور جب وہ کراچی آئے تو ریڈیو پاکستان کراچی میں ان سے ملاقات ہوئی ۔ اور یہاں میں نے مختلف موضوعات پر ان کی بے شمار تقریریں نشر کروائیں ۔ اور اب جو رضا حسین صاحب کا ذکر آیا ہے تو مرزا عبدالقادر بیگ کے ذکر کے بغیر بات نامکمل رہ جائے گی ۔

مرزا صاحب کے بارے میں میں جب کبھی سوچتا ہوں تو بے اختیار یہ شعر زبان پر آجاتا ہے :

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اجمیر میرواڑے کے مسلمانوں کی ساری سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں کے محور مرزا عبدالقادر بیگ تھے ۔ مرزا صاحب تحریکِ خلافت میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے رفیقِ کار تھے ۔ انھوں نے جیل کاٹی اور بڑی بڑی سختیاں جھیلیں ۔ انھوں نے قید خانے میں مولانا معین الدین اجمیری سے عربی پڑھی اور علی گڑھ سے عربی زبان میں ایم اے کا امتحان پاس کیا ۔ فقہ اسلامی پر ان کی گہری نظر تھی ۔ درگاہ بل کا مسودہ مرزا صاحب کے تعاون سے تیار ہوا ۔ اور انھی کی جد و جہد اور تعاون سے سردار عبدالرّب نشتر نے اسے مرکزی اسمبلی سے پاس کروایا ۔ کراچی میں اسیرانِ تحریکِ خلافت پر جو مقدمہ چلایا گیا ، اس کی تمام کارروائی کا ترجمہ یعنی دعویٰ ، جواب دعویٰ اور فیصلے کا ترجمہ مرزا صاحب نے کیا تھا ۔ اور وہ اس دوران کراچی میں موجود تھے ۔

اجمیر میرواڑے میں مسلمانوں کی کوئی تعلیمی درسگاہ نہیں تھی ۔ اجمیر میں معینیہ اسلامیہ اسکول تھا جسے حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا ۔ مرزا صاحب نے بیاور میں محمد علی میموریل اسکول قائم کیا جس کی مجلسِ انتظامیہ کے وہ صدر تھے ۔ پھر اجمیر میں ایک اسلامیہ اسکول قائم ہوا اور نصیر آباد چھاؤنی میں مسلمانوں کا ایک مڈل اسکول مسلم مڈل اسکول کے نام سے کھولا گیا ۔ میں

اس اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا اور مرزا صاحب کے تعاون سے میں نے اسے ثانوی مدرسہ بنایا۔ سچ پوچھیے تو مرزا صاحب کی حیثیت اجمیر میرواڑے کے تعلیمی شعبے میں سرسید کی تھی۔ وہ ماہرِ تعلیم سے زیادہ تعلیمی مسائل کو سمجھتے تھے۔ تعلیم کا کوئی ایسا مضمون نہیں ہے جو مرزا صاحب کے مطالعے سے نہ گزرا ہو۔ اور جس کے بارے میں مرزا صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار نہ کیا ہو۔ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ پر اُن کی گہری نظر تھی اور ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں حالات کے مطابق اس میں انقلابی تبدیلی پیدا کریں۔ مرزا صاحب نے وار دھا اسکیم پر بڑی سختی سے عالمانہ انداز میں تبصرہ کیا تھا افسوس ہے کہ وہ اخبارات جن میں مرزا صاحب کا تبصرہ شائع ہوا تھا اب ان کی تلاش مشکل ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب جان سارجنٹ برِصغیر کی تعلیم کا نیا خاکہ تیار کر رہے تھے تو انھوں نے مشاورت کے لیے اجمیر سے مرزا صاحب کو بلوایا۔ مرزا صاحب نے سرجان سارجنٹ کو یہ لکھا تھا کہ وہ اپنے ساتھ مجھے لانا چاہتے ہیں۔ چناں چہ جب وہاں سے منظوری آگئی تو مرزا صاحب نے مجھے بھی خط لکھا کہ فوراً اجمیر چلے آؤ۔ مجھے یہ خط دوسرے دن ملا۔ اور مرزا صاحب روانہ ہو چکے تھے۔ واپسی پر مرزا صاحب نے (اپنی بدحواسی پر) مجھے ڈانٹا اور یہ بتایا کہ سرجان سارجنٹ سے انھوں نے یہ منوا لیا ہے کہ وہ نئے تعلیمی منصوبے میں مسلمانوں کی قومی روایات اور تہذیب و ثقافت کا خیال رکھا جائے گا۔ یہ بڑی لمبی بحث ہے جس کے لیے اس مضمون میں گنجائش نکالنا مشکل ہے۔

مرزا صاحب کا شمار اجمیر میرواڑے کے صفِ اول کے وکیلوں میں ہوتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے ٹکّے تنگے کا اور ان ایسی قابلیت رکھنے والا کوئی دوسرا وکیل نہ تھا۔ مرزا صاحب اپنے اور اپنے اہلِ خاندان کے کسی کام نہ آسکے۔ ان کی ساری زندگی مسلمانوں کے قومی مسائل حل کرنے میں صرف ہو گئی۔ اگر وہ چاہتے تو صرف اپنی وکالت کے ذریعے کروڑپتی بن سکتے تھے۔ ان کے پاس اتنے مقدمے آتے کہ وہ پریشان ہو جاتے۔ وہ بہت سے لوگوں کو ٹالتے لیکن ہر شخص یہ سمجھتا کہ اگر مرزا صاحب نے اُس کی وکالت کی تو اُس کی کامیابی یقینی ہے۔ لیکن مرزا صاحب کی مالی حالت اُس وکیل جیسی تھی جسے دن بھر میں ایک آدھ مقدمہ ملتا ہو۔ کیوں کہ مرزا صاحب اہلِ مقدمہ سے محنتانہ وصول کرنے میں شرماتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ سمجھتے ہوں کہ یہ ان کا فرض ہے اور جیسے مقدمہ کی پیروی کا معاوضہ لینا رشوت لینا ہے۔ اگر کوئی شخص مرزا صاحب سے مسودہ لکھواتا تو وہ لکھ دیتے۔ اور جب وہ مرزا صاحب سے پوچھتا کہ کیا پیش کروں تو فرماتے، یہ تو معمولی سا کام ہے۔ اگر آپ مقدمہ دائر کرنے سے پہلے مرزا صاحب سے فیس کے بارے میں پوچھیں گے تو فرمائیں گے۔ بھئی، جو جی میں آئے دے دینا۔ اور جب وہ مقدمہ جیت جاتا تو اُس کے جو جی میں آتا، دے جاتا تھا۔ اور مرزا صاحب پلٹ کے یہ بھی نہ کہتے کہ کیا دیا ہے۔ بہت سے لوگ تو مرزا صاحب کو صرف چائے پانی کا خرچ دے جاتے۔ مرزا

صاحب کے منشی کی حالت اُن سے کسی قدر بہتر تھی۔

میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ مرزا صاحب کس وقت سوتے ہوں گے، کیوں کہ جب بھی جس کا جی چاہتا مرزا صاحب کے مکان پر پہنچ جاتا اور انھیں گہری نیند سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتا۔ کسی کا لڑکا پولیس نے پکڑ لیا ہے تو مرزا صاحب اُس کے ساتھ ضمانت دینے یا اس کی سفارش کرنے تھانے چلے جا رہے ہیں۔ کسی بستی میں کوئی جھگڑا ہوتا تو مرزا صاحب کو بستی والے بستر سے اٹھا کر لے جاتے۔ ابھی کمشنر کے یہاں ہیں تو ابھی درگاہ کمیٹی کے اجلاس میں، صبح بیادریں تعلیمی کمیٹی میں ہیں تو شام کو اجمیر میں مسلم لیگ کے اجلاس میں۔ آج مرزا جی کے گھر میں سردار نشتر مرحوم کا قیام ہے تو کل قائدِ ملت لیاقت علی خان مرحوم نے تار سے مرزا جی کو دہلی بلوا لیا ہے۔ پاکستان کے قیام کے سلسلے میں مرزا نے اپنی زندگی قربان کر دی۔ وہ مسلم لیگ کے کاموں میں اتنے مصروف رہتے تھے کہ انھیں اپنے بہت سے مقدمات چھوڑنے پڑتے۔ ایک مرتبہ مرزا صاحب مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے دہلی گئے تھے تو اجمیر میں مسلم لیگ کے نوجوانوں نے مرزا صاحب کے نام سے، جو مسلم لیگ کے صدر تھے، ایک اشتہار شائع کروا کے شہر کی دیواروں پر لگوا دیا۔ اشتہار کے مضمون میں حکومت کے بارے میں کچھ ایسے الفاظ استعمال کیے گئے تھے جو قانون کی زد میں آتے تھے۔ چناں چہ مرزا صاحب دہلی سے آتے ہی گرفتار ہو گئے۔ اور جب انھوں نے اپنی گرفتاری کی وجہ پوچھی تو ان کی خدمت میں وہ اشتہار پیش کر دیا گیا۔ لوگوں نے مرزا صاحب سے کہا کہ جب اس اشتہار کا مضمون آپ نے نہیں لکھا ہے اور اس پر آپ کے دستخط بھی نہیں ہیں تو آپ اپنی صفائی پیش کر دیں۔ اس کا جواب مرزا صاحب نے یہ دیا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں لڑکوں کو کیسے پھنسوا دوں اور پھر اس سے مسلم لیگ کا وقار بھی مجروح ہوگا۔

انگریزوں نے مرزا صاحب کو خریدنے کی بہت کوشش کی۔ انھیں بڑے سے بڑا عہدہ دینے کا لالچ بھی دیا۔ لیکن یہ وہ لوگ تھے جو اپنی قوم کی خدمت کا بے پایاں جنون رکھتے تھے۔ وہ قلندر تھے، درویش تھے۔ رُوکھی سُوکھی کھاتے۔ موٹا جھوٹا پہنتے۔ اور قوم کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے ایثار اور جن کی قربانیوں سے یہ قوم آج بھی باقی ہے۔ اُن کے دلوں میں ایمان کی شمع فروزاں تھی۔ ان کی تقریروں اور تحریروں میں بجلی کی چمک اور بادل کی گرج تھی۔

پاکستان بننے کے بعد مرزا صاحب اجمیر سے کراچی اٹھ آئے۔ سردار عبدالرب نشتر نے لارنس روڈ پر انھیں رہنے کے لیے ایک مکان دلوا دیا۔ پھر یہ ہوا کہ ہم نے مرزا جی کو کراچی کی

سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے یہاں بھی وکالت شروع کی لیکن کامیاب وکالت کے لیے اس ملک میں جن چیزوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے، وہ مرزا صاحب کے پاس نہیں تھیں مسلم لیگ نے ان کی خبر تک نہ لی۔ حکومت نے ان کا حال احوال دریافت نہیں کیا۔ اور پھر ایک دن ایک صاحب نے ہمیں بتایا کہ ہماری قومی حکومت نے مرزا صاحب کی خدمات کا وہ صلہ دیا ہے جو ہماری قومی تاریخ میں یادگار رہے گا اور صلہ یہ ہے کہ حکومت نے انھیں اوتھ کمشنر بنا دیا ہے۔ چناں چہ ان آنکھوں نے مرزا عبدالقادر کو، تحریکِ خلافت اور مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے ایک عظیم کارکن کو —— ایک ماہرِ تعلیم اور مصلحِ تعلیم —— ایک ناقابلِ فراموش خدمات انجام دینے والے قوم کے خادم کو کچہری کے باہر فٹ پاتھ پر دو دو روپے معاوضہ لے کر قانونی دستاویزات پر مہر لگاتے اور دستخط کرتے دیکھا۔ کمال تو یہ ہے کہ ہم نے ان حالات میں بھی مرزا جی کو حالاتِ زمانہ کی شکایت کرتے اور راہ نمایانِ قوم کی سرد مہری کا گلہ کرتے نہیں سُنا۔ اگر ان حالات میں بھی کوئی پاکستان کے خلاف حرفِ شکایت زبان پر لاتا تو وہ بگڑ جاتے تھے۔

آخری عمر میں مرزا جی کے دماغ پر فالج کا اثر ہو گیا تھا (اگر نہ ہوتا تو ہمیں تعجب ہوتا) اس حالت میں جب بھی میری ان سے ملاقات ہوتی یا کہیں راستے میں مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ ایک ہی بات کہتے: "نصراللہ خان۔ تیاری کر لو۔ ان شاء اللہ ہم اجمیر ضرور جائیں گے۔ بس یہ سمجھ لو، فتح ہی فتح ہے، تھوڑے سے دن اور رہ گئے ہیں"

ہم حیران تھے کہ مرزا جی سیاست پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، تو پھر وہ ایسی جذباتی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ پھر ہم نے یہ سوچا جن حالات سے مرزا جی گزر رہے ہیں اور جن حالات سے ان حالات میں آ گئے ہیں، وہاں ایسا سوچنے سے تھوڑی سی زندگی جو رہ جاتی ہے، وہ ذرا آرام سے کٹ جاتی ہے۔ اگر مرزا جی یوں بھی نہ سوچتے تو پھر کس طرح سوچتے۔ اگر وہ ان حالات کے مطابق سوچتے جن حالات سے پاکستان گزر رہا تھا، تو شاید وہ ایک پل بھی زندہ نہ رہتے۔ یوں مرزا جی کراچی میں مرے لیکن میں سوچتا ہوں کہ وہ اجمیر میں ہی مرے اور انھوں نے اجمیر فتح کر لیا اور اب وہ وہاں ہیں جہاں فتح ہی فتح ہے۔

مرزا جی بڑے خوش رُو انسان تھے۔ لمبا قد، چہرہ منگولین جیسا، علی گڑھی شیروانی، رومی ٹوپی، علی گڑھی پاجامہ۔ پاؤں میں پمپ شو، خشخشی داڑھی، پیشانی کشادہ، چندیا بالوں سے خالی۔ ان کی تقریریں عالمانہ ہوتی تھیں۔ جوش و جذبہ بہت کم ہوتا۔ یوں لگتا کہ جیسے عدالت میں کوئی وکیل اپنے مقدمے کی پیروی کر رہا ہے۔

مرزا جی کے انتقال کی خبریں مقامی اخباروں میں کچھ اس طرح شائع ہوئیں کہ یوں لگا کہ جیسے مسلم لیگ کا کوئی والنٹیر مر گیا ہے۔

رفیق غزنوی

جس زمانے میں ہندوستان میں نشریات کا آغاز نہیں ہُوا تھا تو بھونپو کا باجا یا گراموفون جیسے بعض لوگ چوڑی یا توے کا باجا بھی کہتے تھے، گھروں کی زینت اور رونق تھا۔ اس زمانے میں سارے گویّے خاندانی ہُوا کرتے تھے۔ کیا عورتیں اور کیا مرد اور پھر گراموفون کے ریکارڈ جو "ہز ماسٹرز وائس" یا "کولمبیا" کمپنی بنایا کرتی تھی، دو گانے والوں کے ساتھ بی اے اور امیچر سنگر لکھا جاتا تھا۔ ان دونوں ناموں میں ایک نام رفیق غزنوی کا تھا اور دوسرا سجاد سرور نیازی کا۔

رفیق اور سجاد کے بعد تو اتنے شوقیہ گانے والے آئے کہ پھر امیچیور کی تخصیص باقی نہیں رہی۔ رفیق کلاسیکی موسیقی گاتا تھا جس میں بے پناہ تانیں ہوتیں۔ رفیق نے اپنی موسیقی سے اتنی شہرت حاصل نہیں کی جتنی آرکسٹرا کے نغموں سے کی۔ چناں چہ پاک و ہند کے آرکسٹرا کمپوزروں میں رفیق کا نام سرِ فہرست آتا تھا۔

لاہور کی ایک فلم کمپنی ہیر رانجھا بنا رہی تھی۔ اس میں ہیر کا رول امرتسر کی انور ادا کر رہی تھی اور رفیق اس فلم میں رانجھا تھا۔ رفیق کی عمر اس وقت یہی کوئی بیس پچیس کی ہوگی۔ انور اٹھارہ برس کی ہوگی۔ چناں چہ ہیر رانجھا کے کھیل کھیل میں یہ دونوں سچ مچ ہیر رانجھا بن گئے۔ اور دونوں نے شادی کر لی۔ جب انور کی ماں کو یہ معلوم ہُوا کہ بات بہت آگے بڑھ گئی ہے تو وہ انور کو امرت سر لے آئی اور رفیق دیوانہ ہوگیا۔ وہ امرت سر چلا آیا۔ ادھر انور رسّیاں تڑانے لگی۔ وہ کڑی نگرانی میں تھی۔ انور کی ماں نے مختلف ذرائع سے رفیق پر یہ زور ڈالا کہ وہ انور کو طلاق دے دے۔ رفیق تو خیر کیا تیار ہوتا لیکن ہو جانے انور کو کیا پٹی پڑھائی گئی کہ وہ تیار ہوگئی۔ اور جب رفیق سے پوچھا گیا کہ وہ کیا کہتا ہے تو اس نے کہا کہ اگر انور خود میرے پاس آ کر طلاق مانگے تو میں اسے طلاق دے دوں گا۔ چناں چہ انور اور اس کی ماں اور کچھ لوگ انور کو لے کر "گاماں حصار یہ" کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ اور سب لوگوں کے سامنے انور نے طلاق مانگی، تو رفیق نے طلاق دے دی۔ انور کی ماں ایک اشامپ پیپر ساتھ لائی تھی جس پر رفیق نے دستخط کر دیے۔ اور آخر میں رفیق نے یہ کہا کہ

میں انور سے علیحدگی میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اور جب یہ دونوں علیحدگی میں ملے تو مچل گئے اور دونوں کا پیار پھر زندہ ہو گیا اور دونوں نے چاہا کہ وہ کسی طریقے سے یہاں سے نکل بھاگیں چناں چہ رفیق کے ایک دوست نے انور کی ماں سے یہ کہا کہ یہ اسٹامپ پیپر اس وقت تک بے کار ہے جب تک کہ اس پر کسی بڑے آدمی کے دستخط نہیں ہوں گے۔

میونسپل کمشنر صدیق بھی یہاں موجود تھا۔ وہ گاما قصاب کا دوست تھا۔ رفیق کے دوست نے انور کی ماں سے کہا کہ تم گاما سے کہو کہ وہ صدیق سے کہے کہ وہ اس پر دستخط کر دے۔ اور رفیق کے اسی دوست نے صدیق سے کہا کہ جب گاما تم سے دستخط کرنے کو کہے تو تم صاف انکار کر دینا۔ اور گاما سے یہ کہا کہ جب صدیق دستخط کرنے سے انکار کرے تو تم غصے میں اسٹامپ پیپر پھاڑ دینا۔

چناں چہ انور کی ماں نے گاما سے کہا کہ تم صدیق سے کہہ کر اسٹامپ پیپر پر دستخط کرا دو۔ گاما نے صدیق سے کہا اور صدیق نے انکار کر دیا اور گاما نے غصے میں آکر اسٹامپ پیپر پھاڑ ڈالا۔ انور کی ماں سخت پریشان ہوئی اور رونے لگی۔ رفیق کے اسی دوست نے کہا۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ باہر تانگا کھڑا ہے۔ تم بازار جاؤ اور ایک اسٹامپ پیپر پر طلاق نامہ لکھوا لاؤ۔ میں صدیق سے دستخط کروا لوں گا۔ صدیق نے بھی ہامی بھر دی۔

انور کی ماں اپنا ایک آدمی یہاں چھوڑ گئی۔ یہ شخص نمازی تھا۔ انور کے دوست نے کہا۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ چناں چہ جو لوگ یہاں موجود تھے وہ نماز کے لیے صف بنانے لگے۔ اور جو آدمی انور کی ماں چھوڑ گئی تھی اُسے انھوں نے امام بنا لیا۔ اس عرصے میں رفیق کا ایک دوست ٹیکسی لے کر آگیا۔ پچھلی صف میں جتنے لوگ تھے انھوں نے انور اور رفیق کو لاہور کی طرف روانہ کر دیا۔ اور خود گھر آگئے۔ اور یہاں گاما قصاب رہ گیا تھا جو کھڑی کھاٹ پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ جب امام صاحب نے سلام پھیرا تو گاما نے کہا کہ تمھارے پیچھے جو لوگ تھے وہ پہلے ہی سلام پھیر گئے۔ اور یوں انور ہاتھ سے نکل گئی اور کافی عرصے رفیق کے ساتھ رہی اور پھر رفیق نے انور کو اذیتیں پہنچائیں۔ وہ اُسے خرچ کے لیے پیسے نہیں دیتا تھا اور بات بات پر ہنگامہ ہوتا۔ اس کے علاوہ رفیق دوسری عورتوں کے ساتھ رہتا تھا آخر مجبور ہو کر انور اپنی ایک لڑکی کے ساتھ اپنے گھر چلی آئی۔

رفیق کی زندگی میں عورت کی حیثیت لباس کی تھی۔ جب لباس اور عورت پرانی ہو جاتی تو وہ بدل دیتا۔ اس طرح اس کی زندگی میں کئی عورتیں آئیں اور کئی عورتیں گئیں۔ وہ کنجوس تو نہیں تھا۔ لیکن اپنی کمائی بیوی یا اولاد سے زیادہ وہ اپنے اُوپر خرچ کرتا۔ اُس نے فلموں سے کمایا۔ ریڈیو

سے کمایا۔ ریکارڈنگ کمپنی سے کمایا۔ ریس کے گھوڑوں اور اپنی ذات پر خوب اڑایا۔ وہ جتنا کماتا اتنا اُڑا دیتا۔ بیویاں ساتھ چھوڑتی گئیں اور ان کے بچے ان کے ساتھ چلے جاتے۔ اور آخری عمر میں جب رفیق ساٹھ برس کا ہو گیا تھا تو اُس نے ایک لڑکی سے شادی کر لی اور آخری عمر تک وہ اُس کے ساتھ رہی۔ اس کے بچے بھی ہوئے۔

رفیق کو شاعری سے بڑا شغف تھا۔ وہ اردو اور انگریزی بھی خوب لکھتا اور برجستہ لکھتا۔ وہ سخن فہم بھی تھا۔ ایک مرتبہ اختر شیرانی فیلمنگ روڈ پر کھڑے تھے۔ رفیق آیا اور کہنے لگا کہ اختر صاحب! ذرا میرا ایک شعر سنیے۔ اختر نے داد دی۔ شعر بہت اچھا تھا۔ اختر نے کہا کہ تم شاعری کیوں نہیں کرتے؟ تو رفیق نے کہا۔ اگر آپ اصلاح دینے کا وعدہ کریں تو میں شاعری شروع کر دوں۔ اختر نے انکسار سے کہا "بھلا میں اس قابل کہاں" تو رفیق نے سائیکل کے پیڈل پر پاؤں مارا اور کہا۔ "اچھا جب آپ اس قابل ہو جائیں تو مجھے بتا دیجیے گا" اور اختر رفیق کو دیکھتا رہ گیا۔

رفیق کے گردے خراب ہو گئے تھے۔ وہ پرہیز نہیں کرتا تھا۔ وہ بڑا خوش خوراک تھا۔ دوست احباب کی دعوتیں کرتا۔ اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتا اور خوب پکاتا۔ وہ گوشت بازار سے خود خرید کر لاتا۔ اور اُس کا قورمہ بناتا۔ ایسا قورمہ میں نے بہت کم کھایا۔ میں اور جمالی اور قاضی ابرار صدیقی اکثر اُس کی دعوتوں میں شریک ہوتے۔ باتے سے اُس کا بڑا گہرا یارانہ تھا اور میری اور رفیق کی دوستی باتے ہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ یہ دونوں بڑے حاضر جواب تھے۔ خوب ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے۔ جہاں بیٹھ جاتے رونق لگ جاتی۔

ایک مرتبہ ایک یوں ہی سا شخص ایک خوب صورت جوان لڑکی کے ساتھ، جو شاید اس کی بیوی تھی، ایک بس اسٹینڈ پر کھڑا تھا۔ جون کا مہینہ تھا۔ لڑکی کا چہرہ دھوپ اور گرمی سے سرخ ہو گیا تھا۔ رفیق نے کہا۔ "یار یہ شخص کتنا ظالم ہے۔ اس بلا کی خوب صورت لڑکی کو دھوپ میں لیے کھڑا ہے۔"

باتے نے کہا۔ "تو سمجھتا نہیں۔ وہ اسے کراری کر رہا ہے۔"

رفیق جب بمبئی کی فلم کمپنی میں میوزک ڈائرکٹر بنا تو وہ فیض صاحب کو اپنے ساتھ لے کر ہمارے دوست مجید وکیل کے یہاں آتا اور باتے مجھے اپنے ساتھ وہاں لے جاتا۔ اُستاد عاشق علی خان بھی سوٹ بوٹ اور سر پر فیلٹ ہیٹ لگا کر وہاں پہنچ جاتے اور پھر جب اُستاد کوئی چیز محفل میں پیش کر چکتے تو وہ رفیق سے کہتے اور رفیق ایک آدھ چیز سناتا۔ اور ہم سب اُسے اسٹیشن چھوڑنے جاتے۔ اُس وقت رفیق بہت دُبلا پتلا اور بہت خوب صورت تھا۔ یہ اُس کی اُٹھتی جوانی

کا زمانہ تھا۔ ایک دن میں نے رفیق سے کہا۔ "اِس تمام عیش و عشرت سے تجھے کیا ملا؟ تُو نے لگ کر کوئی کام نہیں کیا؟"

رفیق نے کہا۔ "سُن! جب تم لوگ کہ جنھوں نے دُنیا میں موج مزے نہیں لُوٹے ہیں، مرنے لگو گے تو اپنے دل میں حسرتیں لے کر جاؤ گے۔ اور جب میں مرُوں گا تو میں دُنیا سے کہوں گا۔ اے چڑیل اپنا مُنھ دوسری طرف کر لے میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ اب میرے دِل میں کوئی حسرت نہیں ہے۔"

اور جب رفیق بہت بیمار ہُوا تو میں نے کہا۔ "بھائی۔ اب تو توبہ کر لے اور اپنے لیے دُعا کر۔" تو رفیق نے قہقہہ لگایا اور کہا: "ہم اللہ میاں سے رُوٹھے ہُوئے ہیں۔ اگر وہ ہمیں نہیں مناتے تو ہم انھیں کیوں منائیں۔ خیر یہ ہمارے اللہ میاں سے معاملات ہیں جو آپ وہیں طے ہوں گے۔" اور پھر کچھ دنوں کے بعد یہ خبر آئی کہ رفیق نے دُنیا سے مُنھ پھیر لیا۔

اُستاد بندو خان

اُستاد بندو خان نے ساز کو آواز بنا دیا۔ یوں آواز کا تعلق سُننے سے ہے لیکن بندو خان نے اسے دکھا بھی دیا۔ بندو خان نے سارنگی کو سورنگی بنایا۔ بلکہ سارنگی کے ہر رنگ میں سو رنگ بھر دیے۔ اتنا بڑا کلاکار نہ پیدا ہُوا ہے اور نہ یہ اُمید ہے کہ آئندہ کبھی پیدا ہو۔ بندو خان اس جاتی دُنیا کی آخری بہار تھے۔

مَیں استاد بندو خان کو جب سے جانتا ہُوں جب وہ مہاراجہ تکوجی راؤ ملکر کے دربار کی رونق تھے۔ مشہور سارنگی نواز استاد اللہ دیے خان کے ساتھ ان سے نیاز حاصل ہوتا۔ کہتے ہیں کہ جو کام تان سین اپنی آواز سے لیتا تھا، بندو خان وہ جادو اپنی سارنگی سے جگاتے تھے۔ بندو خان کے بارے میں یہ قصّہ بہت مشہور ہے کہ ریاست اندور میں مہاراجہ کے محل کے پیچھے ایک پنڈت کی دکان تھی۔ اس دکان میں لال اور بیے اور پدیوں کے پنجرے لٹکے رہتے تھے، وہ ان پرندوں کا کاروبار کرتا تھا ایک دن بندو خاں سارنگی لیے اُدھر سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے یہ پرندے دیکھے تو انھیں رحم آیا۔ خان صاحب نے پنڈت جی سے کہا۔ ننھے مُنّے پرندوں کا کیوں عذاب سمیٹتے ہو انھیں چھوڑ دو۔ پنڈت جی نے کہا۔ پھر کھاؤں کماؤں کیا۔ بندو خان نے لالوں کا پنجرہ کھول دیا۔ سارے لال اُڑ گئے۔ پنڈت جی نے واویلا کیا تو بندو خان نے کہا "اچھا تمھاری مرضی اگر یہی ہے تو ہم انھیں بُلا دیتے ہیں"۔ یہ کہہ کر انھوں نے سارنگی سے لالوں کی آواز نکالی تو سارے لال پلٹ کر واپس پنجرے میں آ گئے۔ ایسے کئی قصّے بندو خان کے بارے میں مشہور ہیں۔ اور خیر یہ تو قصّہ نہیں ہے، واقعہ ہے کہ سردار پٹیل کا بلڈ پریشر جب بہت بڑھ جاتا تو وہ استاد بندو خان کو بُلا کر سارنگی سُنتے اور بلڈ پریشر کم ہو جاتا۔ سردار پٹیل نے بندو خان کی بہت خوشامد کی کہ وہ پاکستان نہ جائیں اور یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ ان کی سیوا کریں گے، ان کے خاندان کی حفاظت کا ذمّہ بھی لیں گے۔ لیکن بندو خان کے حالات نے انھیں دِلّی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ مَیں نے سردار پٹیل کے خطوط جو بندو خان کے نام آئے تھے، دیکھے ہیں۔

یوں بندو خان کے ہم عصر اور بھی بے شمار سارنگی نواز تھے ۔ مثلاً اللہ دیے خان اندور والے، پانی پت والے عاشق حسین خان، استاد ممو خان ۔ لیکن بندو خان نے عام روش سے ہٹ کر اپنی راہ سب سے الگ نکالی ۔

بندو خان سے پہلے سارنگی بجانے والے گلے کا پورا انگ سارنگی میں نہیں اتار سکتے تھے۔ سارنگی محض سنگت کا ایک ساز تھا ۔ بندو خان نے سارنگی کو آواز اور زبان عطا کی اور اس کو ایک انفرادی حیثیت بخشی ۔ بندو خان نے گز سے سارنگی بجانے کا پورا اسٹائل بدل ڈالا ۔ بندو خان سے پہلے گھسنے سے سارنگی بجائی جاتی تھی جس سے دماغ کو ٹھوکریں لگتی تھیں ۔ بندو خان نے اس میں پانی ایسی روانی پیدا کی ۔ بندو خان سے پہلے سارنگی میں ردوے کا تار ڈالا جاتا تھا جو سنگت کے لیے ہوتا تھا لیکن اس تار سے راگ کا ناڑ اور مختلف کیفیتیں پیدا نہیں ہوتی تھیں ۔ اس لیے بندو خان نے یہ کمی دور کرنے کے لیے اس میں لوہے کے تار ڈالے ۔ غرض کہ بندو خان نے سارنگی میں زبردست تبدیلی پیدا کی اور اب یہ نئی سارنگی بندو خان کی سوزنگی کہلانے لگی اور اسی نئی سارنگی یا سوزنگی سے انسان کے مزاج کا ہر موڈ اور کیفیت پیدا ہوتے لگی ۔

بندو خان کا سارنگی کا اپنا مکتب ہے ۔ کوئی سارنگی نواز ایسا نہیں ہے جس نے بندو خان کا انگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اپنایا نہ ہو ۔ یوں بندو خان سب سارنگی نوازوں کے استاد ٹھہرتے ہیں ۔ ویسے بندو خان کے شاگرد بھی بے شمار ہیں جن میں سے چند کے نام جو بیں نے خان صاحب سے سنے تھے اور مجھے یاد رہ گئے ہیں، یہ ہیں ۔ چھوٹے خان کلکتے والے، امام الدین خان برودے والے، صغیر خان، جعفر، نذر محمد اور خود ان کے صاحب زادے استاد امراؤ بندو خان ۔

استاد امراؤ بندو خان یہ کہتے ہیں کہ باد اپنے دو برس تک مجھے صرف سارنگی کا گز سنبھالنا سکھایا ہے اور وہ اسی کی مشق کراتے رہے ۔ وہ کہتے تھے کہ بڑے بڑے استاد اونچا نیچا گز لگاتے ہیں ۔ جب تک گز سنبھالنا نہ آئے، سارنگی بجانا اپنا مذاق اڑانا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ استاد امراؤ بندو خان نے اپنے والد کی طرح صرف سارنگی ہی پر اپنا وقت صرف کیوں نہیں کیا تو اس کا جواب استاد امراؤ بندو نے یہ دیا کہ وہ طوائفوں کے ساتھ سارنگی بجانا نہیں چاہتے تھے دوسری بات یہ ہے کہ بندو خان کا ریاض اور ذوق و شوق دیکھ کر استاد امراؤ بندو خان یہ سوچتے تھے کہ اب بندو خان تو کوئی نہیں بن سکے گا لہٰذا پیٹ پالنے اور اپنا موسیقی کا شوق پورا کرنے کے لیے موسیقی سیکھنا ان کے لیے ضروری ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ امراؤ بندو خان، سارنگی، بندو خان کی طرح تو نہیں بجاتے ۔ لیکن بندو خان کے بعد اس رنگ میں ان سے اچھی سارنگی کوئی نہیں بجاتا ۔

ایک مرتبہ میں اور استاد بندو خان اور امراؤ خان شاہد بھائی کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے ۔

امراؤ خان گا رہے تھے اور اس غضب کی تانیں اڑا رہے تھے کہ لوگ جھوم اٹھے۔ جب وہ گانا ختم کر چکے تو میں نے کہا۔ "استاد یوں لگتا ہے کہ امراؤ خان آپ کی سارنگی گھول کر پی گئے ہیں۔" استاد یہ بات سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ شاہد بھائی نے بتایا۔ یہ سارنگی پر ریاض نہیں کرتا۔ ورنہ سارنگی بھی بہت اچھی بجاتا ہے اور پھر شاہد بھائی نے بتایا کہ آل انڈیا ریڈیو کے دلی اسٹیشن سے استاد کا سارنگی کا پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ امراؤ خان قریب بیٹھے تھے۔ اتفاق سے استاد سارنگی بجاتے بجاتے بے ہوش ہو گئے۔ بندو خان نے فوراً سارنگی اٹھالی اور جہاں سے استاد نے بجانا چھوڑی تھی، وہاں سے انھی کے انگ میں بجانا شروع کر دی۔ استاد ہوش میں آچکے تھے اور وہ امراؤ بندو خان سے سارنگی سنتے رہے۔ جب اناؤنسر نے استاد سے یہ پوچھا کہ کیا میں آپ کے نام کا اعلان کر دوں؟ استاد نے کہا۔ ہاں۔ یہ امراؤ خان کے لیے ان کی زندگی میں بہت بڑا انعام تھا۔ ورنہ فن کے معاملے میں کوئی باپ اپنے بیٹے کی کمزوریوں کو اپنے ذمے نہیں لیتا۔

بندو خان کا تعلق دِلّی کے مشہور گائیکوں کے گھرانے سے تھا جس میں بڑے بڑے کلاکار گزرے ہیں۔ مثلاً استاد سنگی خان، استاد ممن خان، استاد سگھڑا خان، کلو خان، بے جان خان، چاند خان، عثمان خان اور رمضان خان (یہ استاد بندو خان کے بھائی ہیں، اور بقید حیات ہیں) استاد چاند خان نے بڑا نام پایا ہے۔ یہ بندو خان کے سالے تھے۔ ان کے بے شمار شاگرد ہیں۔ شاہد احمد دہلوی بھی انھی کے شاگرد تھے۔ استاد بندو خان نے استاد سنگی خان سے سارنگی سیکھی اور پھر ایک درویش کامل سے کہ جن کا نام میاں احمد شاہ تھا، بہت فیض پایا۔ استاد کبھی کبھی سُرساگر بھی بجا لیتے تھے۔

استاد بندو خان کو سارنگی سے عشق تھا۔ وہ اسے اپنے سامنے چارپائی پر رکھ کر سوتے۔ جب تک جاگتے رہتے، بجاتے رہتے۔ صبح اٹھتے تو سارنگی لے کر بیٹھ جاتے۔ وہ سارنگی میں غرق تھے۔ انھیں کوئی دوسرا شوق نہ تھا۔ سارنگی ان کی محبوبہ تھی۔ ان کی جنم جنم کی سنگی ساتھی۔ کلکتے میں آل انڈیا میوزک کانفرنس ہوئی تو یہ اندور سے ریل میں سارنگی بجاتے چلے۔ کلکتے اترے تانگے میں بیٹھے تو سارنگی بجاتے رہے۔ کانفرنس میں سارنگی بجائی، خوب داد پائی۔ بڑے بڑے انعامات حاصل کیے۔ گھر آئے تو سارنگی لے کر بیٹھ گئے۔ وہ داد و دہش سے بے نیاز تھے۔ کھانا بہت کم کھاتے۔ گوشت بالکل نہ کھاتے۔ سبزی ترکاری یا ہندوانہ کھانا کھاتے۔ مہاراجہ ہلکر کے محل میں ۴۴ برس رہ کر ہندوانہ کھانے کے عادی ہو گئے تھے۔ موٹا جھوٹا پہنتے۔ بات کرتے تو صرف سارنگی کی۔ بندو خان کے سینے میں اپنے پیش رو سارنگی نوازوں کا سارا علم بھرا ہوا تھا جو انھوں نے دو کتابوں میں کھول دیا ہے اور یہ کتابیں

بازار میں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام "جوہر موسیقی" ہے۔ اس میں استاد بندو خان نے سوت مینڈھ کی سرگم اور تانوں کی قسمیں بتائی ہیں۔ بندو خان کی دوسری معرکہ آرا تصنیف "آئینۂ موسیقی" ہے۔ یہ دراصل گائیکوں کا سینہ گزٹ ہے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ شرمیل کے راگ کس طرح بنائے جاتے ہیں۔ اس طرح بندو خان نے کوئی راز پردے میں نہیں رکھا۔

بخاری صاحب نے بندو خان کا ایک واقعہ اپنی کتاب سرگزشت بخاری میں لکھا ہے۔ بخاری صاحب نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ بمبئی میں ان کے مکان پر استاد بندو خان اور یاس یگانہ چنگیزی قیام فرما تھے۔ ایک دن بندو خان نے یگانہ صاحب سے پوچھا۔ آپ کے کمرے میں رات کو دیر تک بجلی جلتی رہتی ہے۔ آپ کیا کرتے رہتے ہیں؟ یگانہ صاحب نے کہا "فکرِ سخن کرتا ہوں۔"

بندو خان نے کہا۔ "دن بھر میں کتنے اشعار کہہ لیتے ہیں؟" یگانہ صاحب نے کہا۔ کبھی پوری غزل ہو جاتی ہے۔ کبھی دو چار اشعار ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شعر بھی نہیں ہوتا" استاد نے کہا۔ "ریاض کی کمی معلوم ہوتی ہے۔"

بندو خان ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ظاہر ہے کہ شروع شروع میں انھوں نے پیٹ پالنے کے لیے گائیکوں اور طوائفوں کی سنگت بھی کی ہوگی۔ لیکن جب وہ جوان ہوئے اور ان کا فن شباب پر آیا اور ہندوستان میں ان کا شہرہ ہوا تو اس زمانے میں موسیقی کے قدردان راجے مہاراجے تھے۔ اور ان کے دربار سے بڑے بڑے موسیقار منسلک تھے۔ اور وہ ان کلاکاروں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتے۔ موسیقی میں اندور کے تکوجی راؤ ہلکر کے دربار کے برابر کوئی دربار نہ تھا۔ ہر سال ہولی کے موقع پر ہندوستان کے کونے کونے سے بڑے بڑے گائیک اور نائک یہاں آتے اور اپنے فن کا مظاہرہ کرکے انعام لے جاتے کرکئی سال تک اسی پر گزر بسر کرتے۔ استاد بندو خان مرحوم مہاراجہ اندور کے دربار سے منسلک تھے۔ یہاں ان کی بہت قدر تھی۔ مہاراجہ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے۔ یہاں بندو خان نے، ہندوستان کا کوئی نامی گرامی موسیقار ایسا نہیں ہوگا جس کے ساتھ سارنگی نہ بجائی ہو۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ بندو خان کے باج پر صرف مہاراجہ ہی داد نہیں دیتے تھے، عظیم موسیقار بھی اپنا گانا ختم ہونے کے بعد استاد سے لپٹ جایا کرتے تھے۔ استاد بندو خان نے مجھے بتایا کہ ایک رات میں اور جاورے والے رجب علی خاں، شام سے جو ایک راگ پر شروع ہوئے تو صبح ہو گئی۔ مہاراجہ نے دونوں کو بہت انعام و اکرام دیا۔ اور ہم دونوں لپٹ گئے۔ شاہد بھائی نے "راگ رنگ کی رات" کے عنوان سے

اپنی کتاب "اجڑا دیار" میں استاد بندو خان کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ شاہد بھائی لکھتے ہیں:

"استاد بندو خان سارنگی نواز یکتائے روزگار تھے۔ انھوں نے بانس کی ایک سارنگی بنائی تھی۔ یہ سارنگی جتنی چھوٹی تھی اس کی آواز اتنی ہی بڑی تھی۔ دلی کی آخری محفل میں استاد تار اور ضرب میں ملا کر بولے۔ "آج میں بھی آپ کو ایک عجوبہ سناؤں گا۔" سب متوجہ ہو گئے۔ "آپ لوگوں نے دیپک راگ کا نام تو بہت سنا ہوگا۔ میں آپ کو آج دیپک راگ سناؤں گا۔"

استاد چاند خان (جو موسیقی کے عالم بھی ہیں اور استاد بندو خان کے ماموں زاد بھائی اور خلیفہ بھی ہیں) تڑپ کر بول اٹھے۔ "نہیں بھائی صاحب، دیپک نہ گائیے، کچھ اور بجائیے۔" بندو خان نے کہا "چاند خان، ڈرو مت دیپک سے آگ نہیں لگے گی۔" چاند خان نے کہا۔ "بھائی سنتے تو یہی ہیں کہ دیپک سے بجھے ہوئے چراغ جل اٹھتے ہیں اور آگ لگ جاتی ہے۔ اور آگ لگ جانا کوئی اچھی بات تھوڑی ہے۔ اسی لیے یہ راگ متروک ہو چکا ہے۔ ہم اگر دیپک کی اس روایت کو نہ بھی مانیں، تب بھی یہ تو مانتے ہیں کہ دیپک منحوس راگ ہے۔ اس کے گانے بجانے سے ضرور کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے۔" بندو خان صاحب نے کہا۔ "چاند خان تم پنڈت ہو۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر عجیب باتیں سناتے ہو۔" شاہد بھائی لکھتے ہیں۔ بندو خان نے کہا۔ "اچھا سن لو۔ آئندہ نہیں بجائیں گے۔" یہ کہہ کر انھوں نے دیپک راگ چھیڑ دیا۔

راگ میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ سیدھا سادا راگ تھا۔ خان صاحب نے خوب جی لگا کر بجایا مگر جب تک بجاتے رہے خواہ مخواہ طبیعت مکدر رہی۔ شاید وہم اپنا کام کر گیا۔ انھوں نے سارنگی رکھی تو صبح کی اذانیں ہونے لگیں۔

ستمبر کے پہلے ہفتے میں دلی میں آگ لگنی شروع ہوئی۔ قرول باغ ختم ہوا، سبزی منڈی ختم ہوئی، پہاڑ گنج ختم ہوا۔ آدھا شہر جل چکا تھا۔ شہر کے کئی مسلمان پرانے قلعے اور ہمایوں کے مقبرے میں جا پڑے۔ بندو خان صاحب بھی لاہور پہنچے اور ایک سال کے بعد کراچی آ گئے۔ انھیں رہنے کے لیے یہاں کوئی ڈھنگ کی جگہ نہیں ملی۔ ہار کر لالو کھیت کے ویرانے میں پڑے رہے۔ نہایت عسرت اور تنگ دستی میں آخری عمر بسر ہوئی۔ چاند خان صاحب دلی ہی میں رہ گئے۔ سالہا سال کے بعد اُن سے ملاقات ہوئی اور میں نے انھیں دلی کا وہ آخری جلسہ یاد دلایا۔ خان صاحب

نقیر منش اور رقیق القلب آدمی ہیں، آبدیدہ ہوگئے۔ بولے "بھائی صاحب! آپ نے دیکھ لی دیپک کی نحوست۔ دلّی جل گئی ہم دلّی میں نہیں ہیں مگر ہمارے دلوں میں فراق کی آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ آگ آنسوؤں سے بھی نہیں بجھتی۔ ایک ایک کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اور ناکام پلٹتی ہیں"

جب میری آخری ملاقات بندو خان صاحب سے ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا۔ یہ آپ بانس کی سارنگی کیوں لیے پھرتے ہیں۔ ایسا ہی اپنی وضع کی سارنگی بنانے کا شوق ہے تو پھر کوئی ڈھب کی سارنگی بنایئے۔ فرمایا "میاں یہ سارے ساز بے جان ہیں۔ راگ تو راگی کی انگلیوں سے پھوٹتا ہے۔ اور اب تو میری خواہش ہے کہ میں درختوں کے تنوں پر انگلیاں پھیروں اور اس سے راگ پھوٹیں۔" اور پھر چند دن کے بعد یہ خبر آئی کہ استاد بندو خان اپنی سارنگی اپنی بغل میں دبائے ساز و آواز کی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اِنّا للّٰہ و اِنّا الیہ راجعون۔

سارنگی نواز تو بہت سے پیدا ہوں گے، ہاں اب بندو خان پیدا نہیں ہوں گے۔ ان کے صاحب زادے استاد امراؤ بندو خان ان کے فن کو زندہ رکھنے کی اپنی سی کوشش کرتے رہے لیکن اس کو کیا کیجیے کہ کلاسیکی موسیقی کی اس ملک میں کہیں گنجائش نہیں ہے۔ اس طرف نوجوانوں کو راغب ہی نہیں کیا گیا۔ کچھ لوگ جو رہ گئے ہیں وہ فلمی گانے اور پاپ میوزک گانے پر مجبور کیے جارہے ہیں۔ کلاسیکی موسیقی کی سرپرستی کرنے والا اب نہ کوئی ادارہ ہے نہ شخصیتیں۔

یہاں ہم استاد امراؤ بندو خان کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں سے بہت کچھ لیا ہے۔ ان کا دم غنیمت تھا۔ انھوں نے موسیقی اپنے ماموں چاند خان سے سیکھی۔ چاند خان علمِ موسیقی کے مانے ہوئے استاد تھے۔ چنانچہ امراؤ خان نے یہ نظری علم بھی اپنے ماموں سے حاصل کیا۔ استاد امراؤ بندو خان کہا کرتے تھے کہ پہلے زمانے کے تمام استاد سارنگی ضرور سیکھتے تھے کیوں کہ اس سے گلے میں مقامات پیدا ہوتے ہیں اور گنجائشیں نکالی جاتی ہیں۔ چناں چہ جتنے بڑے بڑے موسیقار گزرے ہیں وہ پہلے سارنگی بجایا کرتے تھے۔ مثلاً استاد بڑے غلام علی خان، استاد عبدالوحید خان، خان صاحب عبدالکریم خاں، عبدالحق، عبدالمجید خان، استاد امیر خان وغیرہ وغیرہ۔

استاد امراؤ بندو خان یہ کہتے ہیں کہ سننے والے دھکا مار تانوں سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے استاد امراؤ خان سے پوچھا کہ ایک راگ میں زیادہ وقت صرف کرنے سے سبھی سننے والے پریشان ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ

ہے کہ بے ہنگم تانوں اور زیادہ وقت ایک ہی راگ میں کھینچ گھسیٹ کرنے سے لوگوں کو کلاسیکی موسیقی سے نفرت ہو گئی ہے ۔ استاد امراؤ خان نے کہا کہ آپ سے مجھے اتفاق ہے ۔ دیکھیے ہر راگ میں کل چار تانیں ہوتی ہیں جو راگ کا روپ دھارتی ہیں ۔ مثلاً مالکونس لیجیے ۔ کھرج کی مدھم سے ما ۔ دھا ۔ نی ۔ سا (یہ ایک تان ہوتی) اس تان میں کھرجوں کی ساری تانیں آ گئیں اور ساری تانیں اسی کے پیٹ میں ہیں ۔ (۲) سا ۔ گا ۔ ما اس کے پیٹ میں سے ساری تانیں نکالیں گے ۔ (۳) اس ٹیپ جب انے کے لیے گا ۔ ما ۔ دھا ۔ نی ۔ سا ۔ ٹیپ کی سا ۔ یہ اس کے پیٹ میں ہوں گی ۔ لیجیے آروہی کی ساری تانیں ختم ہو گئیں ۔

(۴) اب امروہی ۔ سا ۔ نی ۔ دھا ۔ ما ۔ گا ۔ سا ۔ دھا ۔ سا ۔ اور یہ چوتھی تان ہے ۔

میں نے کہا ۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ حجام پانچ منٹ میں بال تراش کر فارغ ہوا ، اب گاہک پر اپنا رعب جمانے کے لیے اِدھر اُدھر قینچی بجا رہا ہے ۔ استاد نے قہقہہ لگایا اور کہا یہی بات ہے ، بھائی سیدھی سی بات ۔ چار تانوں کو خوب صورتی سے نمایاں کرو اور چلتے بنو ۔ یا پھر کوئی نئی بات یا نئی نئی باتیں پیدا کرو ۔ دم سانس کی بات اور ہے اور حسن کاری الگ چیز ہے ۔

میں نے استاد امراؤ خان سے کہا کہ استادانِ قدیم نے کچھ ایجادیں بھی کیں یا پرانی لکیر پیٹتے ہوئے گزر گئے ۔ استاد نے کہا ۔ " ایک ایک تان بنانے میں استادوں نے اپنی ساری زندگی گزار دی ۔ یہ انھی کے نام سے مشہور ہیں ۔ مثلاً تانوں میں بلمپت کی تانیں ہیں ۔ یہ جو چار دم کا ٹھیکہ کہہ کر گاتے ہیں ۔ ان چار تانوں میں تلواڑہ ، جھومرا ، سواری ، آڑا چوتالہ ۔ پھر چوبیس آمد مہرے ہوتے ہیں ۔ چار زمانے ہیں ۔ برابر کی لے ، دوگنی لے ، ڈیوڑھی لے اور چوگنی لے جس زمانے کی لے ہو اس زمانے کا بول پکڑا جاتا ہے ۔ یہ آدھے ، پونے اور ڈیوڑھے ہوتے ہیں ۔ یہ راگ داری اکبر کے زمانے میں شروع ہوئی اور محمد شاہ رنگیلے کے زمانے تک جاری رہی ۔ استادوں میں جو جنگ ہوا کرتی تھی اس کی حقیقت استاد امراؤ خان نے یہ بتائی کہ ایک تالہ چار دم کے ٹھیکے میں گایا جاتا تھا ، ایک تالہ دُرت کی تال تھی ۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے دو پہلوان لڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے پر داؤ کس رہے ہیں ۔ کسی نے قلا جنگ مارا ، کسی نے دستی کھینچی ۔ اسے بمبئی والوں نے اپنا لیا ہے ۔

استاد بندو خان نے تانوں کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا ۔ ایک تان فتح علی خان کی ایجاد ہے کہ جسے بھنڈارے کی تان کہا جاتا ہے ۔ پھر استاد علی بخش کے نام سے ایک تان منسوب ہے جسے ہاتھی چنگھاڑ کہا جاتا ہے ۔ اسی طرح بدھو حسو خان کا گدا دھیا کا استاد حفیظ خان صاحب کا سپاٹا ، ظہور خان صاحب کی عشق پیچاں ۔ (اس میں ایک بول سیدھا آتا ہے اور ایک اُلٹا) ۔ عبدالحق ، عبدالمجید خان کی گرہ کھلتی ، استاد فیاض خان کی کمک ، رجب علی خان کا

الشائل سید عابل ۔ استاد وحید خان کا سر کی بڑھت ۔ اللہ دیے خان کولھاپور والے کا بندش کا خیال ۔ ان میں مسلمان گائیکوں کے علاوہ ہندو گائیکوں اور عظیم ہندو موسیقاروں کی ایجادات بھی شامل ہیں ۔ کچھ تانوں کے نام یہ ہیں ۔ چلتی پھرتی ۔ اچک سمیٹ ۔ غوطہ خورد ــــ قفل کنجی وغیرہ ۔ ایسی تانوں کی ۶۵ قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر تان اس کے موجد کے نام سے مشہور ہے اور اب مزید تانوں کی گنجائش نہیں ہے ۔

اُستاد کلّن خاں

نہ جانے کیا بات ہے کہ استاد کلّن خاں کو دیکھ کر مجھے وہ مکتب یاد آجاتا تھا جہاں لیلیٰ مجنوں پڑھا کرتے تھے۔ ویسے بھی اُستاد پر کبھی کبھی یہ شبہ ہوتا کہ جیسے پچھلے جنم میں یہی لیلیٰ مجنوں کو پڑھایا کرتے ہوں گے۔ یوں بھی اُستاد اٹھتے بیٹھتے لیلیٰ مجنوں کا اسی طرح ذکر کرتے جیسے اُس زمانے کے اُستاد اپنے ہونہار یا شریر شاگردوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ قصّوں میں انھیں لیلیٰ مجنوں کا قصّہ بہت پسند تھا۔ شہر میں جب کوئی نوٹنکی لیلیٰ مجنوں کا کھیل دکھاتی تو اُستاد جب تک یہ کھیل چلتا رہتا بلا ناغہ اُسے دیکھتے اور خوش ہوتے۔

جب میں نے استاد کو سب سے پہلے دیکھا تو ساٹھ پینسٹھ کے ہوں گے۔ لانبا قد۔ دُبلے پتلے۔ داڑھی مونچھوں پر پہلے خضاب اور پھر وسمہ اور مہندی لگانے لگے۔ اُستاد کا چہرہ لمبوترا تھا۔ سر پر رومی ٹوپی جسم پر شیروانی یا ڈبل بریسٹ کا کوٹ۔ کبھی بغیر کریز کی پتلون پہنتے اور کبھی پاجامہ۔ پاؤں میں پمپ۔ صورت شکل سے اکبرؔ الٰہ آبادی کے چھوٹے بھائی معلوم ہوتے تھے۔

استاد بغدادی قاعدہ پڑھاتے تھے میں نے انھیں بغدادی قاعدہ سے آگے پڑھاتے نہ سُنا اور نہ دیکھا، جیسے ان کا مبلغ علم بغدادی قاعدے تک محدود تھا۔ ان کے ایک شاگرد کا کہنا تھا کہ علم کے معاملے میں ہمارے اُستاد کی تعلیم بغدادی قاعدے تک محدود ہے۔ وہ آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں پڑھایا کرتے تھے۔ اور اس آدھے گھنٹے میں وہ اُونگھتے زیادہ تھے پڑھاتے کم تھے۔ اور پھر اُونگھنے اور پڑھانے کے لیے وہ دُوسرے گھر پہنچ جاتے۔ اور یوں آواز لگاتے:

"میاں سعید الرحمٰن خان۔ آؤ میاں آؤ۔ اُستاد آئے ہیں۔ اللہ خوش رکھے۔"

اُستاد کو ہر گھر سے دوؔ روپے ماہانہ ملتے۔ اور یوں دسؔ بیسؔ روپے ماہانہ ہو جاتے۔ سستا سماں تھا۔ اتنے پیسوں میں اچھی خاصی گزر ہو جاتی۔ پھر تیج تہوار اور عید بقر عید میں ہر گھر سے تہواری ملتی۔ اُستاد ایک رنگین کاغذ پر سنہری حروف میں اپنے شاگردوں کو عید کی مبارکباد یوں لکھ بھیجتے:

زندگی کی بہار دیکھو تم
عیش لیل و نہار دیکھو تم
شب برات عید ہو کہ ہو بقر عید
دائماً صد ہزار دیکھو تم

اور اس کے نیچے یہ لکھتے : بپاس خاطر.......
دُعاگو اُستاد مکھن خان عفی عنہٗ

اُستاد دُنیا میں اکیلے آئے تھے اور اکیلے ہی گئے۔ نہ جورو نہ جاتا۔ سیدھا اللہ میاں سے ناتا۔ نیم چوک میں ایک دوکان دو روپے ماہانہ کرائے پر لے رکھی تھی۔ تنور سے کھانا لاتے اور کھا کر سوجاتے۔ اور پھر صبح کی خبر لاتے پیشہ اُستاد کا گھر گھر جاکر بغدادی قاعدہ پڑھانا تھا۔ اور مشغلہ اُستاد کا لیلیٰ مجنوں کا قصہ سُننا سُنانا یا کھیل تماشا دیکھنا تھا۔ اگر اُستاد یہ سُن لیتے کہ پڑوس کے کسی شہر میں کوئی تھیئٹر آیا ہے اور وہاں لیلیٰ مجنوں کا کھیل دکھایا جارہا ہے تو اُستاد صبح سے سفر کی تیاریاں شروع کردیتے اور جب وہ جاتے تو اُن کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہوتی، دوُسرے میں لالٹین اور بغل میں چھتری۔ اور جب اُستاد لیلےٰ مجنوں کا کھیل دیکھ کر آتے تو ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں اور کبھی کبھی سِسکیاں بھرتے ہوئے آتے۔ اور ساری بستی کو صبح ہوتے ہوتے یہ معلوم ہو جاتا کہ اُستاد رات لیلیٰ مجنوں دیکھ کر آئے ہیں اور اگر کوئی پوچھ لیتا کہ اُستاد! لیلیٰ مجنوں کا کھیل کیا تھا؟ تو وہ شروع سے آخر تک لیلیٰ مجنوں کے پورے کھیل کی تفصیل سُناتے۔ اور پھر دو چار دن کے لیے اُستاد گم سُم رہتے۔ اور بار بار ٹھنڈی سانس بھر کر یہ کہتے :

"ہائے بچی لیلیٰ تجھ پر کیسے گزُر گئی؟" اور
"واہ میرے بچے مجنوں تو نے کیسا صبر سے کام لیا!"

اور کبھی یہ شعر پڑھ پڑھ کر روتے :

شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے منادی کر دی
کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

اور پھر فرماتے: "لیلیٰ بچاری کی کون سُنتا۔ لونڈے مجنوں کو پتھر مار مار کر لہولہان کر دیتے" اور یہ کہہ کر اُستاد پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے اور یہ کہتے "سچی محبت ایسی ہی ہوتی ہے" اور پھر یہ فرماتے "ذرا اس لونڈے مجنوں کو تو دیکھو لیلیٰ کو تنہا چھوڑ کر جنگل میں نکل گیا لیکن لیلیٰ کا کتا بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ شریر کہیں کا" اور یہ کہہ کر اُستاد ہنسنے لگے۔

اُستاد سال میں ایک مرتبہ لیلیٰ مجنوں کا عُرس بھی کروایا کرتے۔ وہ اس عُرس کا چندے

پیمانے پر اہتمام کرتے۔ پلاؤ زردہ کی دیگیں چڑھائی جاتیں۔ دو دن تک قوالی ہوتی اور آخر میں فاتحہ۔
ایک صاحب نے بتایا کہ جب نوٹنکی میں اُستاد لیلیٰ مجنوں کا کھیل دیکھتے تو اپنے تاثرات کا بھی اظہار کرتے جاتے۔ کبھی روتے، کبھی سسکیاں بھرتے۔ جب مجنوں گاتا تو اُستاد بھی اُس کی آواز میں آواز ملاتے۔ اور کبھی لیلیٰ سے یہ کہتے۔ صبر کر میری بچی صبر کر۔ اور کبھی مجنوں سے کہتے۔ برداشت سے کام لے میری جان —— اور پھر رونے لگتے۔ اور ایک مرتبہ لیلیٰ کی ماں کا کردار جو خاتون ادا کر رہی تھیں، انھوں نے اُستاد کو ڈانٹ کر کہا۔

"اُستاد صاحب خاموش رہیے۔ پہلے تو بچوں کو بگاڑا اور اب ہمدردی کرنے بیٹھ گئے" تو اس پر پبلک بگڑ گئی اور کمپنی کے مینیجر نے آکر اُستاد سے معافی مانگی۔

پھر ایک دن سردی کے موسم میں ایک صبح ریلوے روڈ پر ایک لاش پائی گئی۔ اس لاش کے ایک طرف چھتری تھی اور دوسری طرف ایک چھڑی۔ لاش کے چہرے پر کوئی کمبل ڈال گیا تھا۔ ایک راہ گیر نے لاش کے چہرے سے کمبل اٹھا کر دیکھا تو یہ اُستاد کلن خاں کی لاش تھی۔ سُنا ہے قریب کی بستی سے لیلیٰ مجنوں کا کھیل دیکھ کر آرہے تھے اور راستے میں موت کے فرشتے نے انھیں اُچک لیا۔ اور لیلیٰ مجنوں کے پاس پہنچا دیا۔ چناں چہ اُس بستی میں ہر برس مرحوم کلن خاں کے مزار پر لیلیٰ مجنوں کا عرس منایا جاتا ہے اور بہت سے لوگ مرحوم کو لیلیٰ مجنوں کا استاد سمجھ کر اُن کی قبر پر آکر فاتحہ پڑھتے ہیں۔

مولوی گزٹ

مولوی گزٹ منٹو کے تایا تھے۔ منٹو کے والد غلام حسن صاحب عدالتِ خفیفہ میں جج تھے۔ اردو فارسی جانتے تھے۔ انگریزی میں دستخط کر لیتے تھے۔ چوں کہ شہر کے شرفاء اور رئیسوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ لہٰذا برطانوی حکمران ایسے لوگوں کو آنریری مجسٹریٹ اور جج وغیرہ بنا دیا کرتے تھے۔ یہ گویا اس زمانے میں اعزاز ہوا کرتا تھا۔ تنخواہ وغیرہ نہیں دی جاتی تھی۔

مولوی گزٹ صاحب کا نام جہاں تک مجھے یاد ہے، محمد حسن تھا۔ یہ قد و قامت میں منٹو کے والد سے زیادہ تنومند تھے۔ آواز دونوں بھائیوں کی کراری تھی۔

مولوی گزٹ صاحب کی کتابوں کی دکان تھی۔ اس دکان کا عجیب نقشہ تھا۔ کتابیں ڈھیروں ادھر اُدھر پڑی رہتی تھیں۔ خریدار شاید ہی کوئی آتا ہو۔ میں نے تو کبھی آتے نہیں دیکھا۔ اکیلے بیٹھے کتابیں پڑھا کرتے تھے یا کوئی راہ گیر مل جاتا تو اسے بلا لیتے۔ دکان میں بٹھاتے۔ خاطر تواضع کرتے اور پھر اس کے خاندان کے ایک آدھ فرد کا نام دریافت کر کے اس کا پورا شجرہ اسے سنا دیتے جس کا اس کے باپ دادا کو بھی پتا نہ ہوتا۔

ایک مرتبہ جب ہم جاودے سے امرت سر آئے تو میں اپنے والد کے ساتھ مولوی صاحب کی دکان کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ مولوی صاحب نے میرے والد کو آواز دی اور اپنی دکان پہ بلوایا۔ جب ہم بیٹھ گئے تو مولوی صاحب نے والد سے کہا: "تیرا نام خواجہ محمد عمر ہے؟" والد صاحب نے کہا۔ "جی یہی میرا نام ہے۔" فرمایا۔ "تیرا باپ میاں محمد خان پشاور سے آیا تھا۔ تجارت کرتا تھا۔ اس کی شادی احمد شیخ کی بہن سے ہوئی۔ تیرا دوسرا ماموں محمد شیخ تھا جو کشمیر میں جاگیردار تھا۔ یہ سارا خاندان چوہڑ شریف کے مریدوں میں تھا۔ ان کا سلسلہ قادریہ نقش بندیہ تھا۔ تیری والدہ بائیس برس کی عمر میں انتقال کر گئی۔" اور پھر جو مولوی گزٹ نے اپنے گزٹ کے ورق الٹنے شروع کیے تو عصر کی اذان ہو گئی۔ والد نے اپنے والد اور والدہ کی قبروں کے بارے میں دریافت کیا تو مولوی صاحب نے کہا کہ اگلے جمعہ کو جمعہ کی نماز کے بعد آنا۔ میں لے چلوں گا۔ میں اکثر قبرستان جایا کرتا ہوں۔ خاکی

ابھی زندہ ہے (یہ گورکن کا نام تھا) اور پھر خاکی پہ شروع ہو گئے کہ اس کے باپ دادا کہاں سے آئے تھے اور جہاں اب قبرستان ہے اس سے پہلے یہاں کیا تھا۔ امرت سر کی کشمیری برادری میں کسی کے یہاں موت واقع ہوتی یا بچہ پیدا ہوتا تو مولوی صاحب کو ضرور خبر لگ جاتی۔ شاید ہی امرت سر میں کوئی ایسا شخص ہو جس کے بارے میں مولوی صاحب تفصیل سے یہ بتا نہ سکیں کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اس خاندان کے کون کون سے افراد تھے اور انھوں نے کس طرح زندگی گزاری۔

امرت سر میں دو چار شخصیتیں تاریخی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان میں ایک بزرگ کو تو البتہ میں نے نہیں دیکھا جن کا نام مولوی غلام رسول تھا۔ یہ مرزا غلام احمد قادیانی کے ہم عصر تھے اور دوسرے صاحب مولوی ثناءاللہ مرحوم تھے جو اہلِ حدیث کے امام تھے اور ایک ہفت روزہ اخبار "اہلِ حدیث" کے نام سے نکالا کرتے تھے۔ میں نے جب مولوی صاحب کو دیکھا تو وہ بڑے تکلف سے چلتے تھے ان کی کمر جھک گئی تھی۔ ان دونوں بزرگوں سے مرزا صاحب کے مناظرے اور مباہلے ہوا کرتے تھے۔ مولوی غلام رسول صاحب اپنے زمانے کے جیّد عالمِ دین تھے کشمیری الاصل تھے۔ ان کے خاندان سے اب تک ہمارے خاندان کے گہرے مراسم چلے آرہے ہیں۔ شروع شروع میں اہلِ حدیث تھے اور پھر صوفی ہو گئے۔

صوبہ سرحد اور کابل سے دینی علوم حاصل کرنے کے لیے بے شمار طلبہ ان کے یہاں قیام کرتے۔ ان کے بارے میں یہ بات بہت مشہور تھی کہ جنّات بھی ان سے علم حاصل کرتے ہیں اور ان کے تابع ہیں۔ ان کا گھر بہت کشادہ تھا۔ کچھ کشمیری مزدور ان کے یہاں رہا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ رات کا وقت تھا مزدور مکان کی چھت پر سو رہے تھے۔ ان میں سے ایک مزدور نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ یار وہ سامنے جو روشنی ہو رہی ہے اسے بجھا دو۔ نیند نہیں آتی۔ کسی کشمیری نے کہا۔ تیرا دماغ تو خراب نہیں ہے۔ وہ تو باباٹل پر بجلی کا قمقمہ جل رہا ہے جو یہاں سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ اس پر اس کشمیری نے کہا۔ اچھا بابا۔ اگر تم نہیں بجھا سکتے تو میں بجھا دیتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ اس نے کھڑے ہو کر پھونک جو ماری تو باباٹل کی یہ روشنی بجھ گئی۔ کشمیری مزدوروں پر ایسا خوف طاری ہوا کہ انھوں نے مکان کی چھت سے سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ دوسرے دن صبح جب اس بات کا چرچا ہوا اور رسّل بابا کو اس کی خبر ہوئی تو وہ اس وقت تو خاموش ہو گئے لیکن رات کو لوگوں نے سنا کہ ان کے کمرے کا دروازہ بند ہے اور وہ بُری طرح کسی کو مار رہے ہیں اور ڈانٹ رہے ہیں۔ ادھر وہ شخص چلّا رہا ہے اور فریاد کر رہا ہے۔ پتا چلا کہ

وہ کوئی جِن تھا جس نے یہ شرارت کی تھی۔ یہ بات مجھے رسّی بابا کی بیگم صاحبہ نے اور بہت سے اور لوگوں نے سُنائی تھی۔ رسّی بابا کے دو صاحب زادے تھے۔ ایک کا نام ہادی اور دوسرے کا زبیر تھا۔ یہ دونوں بھائی مولوی ممتاز علی مرحوم کے ادارے میں مُدتوں ملازم رہے۔

ہادی صاحب کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ البتہ ان کے بڑے بھائی زبیر صاحب جنھوں نے اپنے والد گرامی کو دیکھا تھا، بقیدِ حیات ہیں اور پی۔ ای سی۔ ایچ۔ ایس میں رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھار مجھ سے ملاقات ہو جاتی ہے۔۔۔ مولوی گزٹ صاحب کا تعلق بھی اسی زمانے سے ہے لیکن اپنے زمانے سے دو چار سو برس پہلے کے حالات بھی انھیں معلوم تھے۔ وہ امرت سر کی دائی تھے، بلکہ پنجاب کی کشمیری برادری کے ہر فرد کا نسب نامہ انھیں یاد تھا چناں چہ امرت سر میں جب کبھی کشمیریوں میں شادی بیاہ کی بات ہوتی تو لڑکے اور لڑکی والے دونوں مولوی صاحب ہی سے رجوع کرتے اور وہ دونوں خاندانوں کا کچّا چٹھا بیان کر ڈالتے اور کچھ اس طرح کہتے۔ "لڑکے کے بارے میں تم معلومات کر لو۔ باپ اس کا شریف ہے۔ ماں بھی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ البتہ پردادا نے ایک میراثن گھر میں ڈال لی تھی۔ لیکن لڑکے کا دادا اس میں سے نہیں تھا۔ اس کی ماں فلاں کی بیٹی تھی جو کلکتے میں شال کی تجارت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کلکتے سے میرے لیے سلیپر بھی لایا تھا۔ بڑا اچھا خاندان ہے۔ بس جی اللہ کا نام لو اور دو بول پڑھوا دو۔"

مولوی صاحب کا کوئی گھر بار بھی تھا یا نہیں تھا۔ مَیں نے تو انھیں ہمیشہ اسی دکان میں دیکھا اور ایک جیسے حال میں پایا۔

میاں حفیظ اللہ مرحوم آنریری مجسٹریٹ بھی تھے اور انجمنِ اسلامیہ کے سیکرٹری بھی۔ بڑے خاموش انسان تھے۔ سچ مچ میاں آدمی تھے۔ شہر میں بڑی عزّت تھی۔ منٹو کے بہنوئی تھے اور مولوی گزٹ صاحب کے بھائی کے داماد تھے۔ پھر امرت سر کی جلیبا لوالہ قیم شخصیت ڈاکٹر کچلو، منٹو کی سوتیلی بہن کے شوہر تھے۔ ان سے بھی مولوی صاحب کا رشتہ منٹو کے والد کی وجہ سے تھا۔ یوں بھی کشمیریوں میں، خواہ وہ کسی مقام کے ہوں، رشتے نکل آتے ہیں۔ اس بھرے پرے خاندان کے باوجود مولوی گزٹ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ ان کا مزاج اور ان کا ذوق و شوق سب سے الگ تھا۔ مَیں کبھی کبھار جو ادھر سے گزرتا تو مولوی صاحب کے یہاں آ بیٹھتا۔ مولوی صاحب نے مجھے بتایا کہ مولانا آزاد کا بچپن امرتسر میں گزرا ہے۔ وہ ایک مُدّت تک امرت سر میں رہے ان کی مَسیں اسی شہر میں بھیگی تھیں۔ اور اسی شہر سے ان کی صحافت کی ابتدا ہوئی۔ وہ ابھی عنفوانِ شباب میں تھے کہ امرت سر شہر کے ایک تاریخی روزنامے "وکیل" میں ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ان کے رفیقِ کار حکیم فیروز الدین طغرائی مرحوم تھے جو شاگردوں کے معاملے میں

پنجاب کے داغ دہلوی تھے۔ صوفی تبسم، حکیم عرشی مرحوم، بیضا خان مروی ایرانی اور اُن کے بھائی شجاع خان شیون، فرخ امرت سری، ڈاکٹر راز داں، نیر امرت سری اور آغا خلش کاشمیری ایسے بے شمار شعرا ان کے شاگرد تھے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ میں نے انھیں اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔

ایک قصہ میں نے امرت سر میں سُنا تھا اور یہی قصہ میں نے سری نگر میں بھی سُنا۔ قصہ یہ تھا کہ کسی زمانے میں ایک کشمیری خاتون کے کئی بیٹے کسی حادثے کا شکار ہو گئے۔ پھر یہ خاتون رات کے سناٹے میں شہر میں فصیل کا چکر لگاتی اور کشمیری زبان میں یہ آواز لگاتی:

"میان پوترد!"

(یعنی میرے بچو!)

ہر گھر میں یہ آواز سُنائی دیتی۔ بچے خوف زدہ ہو جاتے۔ اگر گھر میں عورتیں اکیلی ہوتیں تو وہ سہم جاتیں۔ یہ آواز صبح کی اذان سے پہلے برابر سارے شہر میں سُنائی دیتی۔

اس قصے کی اصل کیا ہے، یہ بات کسی کے علم میں نہیں تھی۔ ایک دن میں نے مولوی صاحب سے یہ بات پوچھی تو فرمایا۔ "بجلی گھر کے سامنے جو فصیل ہے وہاں ایک کشمیری عورت جو بیوہ ہو گئی تھی اپنے شوہر کے مکان سے نکال دی گئی تھی۔ وہ اپنے بچوں کو اس شہر پناہ کی دیوار کے نیچے لے کر بیٹھی رہتی۔ پھر جب بچوں کو بھوک لگتی تو وہ شہر سے بھیک مانگ کر لاتی۔ خود بھی کھاتی اور اپنے بال بچوں کو بھی کھلاتی۔

ایک دن جب یہ بھکارن بھیک مانگنے گئی تھی تو سخت آندھی چلی اور طوفان آیا اور شہر پناہ کی دیوار گر گئی۔ اور اس کے بچے اس دیوار کے ملبے میں دب گئے۔ جب یہ لوٹ کر آئی اور اس نے یہ دردناک منظر دیکھا تو یہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی اور یہ رات کے وقت شہر پناہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑتی پھرتی اور یہ آواز لگاتی:

"میان پوترد!" (یعنی اے میرے بچو!)

مولوی گزٹ صاحب نے بتایا کہ انھوں نے اسے دیکھا تھا۔ پھر یہ واقعہ افسانہ بن گیا۔ اور لوگوں نے یہ اڑا دیا کہ وہ چڑیل بن گئی تھی اور مدتوں اُس کی آواز اسی طرح گونجتی رہی۔

مچھو خان ٹیڑھی

میانہ قد۔ کالے بھجنگ۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ بڑی سی توند۔ سر پر رام پوری ٹوپی میلی چکٹ۔ گریبان چاک۔ پاؤں میں سیاہ پمپ۔ یہ تھے مچھو خان ٹیڑھی۔

مچھو خان ٹیڑھی شہر بھر کے خبرے تھے۔ ان کی خبروں میں اتنی خبر نہ ہوتی جتنی گپ اور افواہ ہوتی۔ یہ خبر شروع شروع میں المیہ ہوتی اور آخر میں طربیہ بن جاتی۔ یہ آنسوؤں سے شروع ہوتی اور مسکراہٹوں اور قہقہوں پر ختم ہوتی۔ وہ ہر شخص کے بارے میں یہ جانتے تھے کہ وہ کس قسم کی خبر سے متاثر ہوگا۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ سارا شہر ان کے بارے میں یہ جانتا تھا کہ ان کی خبریں اصلیت نہیں ہوتی۔ وہ گپ مارتے ہیں اور افواہ اڑاتے ہیں اور بے پر کی پر لگا کر ایسا اڑاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کے باوجود سب ہی تو ان چکمے میں آجاتے۔ اس آرٹ میں ان کا جواب نہیں تھا۔

مچھو خان کی خبریں انفرادی بھی ہوتیں اور اجتماعی بھی۔ مثلاً جب دوسری جنگ چھڑ چکی تھی تو ہندوستان کے لوگوں کی ہمدردیاں اپنے فرنگی حکمرانوں کے ساتھ اتنی نہیں تھیں جتنی جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر کے ساتھ تھیں۔ لوگ ہٹلر سے یوں خوش تھے کہ جس قوم کے ظلم وستم کا وہ نشانہ بن رہے تھے وہ ان کا پلیتھن نکال رہا تھا۔ اور جگہ جگہ اتحادی فوجیں بُری طرح پٹ رہی تھیں۔ مچھو خاں جس ریاست میں رہتے تھے، اُس کا نام ریاست جاورہ تھا۔ وہ چھوٹی سی بستی تھی اور یہاں نوابی تھی۔ دس بیس گھروں میں اخبار آتے تھے اور تقریباً اتنے ہی گھروں میں ریڈیو ہوں گے۔ یہاں کے لوگ چھپ چھپ کر نازی جرمنی کے ریڈیو کی خبریں سنتے تھے اور دن میں ایک دوسرے کو یہ خبریں سناتے۔ اور اس میں اپنی طرف سے بھی کچھ مرچ مسالہ لگا دیتے۔

ایک دن مچھو خان کو راستے میں جو کوئی ملتا اور ان سے پوچھتا۔ مچھو بھائی کوئی تازہ خبر؟ تو مچھو خان انتہائی سنجیدہ چہرہ بنا کر کہتے کہ میاں خبر تو ہے لیکن اگر آپ کے منھ سے نکل گئی تو

نواب صاحب میرا جن بچہ کو لکھوئیں پلوا دیں گے ۔جب لوگ قسمیں کھاتے اور انھیں یقین دلا دیتے کہ ان کے منھ سے بھاپ تک نہیں نکلے گی تو مچھو خان سوکھا سا منھ بنا کر کہتے کہ سیدھا محل سے چلا آرہا ہوں۔ آج رات ہٹلر صاحب اپنے طیارے سے اعلیٰ حضرت سے مشورہ کرنے آ رہے ہیں اور یہ بھی سُنا ہے کہ وہ ریاست جا دورہ میں اپنی چھاتہ بردار فوج اتاریں گے اور پھر یہاں سے ان کی فوج دلی پر حملہ کرے گی اور آخر میں ہٹلر صاحب نواب صاحب کو دلی کے تخت پر بٹھا کر اور ان کی کمان میں اپنی فوج دے کر برلن واپس چلے جائیں گے۔ لوگوں نے پوچھا کہ ہٹلر صاحب کا طیارہ کہاں اور کب اُترے گا تو مچھو خان نے کہا یہ تو میں بتا ہی نہیں سکتا۔ نا صاحب اس پہ اصرار نہ کریں۔ خدا نخواستہ اگر سرکار کو پتا چل گیا تو پھر میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ لیکن جب لوگوں نے قسمیں کھا کر انھیں یقین دلایا تو مچھو خاں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔" ہٹلر صاحب کا طیارہ پولو گراؤنڈ میں اُترے گا ۔آج شام ٹھیک ساڑھے سات بجے۔"

چناں چہ شہر میں شاید ہی کوئی بچہ، بوڑھا یا جوان اور کوئی عورت ایسی ہو جو اپنے گھر میں رہے ہوں ۔جسے دیکھو ہاتھ میں لالٹین اٹھائے پولو گراؤنڈ میں موجود۔ اور اب یہ سب آسمان پر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں کہ کب ہٹلر صاحب کا طیارہ پولو گراؤنڈ میں اترتا ہے اور وہ کب اس میں سے نکلتے ہیں ۔طیارہ تو خیر کیا آتا البتہ دو چار موٹریں پولو گراؤنڈ میں ضرور آکر کھڑی ہو گئیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک موٹر میں سے اعلیٰ حضرت نکلے اور انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ ایک شخص نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ حضور ہٹلر صاحب کی زیارت کرنے آئے تھے۔ نواب صاحب نے کہا۔ "کون ہٹلر صاحب؟" تو دوسرے نے کہا "سُنا ہے کہ جرمنی کے بادشاہ ہٹلر صاحب آپ سے ملاقات کرنے آرہے ہیں۔" اعلیٰ حضرت فوراً سمجھ گئے کہ یہ کارستانی یقیناً مچھو خان کی ہوگی ۔ اور پھر اعلیٰ حضرت نے قہقہہ لگایا۔ اور کہا۔" آخر آ گئے نا مچھو خان کی ٹیڑھ میں۔" اور سب لوگ شرماتے، جھینپتے، مسکراتے اور قہقہے لگاتے اور مچھو خان کو برا بھلا کہتے اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔

اسی جنگ کے زمانے میں مچھو خان بیچ چوراہے میں کھڑے ہو جاتے اور بڑے غور سے آسمان کی طرف دیکھتے۔ اتنے میں لوگ اُن کے آس پاس جمع ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگتے اور مچھو خان اُنگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کر کے یہ کہتے۔" وہ ہے —— وہ۔" اور خود چپکے سے بیچ میں سے نکل جاتے۔ لوگ تھوڑی دیر تک دیکھتے رہتے اور پھر ان میں سے کوئی یہ پوچھتا کہ یہ کیا دیکھ رہے ہو؟" تو کوئی اس کا جواب نہ دے پاتا، اور پھر آہستہ آہستہ یہ بھیڑ چھٹ جاتی۔

ایک مرتبہ مچھو خان بھورا خاں ماسٹر کے گھر کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ماسٹر صاحب اور اُن کے دوست احباب چبوترے پر بیٹھے گپ مار رہے تھے کہ مچھو خاں یہاں آکر رُکے۔ اور کہا "ماسٹر صاحب آپ کو زحمت تو ہوگی۔ تھوڑا سا پانی پلوا دیجیے۔" ماسٹر صاحب نے کہا میں تمھارے لیے اندر جا کر پانی لانے سے تو رہا۔ کہیں اور جا کر پی لینا۔ اس شہر میں تمھارے کئی چاہنے والے ہیں۔" مچھو خاں نے کہا "اچھا نہ پلائیے۔ لیکن ماسٹر صاحب یہ پانی آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔" ماسٹر صاحب نے اس پر انھیں بُرا بھلا کہا اور مچھو خاں نے شہر میں یہ اڑا دی کہ ماسٹر بھورا خاں کے کنویں سے تیل نکلا ہے لیکن کسی کو اس کی خبر نہیں ہونی چاہیے ماسٹر صاحب آج کل بے چارے بہت پریشان ہیں۔ چناں چہ یہ خبر نواب صاحب تک پہنچ گئی۔ مچھو خاں نے ماسٹر صاحب کے مہتر کو کچھ دے دلا کر مٹی کے تیل کا ایک کنستر اُن کے کنویں میں ڈلوا دیا تھا۔ اتنے میں نواب صاحب نے تیل کی ایک کمپنی کو اس کی اطلاع کر دی تھی۔ چناں چہ ماسٹر صاحب سے مکان خالی کروا لیا گیا اور جب اس کنویں سے پہلا ڈول نکال کر اس کا تجزیہ کیا گیا تو اس میں سے واقعی تیل نکلا۔ لہٰذا پانی نکالنے کی مشین لگائی گئی۔ اور جب بہت سا پانی اس میں سے نکال لیا گیا اور پانی کا تجزیہ کیا گیا تو اس میں تیل نہیں تھا۔ غرض کہ ماسٹر بھورا خان دس پندرہ دن کے بعد اپنے گھر میں داخل ہوئے۔ اور اب جب بھی مچھو خاں ماسٹر صاحب کے گھر کے سامنے سے گزرتے تو ماسٹر صاحب ہنس کر پوچھتے "کیوں مچھو خان تمھارے لیے پانی لاؤں؟"

ایک لالہ جی بڑی سی توند نکالے ہوئے سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ مچھو خاں کے کسی دوست نے کہا۔ "مچھو خان اگر لالہ جی کو دوڑا دو تو ہم تمھیں مٹھائی کھلائیں گے۔" لالہ جی کے پیچھے ایک کُتا آرہا تھا۔ کُتے اور لالہ جی میں خاصا فاصلہ تھا۔ مچھو خاں نے کُتے کے پیچھے کھڑے ہوکر اسے پتھر مارا اور یہ آواز لگائی۔ "لالہ بھاگ۔ باؤلا کُتا آرہا ہے۔" اور اب لالہ ہے کہ بُری طرح بھاگ رہا ہے اور ہانپ رہا ہے اور ساتھ ہی اپنی دھوتی بھی سنبھالتا جا رہا ہے اور لالہ ہی کیا، لالہ کے آگے جتنے لوگ تھے، وہ سب بھی بھاگ رہے تھے۔ اور کوئی کسی سے یہ نہیں پوچھ رہا تھا کہ کیوں بھاگ رہے ہو۔ حالاں کہ جسے باؤلا کُتا کہا گیا تھا وہ بے چارا ان سب سے آگے نکل گیا تھا۔

ایک مرتبہ مچھو خان ایک گاؤں سے شہر کی طرف پاپیادہ چلے آرہے تھے۔ چلتے چلتے راستے میں تھک کے چور ہو گئے تھے اور سوچنے لگے کہ کوئی سواری ملے اور وہ اس میں بیٹھ کر شہر پہنچیں۔ تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک جگہ ایک خیمہ لگا ہے خیمہ کے پاس کچھ گھوڑے بندھے

ہیں دو تین موٹریں بھی کھڑی ہیں۔ مچھو خان سمجھ گئے کہ اعلیٰ حضرت شکار پر نکلے ہیں اور یہاں آرام کر رہے ہیں۔ چناں چہ مچھو خان نے اپنے ہاتھ میں جوتے اٹھائے۔ اور دوڑنا شروع کر دیا۔ نواب صاحب نے دیکھا کہ کوئی شخص بھاگ رہا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک سوار سے کہا 'دیکھو کون ہے اور اسے پکڑ کر لاؤ۔ چناں چہ سوار مچھو خان کو اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھا کر لایا۔ نواب صاحب نے پوچھا۔ "مچھو! خیریت تو ہے، تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ اور بھاگ کیوں رہے ہو؟"
مچھو خان کا دم پھولا ہوا اور گھگی بندھی ہوئی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "سرکار مجھے چھوڑ دیجیے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور اکیلا کمانے والا ہوں۔ ندی کا پُل ٹوٹ گیا ہے اور پانی بڑی تیزی سے بہتا ہوا ادھر آ رہا ہے۔ یہ سن کر سب ہی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اور سب لوگ موٹروں اور گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور تھوڑی دیر میں شہر پہنچ گئے۔ نواب صاحب نے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے انجینئر کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ فوراً اپنے آدمی لے جا کر ندی کے پُل پر پُشتہ باندھے۔ چناں چہ انجینئر ریت اور بجری کی بوریاں اور مزدور لے کر وہاں پہنچا۔ اور تھوڑی دیر میں واپس آ کر اطلاع دی کہ ندی میں پانی ٹخنے ٹخنے ہے۔ نواب صاحب نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ "قصور ہمارا ہے، ہم نے مچھو کی بات پر کیوں یقین کر لیا۔"
جن علاقوں میں گھٹن ہوتی ہے اور جہاں لوگ کھُل کر بات نہیں کر سکتے اور جہاں اپنے اوپر ہنسنے اور کھُل کر ہنسنے کے مواقع مہیا نہیں ہوتے تو ایسے ماحول میں مچھو خان جیسے لوگ باعثِ رحمت ہوتے ہیں۔

مچھو خان بڑے درد مند انسان تھے یہی وجہ ہے کہ ان کا عملی مذاق جو ہلکا پھلکا ہوتا، اُس میں اذیت پسندی اور نفرت وغیرہ کا شائبہ تک نہ ہوتا۔
مچھو خان اور ان کے بھائی اچھو خان قوال تھے۔ مچھو خان کی آواز دل پر اثر کرتی۔ ایک شریف گھرانے کی پٹھان لڑکی پہ ان کا دِل بُری طرح آ گیا تھا۔ لڑکی بھی اُن پہ لٹو تھی۔ جب لڑکی کے باپ کو یہ خبر ہوئی تو وہ ایک دن ایک پستول لے کر مچھو خان کے گھر آیا اور پستول ان کی طرف بڑھا کر کہا۔ "مچھو! اللہ مجھے مار ڈال لیکن میرے خاندان کی آبرو برباد نہ کر۔"
مچھو خان نے اس بزرگ کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا کہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب میں اپنے دِل پر پتھر رکھ لوں گا۔ اور مچھو خاں اسی پتھر کے بوجھ کے نیچے زندگی بھر پڑے کراہتے رہے۔ وہ خدا کی اس بھری پُری کائنات میں تنہا رہ گئے۔ انھوں نے گانا بجانا چھوڑ دیا۔ اور ایک عدالت میں منشی ہو گئے۔ اب ان کی زندگی دوسروں کے لیے تھی۔ جب کوئی بیمار پڑتا تو مچھو خان وہاں موجود ہوتے۔ جو مفلس اور قلاش ہوتا تو وہ خود بھوکے رہتے اور اپنی ساری کمائی سے

سے اس کا گھر چلاتے۔ وہ آخری عمر تک دوسروں کے لیے زندہ رہے۔

مجھو خان ان لوگوں کو ہنساتے تھے جو ہنسی کے لیے ترستے ہوئے تھے۔ ان کی ہنسی میں مجھو خان کے دل کے داغوں کی روشنی ہوتی۔ دوسروں کو ہنسانے کے لیے ہنسانے والے کو خود رونا پڑتا ہے، یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ غرض کہ مجھو خان جب تک زندہ رہے، وہ اپنے آنسوؤں سے دوسروں کی ویران کھیتیاں شاداب کرتے رہے۔

مجھو خان بڑے انسان اور بہت بڑے آدمی تھے۔

موجِ گُل و بوئے گُل ہوتے ہیں ہوا دونوں

کیا قافلہ جاتا ہے گر تو بھی چلا چاہے

نصر اللہ خاں ہمارے بزرگ صحافی ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے سے اخبار میں کالم لکھ رہے ہیں جو عوام و خواص دونوں میں مقبول ہے۔ ایک طویل عرصے تک مسلسل لکھتے رہنا، اور وہ بھی اس طرح کہ لکھنے والے کی مقبولیت میں آئے دن اضافہ ہوتا رہے، ہماری دنیائے صحافت میں اپنی نوعیت کی منفرد مثال ہے۔ خاں صاحب کی بیشتر اخباری تحریریں مستقل اہمیت کی حامل ہوتی ہیں، اور اسی وجہ سے انھیں ادب کا حصہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ صحافت نے ہمارے ادب کو چند صفِ اوّل کے طنز و مزاح نگار دیے ہیں، خاں صاحب اُن میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک صحافی کی حیثیت سے خاں صاحب نے زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی بہت سی اہم شخصیات کو قریب سے دیکھا ہے۔ ان میں کوئی عالمِ دین ہے اور کوئی سیاستداں، کوئی ادیب ہے اور کوئی صحافی، کوئی موسیقی کا ماہر ہے اور کوئی براڈ کاسٹر۔ غرض کہ بڑی متنوع شخصیات سے خاں صاحب کو واسطہ رہا ہے۔ انھیں شخصیات کے بارے میں خاں صاحب نے اپنی یادوں کو شخصی خاکوں کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔

"کیا قافلہ جاتا ہے" اگرچہ قافلۂ رفتگاں ہے، لیکن اس قافلے میں شامل سب لوگ اس کتاب کے صفحات میں جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ خاں صاحب نے لفظوں سے مرقع کشی ہی نہیں کی، ان مرقعوں میں جان بھی ڈالی ہے۔

اس کتاب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں گزشتہ نصف صدی کی علمی، ادبی اور سیاسی تحریکوں کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں ــــ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان خاکوں کے حوالے سے خود نصر اللہ خاں کی زندگی کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔ گویا یہ کتاب جگ بیتی بھی ہے اور آپ بیتی بھی۔

یہ کتاب اُردو خاکہ نگاری میں ایک اہم اور زندہ رہنے والا اضافہ ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی